سہ ماہی

کاروان ادب اسلامی

جلد نمبر:۱۶ جولائی-دسمبر ۲۰۰۹ء شمارہ نمبر:۲-۳

مجلس مشاورت

☆ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، لکھنؤ
☆ مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، لکھنؤ
☆ مولانا محمود الحسن ندوی، دہلی
☆ مولانا حافظ فضل الرحیم
☆ ڈاکٹر محمود الحسن عارف
☆ مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مدیر مسئول

☆ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت

☆ مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ
☆ ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ
☆ ڈاکٹر شفیق احمد ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
☆ ڈاکٹر تابش مہدی، دہلی

معاون انتظامی

اقبال احمد ندوی

کمپوزنگ: محمد توفیق بہرائچی
طباعت: پاریکھ آفسیٹ پریس، لکھنؤ

-: زر تعاون :-

اس شمارہ کی قیمت: ۴۰ روپے، سالانہ برائے ہندوستان ۱۵۰ روپے
پاکستان و بنگلہ دیش: ۳۰۰ روپے یا ۱۰ امریکی ڈالر
ان کے علاوہ دیگر ممالک: ۴۰۰ روپے
چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں
RABITA-AL-ADAB-AL-ISLAMI(INDIA)

-: صدر دفتر :-

رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فہرست مضامین

☆ اداریہ

منزل بہ منزل — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — صفحہ ۲

☆ علمی مضامین

سید انور حسین الحسینی نفیس رقم کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ، — ڈاکٹر محمود الحسن عارف — ۳

☆ کتب سیرت کے موضوع پر منعقد سیمینار کے مقالات:

حضور اکرم (ﷺ) کی سیرت طیبہ اور آپ کا کلام بلاغت نظام، — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — ۱۷

غزل — نشور واحدی — ۲۲

مختلف زبانوں میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ، — مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی — ۲۳

تطور أدب السيرة النبوية باللغة العربية في الهند، — ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی — ۳۶

النبی الخاتم کا ادبی جائزہ — ڈاکٹر صدر الحسن ندوی مدنی — ۴۷

خطبات مدراس علم و ادب کا خزانہ — پروفیسر محمد حسان خان — ۵۶

علم و ادب — اظہر ندوی — ۵۹

النبی الخاتم میں مولانا گیلانی کا اسلوب نگارش — ڈاکٹر عبد الرشید ندوی مدنی — ۶۰

خطبات مدراس کا ادبی رنگ و آہنگ — جناب عارف عزیز — ۶۵

غزل — رضوان فاروقی — ۶۸

حیات رسول (ﷺ) ایک جائزہ — پروفیسر ابو سفیان اصلاحی — ۶۹

عقاد کی عبقریۃ محمد ایک ادبی جائزہ — ڈاکٹر محمد سمیع اختر — ۸۲

اردو زبان میں چند کتب سیرت کا ادبی جائزہ — مولانا محمد شعیب کوٹی قاسمی — ۹۳

پدماوت اور ذکر رسول (ﷺ) — مولانا سید ضیاء الحسن — ۱۰۱

غزل — منور رانا — ۱۰۴

سیرت نبوی اور مراٹھی ہندو مؤلفین: ایک مطالعہ — پروفیسر انیس چشتی — ۱۰۵

چند اہم کتب سیرت کا ادبی جائزہ — مولانا محمد فرمان ندوی — ۱۱۰

غزل — رضوان فاروقی — ۱۱۵

☆ ادب اسلامی کی خبریں

خطبۂ استقبالیہ سیمینار — الحاج عبد الجبار محمد غوث — ۱۱۶

حمد — نذیر فتح پوری — ۱۲۶

مختصر روداد کارگزاری عالمی رابطہ ادب اسلامی — مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی — ۱۲۳

خطبۂ صدارت — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — ۱۲۷

جمال رحمت — نذیر فتح پوری — ۱۳۱

رپورٹ سیمینار — مولانا محمد وثیق ندوی — ۱۳۲

رپورٹ ادبی نشست منعقدہ پونہ — پروفیسر انیس چشتی — ۱۳۸

☆ افسانہ

دنیا بڑی اچھی بھی ہے — اقبال انصاری — ۱۴۴

محمد رابع حسنی ندوی

منزل بہ منزل

انسان کا آپس میں ایک دوسرے سے مخاطبت کرنا اس کی سماجی زندگی کی ایک بنیادی اور کلیدی ضرورت ہے، اس کے بغیر انسانی زندگی کی نہ تو لازمی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں اور نہ مطلوبہ نتائج سامنے آپاتے ہیں، مخاطبت کا یہ کام زبان کے ذریعہ ہوتا ہے جو ایک انسان کی ضرورت اور اس کے عقلی اور فطری احساسات کو دوسرے انسان تک پہونچانے کا وسیلہ بنتی ہے، اور اس طرح ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان تعلق کا خوشگوار اور حسب طلب واسطہ قائم ہوتا ہے، اور سماجی زندگی میں ہم آہنگی اور خیالات کے تبادلہ کی صورت پیدا ہوتی ہے، یہ صورت زبان کی عام افادیت ہے، اسی کے ساتھ اس کی خصوصی افادیت اس وقت سامنے آتی ہے جب زبان کے عمل کو فنی تقاضوں کے ساتھ انجام دیا جائے، اور یہ صورت ادب کے دائرہ میں آتی ہے، اور اس کے ذریعہ انسان نے صرف کسی ایک انسان کو نہیں بلکہ انسانوں کے مجموعوں کو بہت فائدہ پہونچایا ہے، اور انسانی زندگی میں اس کی طویل تاریخ ملتی ہے۔

زبان کی یہ صورت جو ادب کے نام سے موسوم ہے بذات خود کوئی بڑی افادیت نہیں رکھتی، اس کی افادیت انسان کی کسی مناسب ضرورت کو پورا کرنے سے ہی تعلق رکھتی ہے، انسانی ذہن کو کسی مخفی حقیقت یا افادیت سے واقف کرانا یا اس کے احساسات و جذبات کے کسی صحتمندانہ تقاضے کو مدد بہم پہونچانا یا حوصلہ و ہمت کو مہمیز لگانا یا طبیعت کی گراوٹ یا احساسات کی پستی کو دور کرنے اور ان میں قوت پیدا کرنے کا عمل کرنا یا طبیعت کی افسردگی کو انشراح کی نعمت عطا کرنا ادیب کے صحیح اور مناسب کردار کی حیثیت رکھتا ہے، اور یہ سب پہلو انسان کے فطری پہلو ہیں، جو انسانوں کے مختلف طبقات و اصناف اور مختلف مکاتب خیال سے تعلق رکھتے ہیں، اسی کی بناء پر ادب کے اختیار کرنے والے انسانوں کے مختلف و متنوع مکاتب خیال ملیں گے، اور اس طرح ادب کا کردار ہم ہر طبقۂ انسانی میں دیکھ سکتے ہیں، اس میں ذاتی وانفرادی، سماجی واجتماعی دونوں میدانوں میں اچھے نمونے ملتے ہیں، مذہبی دائرہ بھی اس میں آتا ہے، اور ادب کا آغاز دراصل مذہبی دائرہ سے شروع بھی ہوا، جبکہ انسان نے اپنے خدا کے سامنے اپنے دل کے واردات عبدیت وسرافگندگی کا اظہار مؤثر ڈھنگ سے پیش کرنا شروع کیا، اور پھر بڑھتے بڑھتے زندگی کے دیگر مواقع میں ادب کے کردار کو اپنایا گیا، حتی کہ وہ وسیع اور مؤثر سطح تک پہونچا۔

ہمارے رابطہ ادب اسلامی نے ادب کے اسی آغاز کو ترقی دیکر اس کی روح پرور کیفیت کو زندگی کے دیگر متنوع پہلوؤں میں تلاش کیا اور اس کو قارئین کی افادیت اور پسند کے لحاظ سے پیش کرنے کا سلسلہ قائم کیا، اس طرح احادیث نبویہ کے اندر بھی اس کو تلاش کیا، سیرت نبوی کے روح پرور اثر کے نمونے بھی پیش کئے، اور کلام الٰہی کے تعلق سے جو پہلو سامنے آئے ان کو بھی پیش کیا۔ سیرت نبوی کے نمونوں میں ادبی پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے سلسلہ میں ہمارا ایک سیمینار اورنگ آباد میں منعقد ہوا، اس میں مختلف زبانوں میں کتب سیرت کے ادبی جائزہ کے موضوع پر مقالے پیش ہوئے، جس کے کچھ منتخب مضامین اس شمارہ میں پیش ہیں، ان ہی کے ساتھ ادب کے دیگر اصناف پر بھی متنوع مقالے شامل کئے گئے ہیں، امید ہے کہ یہ سب باصرہ نواز ثابت ہوں گے۔

سید انور حسین الحسنی والحسینی نفیس رقم کی علمی وادبی خدمات کا جائزہ

....ڈاکٹر محمود الحسن عارف

یہ مضمون ایک ایسی شخصیت کے حالات اور فنی ارتقاء پر مشتمل ہے جن کا فن اور ان کی ذات کسی تعارف یا وضاحت کی محتاج نہیں ہے، ہماری مراد ہمارے مخدوم۔ سید السادات سید انور حسین، المعروف بہ نفیس رقم، سے ہے، شاہ صاحب دراز قامت، خوب صورت، کتابی چہرے اور اپنے نام ہی کی طرح اپنی عادات واطور میں نفاست رکھنے والے بزرگ تھے۔ آپ حسن و جمال کی تمام ظاہری صفات سے بھی مزین تھے اور معنوی اوصاف سے بھی آراستہ تھے۔

قدرت کے ایسے حسین شاہکار کے متعلق کچھ عرض کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، لیکن شاہ صاحب کی ذات سے محبت عقیدت کے اظہار کے لئے چند سطور لکھی جارہی ہیں:

۱۔خاندان:

شاہ صاحب کا نسبی تعلق خاندان سادات کے اس عظیم خانوادے سے ہے، جس کے بزرگوں کو "خاتم الانبیاء" نے اپنی گود میں کھلایا، خاتون جنت حضرت فاطمہ الزہراؓ نے دودھ پلایا اور مظہر العجائب والغرائب حضرت علی کرم اللہ وجہ نے ان کی تربیت فرمائی، خاندان نبوت کے ان دونوں بزرگوں، یعنی حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ "سید" کہلاتا ہے۔

اشراف اورانجاب کے اس خاندان میں باہمی ازدواج کے سلسلے سے ایک نئی شاخ پیدا ہوئی جو "الحسنی الحسینی" کے نام سے معروف ہے، ہمارے مخدوم اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔[۱]

۲۔حضرت خواجہ گیسو درازؒ (۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء/۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء):

ہندوستان میں سادات کی اس شاخ میں شاہ سید محمد حسین گیسو درازؒ جیسے نامور چشتی بزرگ گزرے ہیں۔[۲] شاہ صاحب کا نسب کئی واسطوں سے سید محمد گیسو درازؒ تک پہنچتا ہے[۳]، سید محمد گیسو درازؒ کا نام محمد حسین لقب صدر الدین، کنیت ابوالفتح اور عرف گیسو دراز تھا۔ آپ کے والد محترم "سید یوسف راجو قتال" تھے، آبائی وطن خراسان اور مسلک حنفی اور مشرب چشتی تھی۔ سید

محمد گیسودراز کی دسویں پشت ۴ کے جد امجد ابوالحسن جندیؒ دہلی کی فتح سے قبل مجاہدین کی ایک جماعت کے ہمراہ ہرات سے دہلی آئے، یہاں آکر آپ ایک معرکے میں شہید ہوگئے۔ شاہ ابوالحسن جندی کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس زمانے میں ہندوستان میں وارد ہوئے، جب ابھی دہلی پر اسلام کا جھنڈا نہیں لہرایا تھا۔ ان کی اس عظیم شہادت سے فتح دہلی سے پہلے کی تبلیغ اسلام کی ان متفرق کوششوں کا اشارہ ملتا ہے، جن کا ذکر کسی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ ۵

آپ کے والد سید یوسف نظام الدین محبوب الٰہی کے مرید تھے، وفات ۷۳۱ھ/۱۳۳۰ء میں ہوئی۔

حضرت خواجہ محمد گیسودرازؒ کی ۱۰۵ کے قریب تصانیف ہیں، جو علوم اسلامیہ کے مختلف موضوعات پر آپ نے تصنیف فرمائیں۔ جس میں سے چند طبع ہو چکی ہیں اور بیشتر ابھی مخطوطات کی شکل میں ہیں۔ شاہ صاحب نے ان کی ایک اہم تصنیف تفسیر الملتقط دو جلدوں میں اصل مخطوطے کا عکس لے کر طبع کی ہے۔ جو نہایت اہم تصنیف ہے۔ ۶۔ ہمارے مخدوم سید نفیس شاہ صاحب کو اس نسبت کا بہت زیادہ احساس تھا اور آپ اس تعلق کا بے حد خیال رکھتے تھے۔

۳۔ ولادت اور ابتدائی تعلیم و تربیت ۷:

سید نفیس شاہ صاحب کے مورث اعلیٰ شاہ حفیظ اللہ حسینی گلبرگوی ۱۱۳۴ھ میں دکن سے نقل مکانی کر کے سیالکوٹ کے نزدیک واقع گاؤں گھوڑیالہ میں وارد ہوئے، وہ سیالکوٹ کے نواح میں واقع اسی قصبے میں مدفون ہیں ۸۔ شاہ صاحب کا جدی مکان آپ کے جد امجد سید بڈھن شاہ (م ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴ء) نے تعمیر کیا تھا۔ ۹

سیالکوٹ بڑا مردم خیز شہر ہے، اس کی خاک سے ملا عبد الحکیم (استاد اورنگ زیب عالمگیر) محدث کبیر مولانا محمد فضل سیالکوٹی (استاد شاہ ولی اللہ و مرزا مظہر جانجانان شہید العلوی) اور شاعر مشرق علامہ اقبالؔ جیسے لوگوں نے جنم لیا ۱۰۔ آپ کے والد محترم سید محمد اشرف علی بن سید بدھی شاہ بن سید محمد شاہ الحسینی السیالکوٹی نے، جو سیالکوٹ کے ممتاز اہل علم میں سے تھے، سیالکوٹ کے اسی قصبے میں ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں جنم لیا۔

وہ اپنے دور میں خط نستعلیق اور خط نسخ کے ماہر خوش نویس تھے۔ آپ کے دست مبارک سے کتابت شدہ کئی کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں، لیکن آخری عمر میں صرف قرآن کریم کی کتابت فرماتے تھے ۱۱، انہوں نے ۳۰ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ/ ۲۸ اگست ۱۹۹۵ء کو غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے انتقال فرمایا اور احاطہ سادات گیسودراز قبرستان میانی میں مدفون ہیں..... جب کہ آپ کی والدہ قدسیہ کا انتقال رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ/ ۶ مئی ۱۹۸۷ء کو ہوا ۱۲۔ شاہ صاحب نے اپنی والد کے انتقال پر پُر اثر نظم لکھی ہے ۱۳۔ انہی سید محمد اشرف کے ہاں شاہ صاحب کی ولادت ماہ ذو القعدہ ۱۳۵۱ھ/ ۱۱ مارچ ۱۹۳۳ء کو ہوئی ۱۴

خالق ازل کچھ لوگوں کی فطرت ایسی بناتا ہے کہ ''وہ تعلیم و تربیت کے لئے ''حرف و معنی'' کے پابند نہیں ہوتے یہ لدنی یا وہبی علم کالج یا مدرسے یا استاد کی نظر عنایت کا محتاج نہیں ہوتا۔ آپ بھی ایسے ہی بزرگوں میں شامل ہیں، اسی لئے اگرچہ آپ کے حصول علم کی راہ اسکول و کالج کی تھی، مگر آپ کا رخ شروع سے ہی ''سوئے حرم'' تھا۔ شاہ صاحب نے ابتدائی تعلیم و تربیت قصبہ بھوپانوالہ کے ہائی سکول سے اور اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ انہوں نے آریہ ہائی اسکول بھوپال نوالہ ضلع سیالکوٹ سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ آج کل یہ اسکول جناح اسلامیہ ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہے۔

شاہ صاحب کے ایک ماموں سید محمد اسلم فیصل آباد میں

رہائش پذیر تھے۔ وہ بڑے ذی علم شخص تھے اور سید انور شاہ کشمیری کے شاگرد تھے چنانچہ آپ ۱۹۴۷ء میں ان کے پاس چلے گئے اور آپ نے ۱۹۴۸ء میں سٹی مسلم اسکول فیصل آباد سے درجہ اول میں دسویں کا امتحان پاس کیا.....اور فن خطاطی کا آغاز بھی کیا۔

آپ نے ۱۹۴۹ء میں ''گورنمنٹ کالج'' فیصل آباد میں سال اول میں داخلہ لیا [۱۵]، ۱۹۴۸ء میں آپ کے والدین بھی فیصل آباد میں منتقل ہو گئے اور ۱۹۶۸ء تک فیصل آباد ہی میں مقیم رہے۔ یہاں آپ کا قیام محلّہ گجراں میں رہا، جو ایک قدیم بستی ہے، گورنمنٹ کالج سے آپ نے ایف. اے امتیازی نمبروں میں پاس کیا۔

۴ بطور کاتب خدمات:

اس دوران میں آپ نے اپنے والد سے خوش نویسی کی مشق جاری رکھی۔ بعد ازاں آپ لاہور منتقل ہو گئے (۲۰ ذوالحجہ ۱۳۷۰ھ/۲۳ ستمبر ۱۹۵۱ء)۔ یہاں شاہ صاحب کو ان کے والد کے دوست منشی تاج الدین زریں رقم مرحوم (م ۱۹۵۵ء) کی سرپرستی حاصل رہی اور انہی کی سفارش پر پہلے روزنامہ احسان میں اور پھر روزنامہ نوائے وقت میں ملازمت کی۔ روزنامہ نوائے وقت میں آپ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء میں نوائے وقت کے خطاط اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۵۶ء میں آپ نے روزنامہ نوائے وقت کی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا اور آزادانہ خوش نویسی شروع کر دی.....اس دوران میں آپ کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی [۱۶]

آپ نے مزید تعلیم کے لئے پنجاب یونیورسٹی ''اورینٹل کالج لاہور'' میں منشی فاضل کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ اس زمانے میں منشی فاضل کی کلاسیں ''اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی'' میں ہوتی تھیں اور ان کلاسوں کو نامور علماء اور ماہر اساتذہ پڑھاتے تھے [۱۷] اورینٹل کالج نے آپ کو ایک کم گو، خاموش طبع، محنتی، ذہین اور کام سے کام رکھنے والا طالب علم پایا، اس زمانے میں آپ کے ایک استاد ڈاکٹر عبادت بریلوی [۱۸] اس زمانے کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قیام پاکستان کے بعد ایک طالب علم اورینٹل کالج میں داخل ہوئے اور انہوں نے باقاعدگی سے اردو زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ وہ عربی، فارسی جانتے تھے لیکن اردو زبان و ادب کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہتے تھے، مجھ سے کئی دفعہ ملے تو میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اردو ادب کے سنجیدہ طالب علم ہیں اور ادب کے مطالعہ کا انہیں شوق ہے، یہ تھے سید انور حسین شاہ خوبصورت، خوش شکل، دراز قد، دبلے پتلے، کتابی چہرہ، گندمی رنگ، داڑھی مونچھیں صاف، سر پر انگریزی بال، شیروانی اور شلوار میں ملبوس، وہ مجھے ایک جاذب نظر اور دل آویز شخصیت کے مالک نظر آئے، یہ زمانہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا، اس وقت ان کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی، لیکچروں میں باقاعدگی سے آتے تھے، طالب علموں سے زیادہ ملتے جلتے نہیں تھے، عام طور پر خاموش اور سنجیدہ رہتے تھے، استادوں کی عزت کرتے تھے، شرم و حیا کا پیکر تھے، دوسرے طالب علموں کی طرح استادوں سے زیادہ ملتے جلتے نہ تھے، لیکچروں میں شریک ہوتے تھے اور اس کے بعد گھر چلے جاتے تھے۔'' [۱۹]

اس طرح آپ نے ماہر اساتذہ کی نگرانی میں اردو زبان و ادب کا مطالعہ کیا.....اور باقی مہارت ذاتی مطالعہ سے پیدا کی۔ چونکہ آپ کا خاندان مذہبی پس منظر کا حامل ہے۔ علوم دینیہ آپ کے اجداد میں کئی پشتوں سے متوارث رہا ہے، خود آپ کے والد محترم ایک عالم باعمل اور صالح بزرگ تھے، اس لئے

آپ بھی بچپن سے ہی نیک سیرت اور ''صاحب خصائص حمیدہ'' واقع ہوئے ہیں۔ کالج میں آپ کے اساتذہ کا اعتراف حقیقت اس کی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔ دینی تعلیم کے ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آپ نے باقاعدگی سے کسی دینی مدرسے میں تعلیم حاصل نہیں کی، بلکہ آپ نے جستہ جستہ کتابیں پڑھیں ہیں، جیسا کہ محمد حسین تسبیحی صاحب لکھتے ہیں:

''لیکن بایں ہمہ اکتفانہ کردوزانوئے ادب درپیش کتب علمی دینی وفقہ واصول وتفسیر وحدیث، تجوید وقرأت بسرزمین ذدوآن قدرخواندتا فہمید کہ چہ چیز باید بخواند۔[۲۰]

یعنی انہوں نے نے دنیوی تعلیم پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ دینی علوم مثلاً فقہ، تفسیر، حدیث اور تجوید وقرأت پڑھنے کے لئے اساتذہ کے سامنے زانوادب تہہ کیا، یہاں تک کہ آپ یہ جان گئے کہ کیا کچھ پڑھنا چاہئے۔''

لیکن شاہ صاحب نے ذاتی طور پر بتایا اور نہ ہی کسی اور ذریعے سے اس بات کا پتہ چلا کہ شاہ صاحب نے کن کن علماء اور بزرگوں کے سامنے زانوے ادب تہہ کیا تھا.....اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دینی مسائل میں جو شعور عطا فرمایا تھا، وہ آپ کے وسیع علمی مطالعہ، علماء سے ذاتی استفادے کے علاوہ خصوصی عطیہ خداوندی بھی ہے، اس کے علاوہ آپ نے اپنے ماموں سید محمد اسلم سے تبرکاً حدیث پڑھی تھی۔[۲۱]

۳ فیض تربیت باطنی:

شاہ صاحب کی یہ حسن سعادت تھی کہا انہیں قلب وذہن کے تزکیے اور ان کی تطہیر کے لئے جس شخصیت کی سرپرستی میسر آئی وہ اپنے دور کی ہی نہیں، بلکہ تاریخ کی ایک قدآور اور عبقری شخصیت ہے جس کی مثالیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ''یہ شخصیت شاہ عبدالقادر رائپوری قدس سرہ العزیز (۱۲۹۵ھ، ۱۴ ربیع الاو ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) کی تھی، جو اپنے عہد کے بلاشبہ قطب دوران تھے، جن کے ''فیوض باطنی'' نے لاکھوں لوگوں کی زندگیوں میں صالح انقلاب برپا کیا۔ اور جو شاہ عبدالرحیم رائے پوری (م ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ/۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء) کے خلیفۂ مجاز اوران کے جاں نشین تھے۔

قیام پاکستان کے بعد بھی اگرچہ شاہ عبدالقادر رائے پوری ۲۳ ہندوستان کے قصبے ''رائے پور'' میں رہائش پذیر رہے، لیکن پاکستان میں ان کا ورود اور قیام اتنا طویل ہوتا تھا جیسے پاکستان ہی آپ کا ''وطن'' ہو، چنانچہ شاہ صاحب نے یہیں آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی، یہ زمانہ شاہ صاحب کے عین شباب کا تھا۔

خود شاہ صاحب نے ایک مجلس میں اس کی تفصیل یوں بیان کی:

''میں اس زمانے میں (نواح ۱۹۵۵ء) میں نوائے وقت لاہور میں شعبہ خوش نویسی کے ساتھ منسلک تھا، میرے ساتھ ایک اور بزرگ بھی کام کرتے تھے، (۲۲ الف) ایک مرتبہ انہوں نے مجھے بتایا کہ لاہور میں ہندوستان کے ایک بڑے بزرگ تشریف لا رہے ہیں، چنانچہ میں نے جاکر حضرت شیخ کی زیارت کی تو دل میں بے پناہ کشش محسوس کی، مگر بیعت کا اتفاق ۱۹۵۷ء (۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ) میں ہوا، جب میں نے نوائے وقت کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔''[۲۳]

شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شاہ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت کے بعد ان کے دل کو بے حد سکون حاصل ہوا۔[۲۴]

یہ اس تعلق کی ابتداء تھی، اس کے بعد یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا، اور زندگی کے سارے اطوار بدل گئے، اس زمانے میں شاہ

صاحب کی بیٹھک چٹان کے دفتر میں ہوتی تھی، حضرت شیخ جب بھی یہاں تشریف لاتے آپ زیادہ تر وقت ان کے ساتھ بسر کرتے اور شیخ کامل کی معیت اور سرپرستی سے مہینوں کے سفر دنوں میں اور دنوں کے منٹوں میں طے ہوتے رہے۔

بعد ازاں یہ تعلق اتنا بڑھا کہ آپ اپنے مرشد کامل کی نگرانی میں منازل سلوک طے کرنے کے لئے نہ صرف پاکستان میں ان کے ہمراہ رہتے تھے، بلکہ ہندوستان جا کر بھی ''رائپور'' میں تادیر قیام پذیر رہتے۔

حضرت رائپوری قدس سرہ العزیز کے اس تعلق نے آپ کی ذات کو منبع فیوض و برکات بنادیا اور آپ کی ذات مرجع خلائق بن گئی۔ بہت جلد مرشد کامل نے آپ کو ''خلافت و اجازت'' عطا فرمادی، چنانچہ آپ کا شمار حضرت رائپوریؒ کے'' بڑے خلفاء میں ہوتا ہے۔۲۵

آپ اس تعلق کی بدولت جذب وجنون کی دولت بیش بہا سے مالا مال ہوئے، اس جذب وجنون ہی کی بنا پر آپ کو بار بار حرمین کی حاضری نصیب ہوئی۔ کئی بار حج کے لئے گئے، رمضان المبارک کے کئی مہینے آپ نے دیار حبیبؐ میں گزارے۔ پاکستان اور ہندوستان کے اولیاء اللہ کے مزاروں پر بھی حاضری دی اور کئی دفعہ خاصا وقت انہوں نے حیدرآباد دکن میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی درگاہ میں بھی گزارا اور جب بھی وہاں سے آئے، تو خواجہ صاحب کی ایسی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف اپنے ہمراہ لائے جو اب تک کسی قیمت پر دستیاب نہیں تھیں۔۲۶

شاہ صاحب اسم بامسمیٰ تھے، آپ نے اپنے نام کی طرح واقعی نفیس طبیعت پائی تھی، اسی لئے جس طرح آپ کا ''اشہب قلم'' اردو، فارسی اور عربی کی خطاطی میں دوڑتا ہے۲۷، اس سے زیادہ آپ کی طبیعت تصوف اور روحانیت کے کاموں میں رواں دواں رہتی ہے، آپ کا شمار پاکستان کے اکابر خطاطان، اکابر صوفیاء اور اونچے درجے کے نعت گو شعراء میں ہوتا ہے۔

آپ کی مجلس اہل علم وتحقیق کا مرجع ہے، پاکستان بھر کے محققین مختلف موضوعات پر مواد کی تلاش وجستجو کے لئے آپ کے در دولت پر حاضری دیتے اور شاد کام ہو کر جاتے ہیں۔

۵. مفاخر ومعالی

دنیا میں ہر روز لاکھوں کی تعداد مسافروں کی آمد اور اتنی ہی تعداد میں..... ان کی وطن کی طرف واپسی ہوتی ہے، لیکن ان میں سے بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما (دنیا کے ورق پر ہمارا دوام لکھ دیا گیا ہے)۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو دنیا میں ایسے قابل فخر کارنامے انجام دے کر واپس جاتے ہیں۔ جو رہتی دنیا تک ان کی یادیں باقی رکھتے ہیں۔ ہمارے مخدوم ومکرم سید نفیس الحسینی بھی انہی خوش نصیب اور اولوالعزم ہستیوں میں شامل ہیں۔ آپ کے مفاخر ومعالی کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مختصراً اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

الف تصنیف وتحقیقی کام:

اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو نہایت عمدہ اور نفیس ذہن عطا کیا تھا۔ جس کا ثبوت وہ کتابیں اور تصانیف ہیں جو آپ کے نوک قلم سے صادر ہوئیں.....

ان کی کتب کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ شجرۃ الاشراف: اپنے بزرگوں کے حالات زندگی، یعنی نبی اکرم ﷺ سے لے کر اپنے والد محترم سید اشرف علی تک ۱۲۵ اجداد کے حالات زندگی۔ (۴۹۶ صفحات)

۲۔ ریحان عترت: حضرت حسنؓ سے شروع کر کے سید احمد شہیدؒ تک..... متعدد بزرگوں کے حالات وسوانح کا مجموعہ (۵۱۲ صفحات)

۳۔ شمیم گلبرگہ (باشتراک سید منور حسین زیدی): سادات گلبرگہ کے شجرہ ہائے نسب۔

۴۔ شمائم گیسودراز: سید محمد گیسودراز پر قدیم کتاب ''سیر محمد'' کا تلخیص و ترجمہ یعنی سید محمد گیسودراز، ان کے بزرگوں اور اولاد کے حالات زندگی۔

۵۔ قطب سوات: (شیخ المشائخ اخوند عبد الغفور قطب سوات کے حالات وسوانح۔

۶۔ حضرت سید احمد شہیدؒ سے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے رشتے (۲۴۰ صفحات)

۷۔ حکایت مہر و وفا: اسلاف کی باہمی محبت و الفت کی لازوال تاریخ (۵۰ صفحات)

۸۔ قاسم العلوم و الخیرات: مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اپنے معاصر تذکرہ نگاروں کی نظر میں (۱۱۲ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ اپنے موضوع پر انتہائی عمدہ تصنیف ہے)۔

۹۔ تفسیر الملتقط: سید محمد حسین المعروف بہ خواجہ گیسودراز کی تفسیرؒ، جسے انہوں نے انڈیا آفس لائبریری سے حاصل کیا۔ شاہ صاحب نے مؤلف کے حالات زندگی سمیت اسے اپنے مکتبہ سے شائع کر دیا ہے۔ دو جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ تیسری جلد زیر طبع تھی۔

۱۰۔ مکاتیب شیخ الحدیث: شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے خطوط بنام شاہ عبد القادر رائے پوریؒ بواسطہ مولانا عبد الجلیل (۴۷۷ صفحات پر مشتمل..... تقریباً ۳۸ مکاتیب کا مجموعہ)

۱۱۔ تذکرۂ سادات گیسودراز پنجاب (حصہ اول) (۲۴۵ صفحات)

۱۲۔ مقالات خطاطی: (خطاطی سے متعلق مقالات کا مجموعہ)

۱۳۔ شعر الفراق: شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ..... علامہ انور شاہ کاشمیریؒ اور دیگر اکابرین دیوبند کا تذکرہ اور آخر میں اپنے پیر و مرشد شاہ عبد القادر رائے پوریؒ کے وصال پر مختلف لوگوں کے کہے ہوئے مختلف مرثیے (۴۰۰ نعات)

۱۴۔ نفائس القلوب: سید محمد گیسودراز کے اذکار و مراقبات کا مجموعہ

۱۵۔ تاریخ جیبی و تذکرہ مرشدی۔

۱۶۔ سیدنا علی و سیدنا حسین رضی اللہ عنہما: (تلخیص نفیس الحسینی..... ان بزرگوں کے متعلق علمائے دیوبند کا نظریہ اور عقیدہ) (۴۲۴ صفحات)

۱۷۔ وقائع احمدی: (اسے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں خصوصی اہتمام کے ساتھ طبع کیا۔

۱۸۔ تفسیر غریب القرآنؓ: یہ تفسیر امام زید بن علی بن الحسینؒ کی طرف منسوب ہے..... یہ دراصل منتخب قرآنی آیات کی عربی میں تشریح ہے..... (۵۰۹ صفحات)

۱۹۔ اللطائف الاحمدیہ فی المناقب الفاطمیہ: سیدہ حضرت فاطمۃ الزہراء کے فضائل کا مجموعہ: مؤلف احمد حسن سنبھلی چشتی..... شاہ صاحب نے ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء میں اسے دوبارہ طبع کیا (۱۱۱ صفحات) ۲۸

۲۔ مرقعات و خطاطی کے نمونے:

جب کہ شاہ صاحب کے مرقعات پر مبنی درج ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ الاسماء الحسنیٰ: شاہ صاحب نے خط ثلث میں جلی انداز میں اسمائے حسنیٰ لکھے تھے، انہیں اس مجموعہ کی صورت میں جمع کر دیا گیا ہے۔ (کل صفحات ۵۲)

۲۔ اربعین صلوٰۃ و سلام: (نام سے ظاہر ہے کہ صلوٰۃ و سلام پر مشتمل ہے)۔

۳۔ نستعلیق نامہ: اس کی جمع و تدوین شاہ صاحب کے فرزند سید انیس نے کی۔ مختلف النوع کتابت کا مجموعہ۔ (۶۴ صفحات)

۴۔ نفائس اقبال: شاہ صاحب کی اس شاہکار خطاطی کا

مجموعہ جو آپ نے ایوان اقبال ۱۴۱ کتبوں کی شکل میں کی، تقریظ مفتی محمد تقی عثمانی۔ (کل صفحات ۸۶)

۵۔ ارمغان نفیس ۲۹؎

۳. اشعار کے مجموعے:

۱۔ **گلہائے نفیس:** یہ کتاب مفتی محمد جمیل خان نے مرتب کرکے شائع کی...... اس میں شاہ صاحب کی مختلف موضوعات، خصوصاً لغت اور منقبت نبوی وصحابہ اور بزرگان دین کے مرثیے وغیرہ پر مشتمل نظمیں شامل ہیں۔ (کل صفحات ۱۲۰)

۲۔ **برگ گل:** اس مجموعے کی تقریظ مفتی محمد تقی عثمانی نے لکھی ہے اس کتاب میں بھی شاہ صاحب کے مختلف موضوعات خصوصاً نعت وحمد باری تعالیٰ وغیرہ پر شاعرانہ کلام جمع کیا گیا ہے (۲۱۶ صفحات) ۳۰؎

اس سلسلے میں درج ذیل امور خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔

شاہ صاحب کی تمام کتابیں شان نبوت، شان اہل بیت نبوی، شان صحابہ، شان بزرگان دین ومشائخ تصوف اور اصلاحی اور تہذیبی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو عین مناسب ہوگا کہ شاہ صاحب فنافی النبوۃ تھے تو یہ غلط نہ ہوگا۔

۲۔مختلف گمراہ فرقوں اور گمراہ جماعتوں کا ردّ:

اس کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنی کتب کے ذریعہ گمراہ اور باطل فرقوں اور جماعتوں کی تردید اور ان کے ابطال اور مذمت کا عظیم کام بھی لیا ہے.......اس سلسلے میں خصوصاً اہل تشیع اور جدید ناصبیت.... یا خارجیت کا ذکر کیا جاسکتا ہے، جس کی تردید وابطال کے لئے شاہ صاحب زندگی بھر شمشیر بکف رہے۔

۳۔تہذیب واصلاح:

شاہ صاحب نے بہت سی کتابیں تہذیب واصلاح کے لئے بھی مرتب اور مدون فرمائی ہیں۔ جن میں اپنے بزرگوں کے حالات زندگی، ان کے ایمان افروز واقعات اور ان کی دلوں کو روشنی اور ذہنوں کی تازگی عطا کرنے والی باتوں کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ۳۱؎

۴۔ نایاب اور نادر کتابوں کی فراہمی اور ان کی اشاعت:

یہ بھی شاہ صاحب کا خصوصی شعبہ تھا اور بلا مبالغہ انہوں نے بیسوں نایاب اور نادر کتب اکھٹی کرکے انہیں شائع کیا۔

(ب) شاعری:

اوپر گزر چکا ہے کہ اللہ نے آپ کو انتہائی موزوں اور نفیس طبیعت سے مالا مال کیا ہے، اسی لئے آپ ایک بہت اچھے شاعر اور نعت نگار بھی ہیں، مگر آپ کی شاعری "الشعراء یتبعھم الغاوون" کے زمرے میں نہیں آتی بلکہ "إلا الذین امنوا و عملو الصالحات" (مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے) کا مصداق ہے۔

آپ کی شاعری ''کوچہ یار'' کے طواف نہیں کرتی نہ ہی ''زلف یار'' کے خیالوں میں مگن رہتی ہے، بلکہ اس کا نمایاں وصف عشق حقیقی کی تجلیات اور اس کے جلوے ہیں، یہاں بھی آپ کی انفرادیت قائم رہی ہے کہ آپ نے شاعری میں کسی ''استاد سخن'' سے کبھی اصلاح نہیں لی، بلکہ قدرت نے آپ کو یہ ملکہ خود عطا فرمایا، کہ آپ براہ راست ''منبع صدق وصفا'' سے مستفید ہوئے، غلام نظام الدین آپ کے متعلق لکھتے ہیں:

''نفیس رقم'' نے جب سے خود کو عام خطاطوں کی جماعت سے نکال کر عارفین سالکین کے مقدس گروہ میں ڈال لیا ہے، ان کے سینہ باطن کو ''روح القدس'' کی اعانت وحمایت حاصل ہے اور ان کے ہاں جمالیاتی رسائیوں کا احساس شدید تر ہوگیا ہے، اب ان کی نستعلیق میں فن جزالت پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ حسنِ حقیقی کے جلوے ان کے دائروں میں موج در موج منعکس ہو رہے ہیں۔ ۳۲؎

شاہ صاحب میں شاعری کا جذبہ پیدائشی اور فطری ہے،

آپ ابھی انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے کہ اسی وقت سے آپ نے ''سید انور زیدی'' کے نام سے شعر گوئی شروع کر دی تھی، ابھی آپ وہاں سال اول کے طالب علم تھے کہ آپ کا نعتیہ کلام کالج کے ادبی میگزین میں شائع ہوا، اس وقت عمر پندرہ برس تھی.....اس وقت کا کہا ہوا سلام.....بڑا زور دار اور پر تاثر ہے، ملاحظہ فرمائیے:

سلام اے شمع روشن، چشم عبد اللہ کی بینائی
زمانہ تجھ پہ قربان ہے، فرشتے تیرے شیدائی
تیری آمد سے رونق آ گئی گلزار ہستی میں
عنا دل چہچہا اٹھے بہار آئی بہار آئی
تیری رحمت کے دامن کی ہے لامحدود پہنائی

اس دور میں، جب آتش جواں تھا۔ زیادہ تر غزلیں کہی گئیں لیکن چونکہ وہ دور ابھی شعور میں پختگی کا محتاج تھا، جو وقت کے آگے بڑھتے ہوئے پیدا ہوئی، اس لئے اس دور کی کہی ہوئی بیشتر غزلیں آپ کے حال ہی میں شائع ہونے والے مجموعے ''برگ گل'' ۳۴ میں جگہ نہ پا سکیں۔

اس دور میں آپ نے کچھ نظمیں بھی کہیں، جن میں سے بطور مثال ۱۸ ستمبر ۱۹۵۱ء کو کہی گئی، نظم کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جو ''حکیم مشرق لائل پور میں سید انور زیدی کے نام سے طبع ہوئی۔ اس میں آپ فرماتے ہیں:

دلوں میں حکمت قرآن لئے ہوئے اٹھو
جلال و بوزرؓ و سلمان لئے ہوئے اٹھو
وہ ہند دعوت یلغار دے رہا ہے تمہیں
رگوں میں خون شہیداں لئے ہوئے اٹھو
تمہارے دین کی ظلمت ہے چوٹ کھائے ہوئے
جگر پہ داغ نمایاں لئے ہوئے اٹھو
اٹھو غبار زمانہ کو اپنے زیر کرو

یہ کام ایسا نہیں ہے کہ اس میں دیر کرو ۳۴

شاہ صاحب کی شاعری کا کوئی مجموعہ مدتوں شائع نہیں ہوا (برگ گل حال ہی میں طبع ہوا ہے) جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ کی طبیعت میں بزرگوں کی طرح ''اخفائے حال'' کا جذبہ کمال درجے کا تھا، اکثر اوقات آپ کلام سنانے کے بعد اپنا نام بھی نہیں بتاتے، چنانچہ نظام الدین صاحب فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ لاہور کے ایک کیفے میں شاہ صاحب یوسف سدیدی اور راقم الحروف اکٹھے چائے پی رہے تھے، شاہ صاحب نے مختلف شعراء کا کلام سنایا، پھر ایک رباعی بے حد پسند کی گئی، لیکن فرمائش کے باوجود شاہ صاحب نے شاعر کا نام نہ بتایا اور یہی کہتے رہے، بس کسی کی ہوگی، میں سمجھ گیا کہ اس نکرہ میں انتہائی معرفہ پن ہے، جب میں نے اصرار سے کہا کہ رباعی یقیناً آپ ہی کی ہے تو انہوں نے تسلیما ہلکا سا تبسم کیا اور آپ کی آنکھوں میں ایک پر مسرت چمک آ گئی لیکن خاموش رہے ۳۵''

ابتدائی دور میں شاہ صاحب اس موقع پر شاعری کرتے جب کوئی خوشگوار یا ناخوشگوار موقع آپ کے خیالات میں تموج یا نبج پیدا کر دیتا تو آپ کے اندر موجود بحر معانی اشعار کا روپ دھارنے کے لئے بیتاب ہو کر باہر نکل پڑتا، مثال کے طور پر ۱۹۶۲ء میں آپ کے پیر و مرشد شاہ عبدالقادر رائپوری قدس سرہ کا وصال ہوا تو آپ کے جذبات میں ہلچل پیدا ہوگی اور اس موقع پر آپ نے ایک پر درد اور پر سوز المیہ نظم کہی، جسے عرف عام میں مرثیہ کہا جاتا ہے، اس میں آپ نے چھوٹی بحر منتخب کی ہے، جس میں حروف علت، (ا، و، ر) کا تکرار ملتا ہے، جس سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے غم ایک ایک قطرہ بن کر ٹپک رہا ہو اور آہوں اور سسکیوں کا ایک دھواں فضا کو مرتعش کر رہا ہو، آپ فرماتے ہیں:

اے غم جاناں اے غم جانم دل ہے پر خون آنکھیں پر نم

اللہ اللہ ان کا عالم عشق سراپا حسن مجسم
قطب زمانہ غوث یگانہ رشک جنید و شبلی و ادھم
لاکھوں دلبر لیکن پھر بھی تیرا عالم، تیرا عالم
فانی فی اللہ باقی باللہ ختم ہے انہی پر ان کا عالم
جامع سنت قاطع بدعت نائب حضرت فخر دوعالم
عسکری اصحاب محمد لشکری پیغمبر خاتم
تجھ سا نہ دیکھا تجھ سا نہ پایا اتر، دکھن، پور، پچھم
حسب تکلم، رنگ تبسم غم کا مداوا زخم کا مرہم
گاہ اشارہ گاہ کنایہ مجمل مجمل، مبہم مبہم
نور شریعت فیض طریقت جاری ساری باہم باہم
سوز مروت لحظہ لحظہ درد محبت پیہم پیہم
دنیا دنیا، عقبی عقبی عالم عالم تیرا ماتم[۳۶]

شاعری میں شاہ صاحب بہت تیزی سے منزلیں طے کر رہے تھے اور دل کی وارداتیں حسین الفاظ سے مجسم ہو کر سننے والوں کے دل موہ رہی تھیں کہ اسی اثنا میں شاعرانہ جذبات پر مہر وشفقت کا سایہ لہرا گیا اور جذبات کی رو کے ساتھ آگے بڑھنے والی شاعری کو بریک سا لگ گیا:

ہوا یوں کہ جب شاہ صاحب..... شاہ عبد القادر رائپوریؒ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے تو ایک روز حضرت رائپورؒ نے فرمایا: شعر کا ذوق بھی ہے؟ عرض کیا حضرت بہت زیادہ ذوق وشوق ہے۔ فرمایا: جب کسی کی شادی ہوتی ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ خوب رونق اور چہل پہل ہو، مگر جب وصال کا لمحہ آپہنچتا ہے تو اپنے اور محبوب کے درمیان کسی غیر کا وجود برداشت نہیں کرسکتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ سنتے ہی میری ذہنی کیفیت ہی بدل گئی۔ طبیعت میں وہ جوش وخروش نہ رہا، شعر گوئی کا ذوق تو باقی رہ گیا ہے، مگر شوق بالکل جاتا رہا اور شاید ہی کوئی نعت یا نظم موزوں ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کو جو ذوق شعری بخشا ہے، آپ نے اس کا بھرپور استعمال نعت گوئی اور منقبت گوئی میں کیا ہے، آپ کی شاعری کا من پسند موضوع نعت رسول مقبول ہے، مثلاً ایک نعت میں آپ فرماتے ہیں:

عطا قدموں میں ہو دائم حضوری یا رسول اللہ
ہے اب ناقابل برداشت دوری یا رسول اللہ
عنایت ہو اگر اک لمحہ اپنی خاص خلوت کا
مجھے اک عرض کرنی ہے ضروری یا رسول اللہ
اجازت ہو تو کچھ چشمان تر سے بھی بیان کرلوں
ابھی ہے داستانِ غم ادھوری یا رسول اللہ
میری غایت تمنا ہے در اقدس کی دربانی
ز ہے عزت اگر ہو جائے پوری یا رسول اللہ
مدینے میں ہی آکر راحت وتسکین پاتی ہے
دل فرقت زدہ کی ناصبوری، یا رسول اللہ
دم رخصت نفیسؔ اشکوں سے تر ہے رحم فرماؤ
خدارا اک جھلک ہلکی سی نوری یا رسول اللہ[۳۷]

یہ نعت شائع ہوئی تو اس کے ساتھ چوکھٹے میں یہ سطور بھی تھیں۔

''یہ درماندہ مواجہ شریف پر حاضر خدمت اقدس ہوا فوراً ہی ایک شعر وارد ہوگیا بعد میں تدریجاً مدینہ منورہ ہی میں اور شعر بھی ہوگئے، آخری شعر رخصت کے وقت ہوا۔'' (نفیس)

مندرجہ بالا نعت جس پس منظر میں کہی گئی وہ جاننے کے بعد یقیناً اس کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے، آپ یہ نعت ایک بار پھر پڑھ لیجئے۔

شاہ صاحب کی نظموں کے اس مجموعے ''برگ گل'' کی رو سے آپ نے حمد باری، نفائس النبیؐ، مناقب، شعر الفرقان، اذن جہاد، مینائے غزل، نفائس اور صریر قلم کے عنوان سے بہت عمدہ اور خوب صورت نظمیں اور نعتیں کہی ہیں۔ خصوصاً نعتوں میں

آپ کا اسلوب ایسا ہے کہ ہر نعت بار بار پڑھنے اور گنگنانے کو جی چاہتا ہے، مثلاً ایک نعت ملاحظہ فرمائیے۔[۳۸]

چھا رہی ہے گھٹا مدینے کی ۔۔۔ آ گئی رت پلانے پینے کی
زندگی اس کی، موت اس کی ہے ۔۔۔ خاک ہو جائے جو مدینے کی
مئے افرنگ میں وہ بات کہاں ۔۔۔ لا مرے واسطے مدینے کی
ختم ہے سلسلہ نبوت کا ۔۔۔ مہر ہے ہاشمی نگینے کی
ہفت قلزم کے موتیوں سے گراں ۔۔۔ بوند اک اک ترے پسینے کی[۳۹]

....

ملائک ساتھ ہیں دامن سنبھالے
حرا سے آ رہے ہیں کملی والے
چہار آفاق مجھ پر ہو گئے تنگ
پرائے کو بھی جو اپنا بنا لے
بہار آئی ہے غنچے کھل رہے ہیں
مرے دل تو بھی دو دن مسکرا لے[۴۰]

نفیس صاحب کی نعتوں میں اس انداز کے اشعار بھی ملتے ہیں، جس کا اپنا ایک لطف ہے

ہاں! ساقی کوثر سے صبا! عرض یہ کرنا
ایک رند سیہ مست بہت یاد کرے ہے
یہ عاشق بے نام ہے مشتاق زیارت
دن رات ترے ہجر میں فریاد کرے ہے
اے باد صبا! راہ تیری دیکھ رہا ہوں
اب آ کے سنا جو بھی وہ ارشاد کرے ہے[۴۱]

آپ کی بعض نعتوں میں جو آمد ہے اور واردات قلبیہ کی جس طرح عکاسی ہوتی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

دنیا سیپ محمد موتی ﷺ
اس بن دنیا کیسے ہوتی ﷺ
مقصودِ کونین محمدؐ دارین
اس بن دنیا کیسے ہوتی ﷺ
کاش مرے محبوب کی دھرتی مجھ پر نفیسؔ شفقت کرتی
اپنے اندر مجھ کو سموتی ﷺ[۴۲]

آپ نے فراق، غزل، اور دوسرے عنوانات پر بھی بڑی عمدہ شاعری کی ہے، جس سے بلاشبہ دل و دماغ معطر اور منور ہو جاتے ہیں، آپ کی شاعری شاہد و شراب کی شاعری نہیں ہے، آپ کی شاعری سچے اور سُچے لفظوں اور انسانی زندگی کے گہرے سمندروں کی شاعری ہے۔ آپ کی شاعری کے سوتے آپ کے دل و دماغ اور آپ کے حالات و واقعات سے پھوٹتے ہیں، آپ نے اپنے جذبوں کو زبان عطا کی ہے، اور اپنی سوچوں کو شاعری کا رخ عطا کیا۔

شاعری زیادہ تر آمد پر مشتمل ہے، کسی کسی جگہ البتہ آورد بھی ہے، لیکن بہت کم ہے، جن جن موقعوں پر اشعار کہے گئے ہیں وہ سب تاریخی موقع ہیں، سکردو کے سفر میں مضمون نگار آپ کے ہمراہ تھا، ہوائی جہاز راولپنڈی سے اترا۔ راستے میں جب کوہ دمن کے اوپر سے گزرا تو آپ پر کیفیت طاری ہو گئی اور آپ نے یہ اشعار نظم کیے:

دریا جو بہہ رہا ہے سبحان تیری قدرت
ہر قطرہ کہہ رہا ہے سبحان تیری قدرت
جو بار اٹھا سکے نہ ارض و جبال و افلاک
انسان سن رہا ہے سبحان تیری قدرت[۴۳]

اسی طرح مختلف بزرگوں کے مزارات کی حاضری کے موقع پر بھی انہوں نے اسی طرح کی پر اثر اور پر درد اشعار کہے ہیں۔

۲۔ خوش نویسی اور اس میں آپ کا مقام

شاہ صاحب سید محمد اشرف علی اپنے وقت کے خط نستعلیق کے نامور خطاط اور خوش نویس تھے، اس طرح، کتابت کا فن آپ کی خاندانی میراث ہے، آپ نے اسی فن کی گود میں آنکھ کھولی،

اسی نے آپ کی پرورش کی، اسی کی چھاؤں آپ پر سایہ پدری بن کر ضوء فگن رہی، جن دنوں آپ اورینٹل کالج میں زیر تعلیم تھے۔ان دنوں میں بھی آپ ایک ماہر فن ''کاتب'' تھے۔آپ کے ہم سبق اور آپ کے اساتذہ اس پر متعجب ہوتے تھے، چنانچہ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

چنانچہ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہیں، کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں لیکن جب دسمبر میں ان کا امتحان ہوا اور میں نے ان کی امتحان کی کاپی دیکھی تو میں ان کے خط کی خوبصورتی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میرے دل میں یہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی کہ خط میں یہ حسن و جمال ان کے پاس کہاں سے آیا ہے اور فن انہوں نے کس سے سیکھا ہے، چنانچہ ایک دن میں نے انہیں اپنے پاس بلایا اور ان کی امتحان کی کاپی انہیں دکھا کر پوچھا، ایک طالب علم کا خط اتنا خوبصورت نہیں ہوسکتا۔ یہ فن آپ نے کس سے سیکھا ہے؟ کہنے لگے، میرے خط میں کوئی خاص بات نہیں ہے، آپ کا حسن ذوق اور حسن نظر ہے، ویسے میں پیشے کے اعتبار سے خوش نویس ہوں، کتابت کرتا ہوں، میرے والد بھی کلام پاک کی کتابت کرتے تھے، وہی میرے استاد ہیں۔ میں نے انہی سے سب کچھ سیکھا ہے میں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ میں تخلیق کی ایسی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ میں آپ کے فن سے بہت متاثر ہوا ہوں، یہ کہہ کر میں نے دوسروں کو ان کی کاپی دکھائی اور اس طرح سارے کالج کو اس کا علم ہوگیا کہ ایک فن کتابت کا ماہر ان کے کالج کا طالب علم ہے۔۴۴''

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، شاہ صاحب نے کسی بھی نامور خطاط کی شاگردی اختیار نہیں کی، بلکہ جو کچھ سیکھا، اپنے والد سے سیکھا اور اس فن میں اپنے پیر و مرشد شاہ عبدالقادر رائپوریؒ کی روحانی فیوض و برکات نے آپ کی تحریر میں روحانی اثر و نفوذ پیدا کیا، اسی لئے آپ کے خط میں ظاہری حسن و جمال کے ساتھ ساتھ ایک معنوی اور روحانی حسن و جمال بھی بدرجہ اتم موجود ہے، اور یہی وجہ ہے آپ کی تحریر کی کشش دوآتشہ بلکہ سہ آتشہ ہوکر اپنا اثر دکھاتی ہے۔

شاہ صاحب کا قلم نصف صدی سے زیادہ عرصے تک آب و تاب دکھاتا رہا۔اس عرصے میں ملکی میدان سیاست سے لے کر آپ کی اپنی زندگی میں کئی تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں۔ آپ شروع میں نوائے وقت میں ملازم ہوئے اور بانی نوائے وقت حمید نظامی کے ساتھ مل کر کام کیا۔آپ نے ایک مرتبہ بتایا کہ آپ نوائے وقت کے موجود چیف ایڈیٹر مجید نظامی کے نکاح میں شریک تھے، اور یہ نکاح مفتی محمد حسینؒ بانی جامعہ اشرفیہ نے پڑھایا تھا۴۵۔ بعد ازاں آپ نے یہ ملازمت چھوڑ دی۔ پھر ایک زمانے تک شورش کاشمیری کے ہفت روزہ چٹان کے دفتر کی بالائی منزل پر کرایہ پر کمرہ لے کر اس میں بیٹھتے رہے، اسی زمانے میں آپ نے روحانی منازل کی تکمیل فرمائی اور آپ کی کتابت کے حسن و جمال کی شہرت ملک میں چار سو پھیلی

آخری ایام میں آپ نے دریائے راوی کے مغربی کنارے پر خانقاہ سید احمد شہید میں بیٹھنا شروع کیا۔اس سے پہلے ''سبز زار'' کے حافظ ٹاؤن میں ایک خانقاہ کی تاسیس کی گئی ہے، جس میں آپ ہر جمعرات کی رات سے جمعہ کی نماز تک قیام کرتے رہے، آپ کے فن کے متعلق چند اہل قلم کی آراء مندرجہ ذیل ہیں۔

نامور ادیب اور فاضل محمد حسین تسبیحی لکھتے ہیں:

''ہرکس کہ انتشارات مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان را مطالعہ میکند با نام مولانا سید انور حسین نفیس رقم آشنا است، آقائی نفیس رقم یکے از خوشنویسان و خطاطان مشہور ماہروزریں دست وخوش قلم است'' استاد نفیس رقم بالکلیہ اقلام خطوط اسلامی کہ از صدر اسلام تا امروز بہ وجود آمدہ است متیواند خوشنویسی میکند و ہرگاہ بہ وقت درخوشنویسی آقای ایشان رایک نقاش ماہروچرب دست بہ حساب برآوردیم۔۴۶

یعنی جوشخص ''مرکز تحقیقات فارسی ایران، پاکستان کی مطبوعات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ مولانا سید انور حسین نفیس رقم کے نام سے ضرور واقف ہوگا۔ آقائے نفیس دنیا کے مشہور اور معروف خوش نویس، خطاط ''سنہری دست'' اور خوش قلم ہیں.....استاد نفیس ان تمام قلموں (طریقہ ہائے کتابت) میں، جو صدر اسلام سے ہمارے اس دور تک معرضِ وجود میں آئیں.....عمدہ طریقے سے کتابت کرسکتے ہیں اور کتابت کرتے وقت ہم نے انہیں ایک ماہر نقاش اور ہاتھ کی مہارت رکھنے والا دیکھا اور گمان کیا ہے۔اسی طرح غلام نظام الدین صاحب فرماتے ہیں:

دس سال پیشتر ایک کیلینڈر میری نظر سے گزرا، اس پر غالب کا یہ شعری جلی قلم سے لکھا تھا:

''نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن''

شعر اتنا خوش خط لکھا تھا کہ حرفوں کی نشست اور ساتھ ہی ایک پرندے کی مغموم مگر معصوم صورت نے مل کر ایک ایسا ماحول پیدا کردیا، جس میں حزن و یاس اور حسرت وافسردگی کا غلبہ تھا، شاعر کے فکر وخیال کو خطاط نے اپنی قلمی اپج سے اس قدر حسین و جمیل پیکر بخشا کہ وہ ان کی چشم وسعت کے آگے تنگ نظر آنے لگا۔اس فن پارے کے جلال و جمال سے عرصہ تک دل محظوظ ہوتا رہا، تا آنکہ ایک دن میرے دوست حافظ محمد یوسف سدیدی میرے پاس تشریف لائے، غالب کا شعر سامنے والی دیوار پر آویزاں تھا، میں نے سدیدی صاحب سے اس کی تفصیل چاہی انہوں نے بتایا کہ یہ شعر سید نفیس رقم نے کتابت کیا ہے۔۴۷

یہی مضمون نگار اپنے ایک دوسرے مضمون میں شاہ صاحب کی عظمت کے تحت فرماتے ہیں:

خط نستعلیق کے متعلق حافظ محمد یوسف سدیدی اور صوفی محمود سدیدی صاحب سے اکثر بات چیت رہتی تھی۔ کثرت محنت کی وجہ سے ان حضرات نے اپنے اپنے اسلوب میں جو انفرادی حسن پیدا کرلیا تھا، اس کا کسے اعتراف نہیں اور ان کی عہد آفریں عظمت سے بھی کسے انکار ہوسکتا ہے، لیکن میرا طریقہ یہ تھا کہ اچھے سے اچھے نستعلیق کو میں کئی مرتبہ دیکھا کرتا تھا اور ہر مرتبہ تادیر دیکھتا رہتا تھا، پھر مجھے خیال آتا کہ یہ لفظ اگر یوں ہوتا تو بہتر ہوتا، وہ لفظ اگر یوں ہوتا تو کتنا اچھا لگتا، یوں اصلاح و ترمیم سوچتے سوچتے میرے اندر ایک تنقیدی ملکہ پیدا ہوگیا، حضرت صوفی محمود سدیدی گواہ ہیں کہ میں نے کوئی چیز لکھوائی ہوتی تو جو سیٹنگ میں اپنے قلم سے دے بھیجتا، اکثر و بیشتر حضرت صوفی صاحب وہی سیٹنگ قبول فرماتے اور اسی طرح لکھ دیتے، حافظ صاحب میری سیٹنگ میں بعض مرتبہ ترمیم کرتے اور خوب کرتے، لیکن عام طور پر وہ بھی میری سیٹنگ قبول کرلیتے تھے، اسی طرح میری حوصلہ افزائی ہوجاتی اور مجھے نستعلیق کے بارے میں اپنے حسن نظر پر بھروسہ سا ہونے لگا اگرچہ یہ سب کچھ حافظ یوسف سدیدی اور صوفی محمود سدیدی صاحب کی خدمت میں چند گھڑیاں بیٹھنے ہی کا نتیجہ تھا۔

جمال ہمنشیں در من اثر کرو
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

☆☆☆

حواشی

۱۔ شاہ صاحب کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا شجرۂ نسب الحسن، (خصوصی شمارہ اگست تا دسمبر ۲۰۰۸ء و جنوری ۲۰۰۹ء) کے شروع میں شامل ہے، جس کی رو سے آپ کا نسب نامہ حضرت حسینؓ تک پہنچتا ہے۔

۲۔ سید انور حسین نفیس الحسینی، مقدمہ، برگ گل، مطبوعہ لاہور: نیز دیکھئے اردو دائرہ اسلامیہ، ۵۸۵/۱۷، ۵۸۹ مقالہ بذیل گیسو دراز۔

۳۔ شاہ صاحب کے اپنے ہاتھ سے تحریر کردہ نسب نامہ کے مطابق آپ کے اور سید محمد گیسو دراز کے مابین پشتوں کا فاصلہ ہے۔ (دیکھئے الحسن.....شمارہ مذکور)

۴۔ ایضاً نسب نامہ (قلمی)

۵۔ سید نفیس الحسینیؒ، سید ابوالحسن زید الجندیؒ.....کی شخصیت کے بے حد معترف تھے۔ چنانچہ انہوں نے ''تفسیر الملتقط'' کا انتساب انہی کے نام سے کیا ہے.....اس حوالے سے تفسیر کے انتساب کے تحت لکھتے ہیں:

سادات گیسو دراز کے جد بزرگوار سید المجاہدین حضرت سید ابوالحسن زید الجندی شہید دہلیؒ کے نام، جو خراسان سے فتح دہلی کے لئے سرفروش و جانباز مجاہدین کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ چند بار آئے اور حصار دہلی پر حملہ آور ہوئے۔ آخر ایک معرکہ عظیم میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہادت عظمیٰ سے سرفراز ہوئے۔ یہ واقعہ چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں پیش آیا۔ مجاہد سر کٹانے کے لئے بے چین رہتا ہے۔ کہ سرفراز ہوتا ہے خنجر در گلو ہوکر (سید نفیس الحسینی)'' (تفسیر الملتقط، انتساب)۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنے پوتے کا نام بھی زید رکھا.....ان کی شخصیت پر شاہ صاحب ریحان عترت (مطبوعہ ۱۹۹۸ء: ص، ۱۳۱، ۱۳۵) پر مستقل مضمون لکھا ہے۔

۶۔ مکتبہ نفیس منزل، کریم پار رادی روڈ، بدوں تاریخ.....راقم الحروف کو شاہ صاحب نے یہ کتاب ۲۸ ذوالحجہ ۱۴۲۴ھ کو اپنے دستخطوں سے مرحمت فرمائی اور اس پر اپنے ہاتھوں سے تحریر فرمایا: 'گرامی قدر جناب مولانا ڈاکٹر محمود الحسن عارف صاحب، زید مجدہ.....از احقر نفیس الحسینی، ۲۸ ذوالحجہ ۱۴۲۴ھ''

۷۔ شاہ صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق زیادہ تر باتیں، خاکسار نے خود ان کی اپنی زبان سے سنی ہیں اور کچھ باتیں ان کی کتاب شجرۃ الاشراف سے ماخوذ ہیں (دیکھئے شجرۃ الاشراف، ص ۴۶۳)

۸۔ یہ بزرگ شاہ صاحب کے ساتویں پشت پر ہیں۔ (قلمی نسب نامہ، الحسن)

۹۔ بڈھن شاہ صاحب بعض نسبت ناموں میں بدھی شاہ بھی لکھا گیا ہے۔

۱۰۔ شہر کی تاریخ کے لئے دیکھئے: اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۴۸۸/۱۱۔ ۴۹۰ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۴ء۔

۱۱۔ سید محمد اشرف علیؒ.....نے قرآن حکیم کے متعدد نسخوں کی کتابت فرمائی ان میں سے ایک نسخے کی عکسی طباعت سید نفیس الحسینیؒ نے سید محمد گیسو دراز (م ۸۲۵).....قرآن حکیم کا یہ نسخہ نہایت عمدہ اور خوب صورت خط میں تحریر شدہ ہے.....اور شاہ صاحب کے خط سے بے حد مماثلت رکھتا ہے۔

۱۲۔ سید محمد اشرف علی کے مزید حالات کے لئے دیکھئے شاہ صاحب کی تصنیف.....شجرۃ الاشراف۔

۱۳۔ دیکھئے برگ گل: ص، ۱۳۶۔

۱۴۔ یہ تاریخ شاہ صاحب نے اپنے ہاتھوں سے متعدد مقامات پر تحریر کی ہے.....دیکھئے الحسن، خصوصی شمارہ، ایک ڈائری سے عکس۔

۱۵۔ اس زمانے میں یہ گورنمنٹ کالج دھوبی منڈی کہلاتا تھا۔ مگر اس وقت یہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی ہے۔ فیصل آباد کے ایک سفر کے دوران جو شاہ صاحب محترم کے ہمراہ ہوا، گورنمنٹ کالج جانے کا اتفاق ہوا۔ اس موقع پر شاہ صاحب نے اپنے زمانۂ طالب علمی کی کئی باتیں بتائیں۔

۱۶۔ قلمی سوانحی خاکہ.....ص، ۱۔

۱۷۔ یہ ۱۹۵۰-۱۹۵۵ء کے دور کا واقعہ، اس وقت پہلے ڈاکٹر محمد شفیع اور پھر ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (م ۱۴/اگست ۱۹۸۶ء) پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پرنسپل اور اردو، فارسی اور عربی تینوں شعبوں کے سربراہ رہے۔

۱۸۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی.....اورینٹل کالج، شعبہ اردو کے استاد بعد میں صدر شعبہ اور پھر پرنسپل اورینٹل کالج رہے۔ اردو کے نامور اساتذہ اور ماہرین میں سے تھے۔ انہوں نے اردو زبان و ادب پر متعدد کتب اور بیسوں مقالات تحریر فرمائے۔ اپنی کتاب ''آہوان صحراء'' میں انہوں نے اپنے معاصرین اور اپنے شاگردوں اور اساتذہ کا تعارف پیش کیا ہے۔

۱۹۔ آہوان صحراء: ص ۹۳۔

۲۰۔ استاد نفیس رقم، در پارس، شمارہ ۳۹۵۵، دو شنبہ بیت و نہم دی، ۱۳۴۵ھ، ش۔

۲۱۔ سوانحی خاکہ، قلمی، ص ا

۲۲۔ رائپوری سلسلے کی بنیاد معروف صوفی بزرگ شاہ عبدالرحیم رائپوری (۱۹۱۹ء) نے رکھی ہے.....وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے خصوصی دوستوں اور احباب میں سے تھے.....شاہ عبدالرحیم کی وفات کے بعد شاہ عبدالقادر

رائے پوری، ان کے جانشین بنے..... اس سلسلے کی اہمیت اور تفصیل کے لئے دیکھئے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، سوانح شاہ عبد القادر رائے پوری، ص ۳۱۹-۳۴۲۔

۲۲۔الف) شاہ صاحب نے اپنے اس محسن کا نام بھی بتایا ہے۔ان کے مطابق یہ بزرگ چودھری بشیر صاحب تھے..... جب کہ معروف احراری رہنما علامہ مجاہد الحسینیؒ کا دعویٰ ہے کہ شاہ صاحب کو شاہ عبدالقادر رائے پوری کی مجلس میں لے جانے والے وہ تھے اور یہ کہ شاہ صاحب کو سہو ہو رہا ہے لیکن شاہ صاحب نے دعوے کو تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ مجاہد الحسینیؒ انہیں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری (م ۱۲ اگست ۱۹۶۱ء) کی مجلس میں لے گئے تھے نہ کہ شاہ عبدالقادر رائے پوری کی مجلس میں۔

۲۳۔شاہ صاحب سے ذاتی ملاقات، نیز قلمی سوانحی خاکہ، ص ا۔

۲۴۔فیصل آباد کے سفر کے دوران..... ایک مرتبہ آپ نے خاکسار کو مولانا لدھیانوی مرحوم کے مدرسہ میں واقع وہ جگہ دکھائی جہاں شاہ صاحب اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم پہلو بہ پہلو بیٹھا کرتے تھے اور یہ جگہ مسجد کے داہنی طرف اس حجرے/کمرے کی طرف واقع تھی، جہاں شاہ عبدالقادر رائے پوری قیام فرمائے تھے۔

۲۵۔دیکھئے شاہ عبد القادر رائے پوری کے خلفاء کی فہرست، در ریحان عترت، مطبوعہ سید نفیس رقم، ص ۳۷۷، ۳۷۸۔

۲۶۔شاہ صاحب نے متعدد کتب ان میں سے طبع کر دی ہیں..... مثلاً شمیم گلبرگہ، شمائم گیسو دراز، اور تفسیر الملتقط۔

۲۷۔ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۹۸۔

۲۸۔ان میں سے زیادہ تر کتب راقم الحروف کے پاس موجود ہیں۔اس کے علاوہ راقم الحروف نے مولانا سعید احمد جلال پوری کے مقالے تاریخی و تحقیقی و تصنیفی تالیفی اور اشاعتی کارنامے (در الحسن، خصوصی نمبر، ص ۱۳۶۷ تا ۱۴۶۳) سے بھی استفادہ کیا ہے۔

۲۹۔ان میں سے زیادہ کتب راقم الحروف کے پاس موجود ہیں۔اس کے علاوہ راقم الحروف نے مولانا سعید احمد جلال پوری کے مقالے تاریخی و تحقیقی و تصنیفی تالیفی اور اشاعتی کارنامے (در الحسن، خصوصی نمبر: ص، ۳۶۷ تا ۱۴۶۳) سے بھی استفادہ کیا ہے۔

۳۰۔ایضاً۔

۳۱۔تفصیل کے لئے دیکھئے شاہ صاحب کی زندگی اور آپ کے کارناموں پر سب سے وقیع اور سب سے عمدہ کام الحسن کے خصوصی شمارے نفیس نمبر کی صورت میں جامعہ اشرفیہ لاہور سے اگست، نومبر ۲۰۰۸ء/جنوری ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔

۳۲۔غلام نظام الدین، فنکار سے ملیے..... در پندرہ روز ''نیا پیام'' لاہور، بابت ۱۵/جون ۱۹۸۱ء: ص، ۲۴۔

۳۳۔وفات سے چند برس پیشتر..... محترم سید اظہار احمد گیلانی اور محترم رضوان نفیس..... اور دیگر دوستوں کی مہربانی کی بدولت آپ کے کلام کا مجموعہ ''برگ گل'' کے نام سے شائع ہوا۔اس کا یہ نام خود آپ کا انتخاب کردہ ہے..... ''برگ گل'' (پھول کی پتی) میں جو حسن و لطافت اور نفاست ہے وہ صرف آپ ہی کی ذات کا خاصا ہے۔

۳۴۔دیکھئے..... حکیم مشرق، شمارہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۱ء از لائل پور (موجودہ فیصل آباد)

۳۵۔فنکار سے ملیے: ص ۲۴۔

۳۶۔دیکھئے شان الفراق، تالیف سید نفیس الحسینی، مطبوعہ، سید احمد شہید، دہلی، نفیس منزل، کریم پارک راوی روڈ، لاہور، نمبر ۲۰۰۳ء، ص ۳۷۳، ۳۷۶۔ یہاں بھی انتہائی عاجزی اور خاکساری کا رنگ نظر آتا ہے۔اپنے پیر و مرشد کے فراق میں کہی گئی نظموں اور مضامین کے اس مجموعہ میں اپنے مرثیے سب سے آخر میں کیے ہیں۔

۳۷۔برگ گل..... مطبوعہ لاہو: نیز الحسن میں یہ نظم شاہ کی اپنی تحریر کی صورت میں دی گئی ہے۔

۳۸۔پروفیسر خالد بزمی: سید نفیس الحسینی، در سالنامہ محفل، لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۶۵۔

۳۹۔دیکھئے برگ گل..... مطبوعہ لاہور۔

۴۰۔دیکھئے برگ گل..... مطبوعہ لاہور۔

۴۱۔دیکھئے برگ گل..... مطبوعہ لاہور۔

۴۲۔دیکھئے برگ گل..... مطبوعہ لاہور۔

۴۳۔ذاتی ملاقات، دوران سفر، ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء۔

۴۴۔آہوان صحراء، ص ۹۴۔

۴۵۔بحوالہ ذاتی ملاقات۔

۴۶۔مضمون ''استاد نفیس رقم'' در پارس شمارہ ۳۹۵۵، دوشنبہ بیت ونہم دی، ۱۳۴۵ھ ش۔

۴۷۔نظام الدین پندرہ روزہ پیام، ص ۲۳۔

☆☆☆

کتب سیرت کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کے مقالات:

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت طیبہ

اور آپ کا کلام بلاغت نظام

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صدر رابطہ ادب اسلامی برصغیر

انسان کو اس کے خالق و مالک رب العالمین نے جو امتیازی خصوصیات عطا فرمائی ہیں، ان میں سب سے اہم علم کی صلاحیت اور ادراک کی خصوصیت ہے، پھر اپنے علم و ادراک سے حاصل ہونے والی باتوں کو ایک دوسرے کے سامنے لانے کے لیے زبان جیسا مؤثر ذریعہ عطا فرمایا، اور ان دونوں کے ذریعہ ہی انسان دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں گوناگوں ترقیات اور بہتر مدارج زندگی حاصل کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں دوسرے شخص کے احوال و اقوال پیش کرنے اور اس کی زندگی کی ترجمانی کرنے کا کام بھی انجام دیا جاتا ہے، جو تذکرہ نگاری و سیرت نگاری کے عنوان سے موسوم کیا جاتا ہے، اس میں تذکرہ نگار کی اپنی فنی صلاحیت اور زبان کی مہارت اپنا اثر بھی ڈالتی ہے، اور اس میں ہر تذکرہ نگار اپنی اپنی علیحدہ خصوصیات رکھتا ہے، اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور جس کے اقوال و احوال کی ترجمانی کر رہا ہے اس کے احوال و اقوال کا سایہ بھی اسلوب پر پڑتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور ان کی حیات طیبہ کی ترجمانی کو لیجئے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ایک طرف تو وہ انسان کامل کی خصوصیات رکھتے تھے کہ حالات سے اثر لینے اور محسوس ہونے والی بات کو محسوس کرنے اور پسند اور ناپسند کے فرق کو سمجھنے اور ان کا جو صحت مندانہ حق ہے، اس حق کا خیال کرنے میں اور اہل تعلق کے تعلق کا اور مغایرت رکھنے والے کی مغایرت کا جو خیر پسندانہ رویہ ہوسکتا ہے اس کو اختیار کرنے میں وہ اعلیٰ انسانی طرز عمل اختیار کرتے تھے۔

پھر اس پر مزید اعلیٰ خصوصیت یہ تھی کہ وحی الٰہی کے ذریعہ آپ کی رہنمائی ہوتی تھی، اور رب العالمین کی طرف سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو انسانوں کو اپنے پروردگار کی صحیح بندگی اور اس کی عطا کردہ ہدایت کی طرف بلانے کا کام سپرد ہوا تھا، جس کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مختلف طبیعتوں اور مختلف مزاجوں اور مختلف سطح کے افراد قوم سے بات کرنے اور توجہ دلانے کا کام انجام دینا ہوتا تھا، جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کی نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کام انجام دینا ہوتا تھا، جس کے لیے رب

العالمین نے آپ کی یہ رہنمائی فرمائی کہ ﴿ ادع إلى سبيل ربك بالحكمة و الموعظة الحسنة، و جادلهم بالتي هي أحسن ﴾ اپنے رب کے راستہ کی طرف موقع ومحل کا لحاظ رکھتے ہوئے اور نصیحت کے اچھے انداز سے دعوت دو، اور ان سے حجت کرو ایسے طریقہ سے جو سب سے اچھا ہو۔

حضور (ﷺ) کا لوگوں سے بات کرنے اور نصیحت کرنے اور اپنا احساس وتأثر ظاہر کرنے میں زبان واسلوب بیان کا جو انداز تھا وہ غیر معمولی تھا، اس میں زبان کی دلنوازاور مؤثر جو صورتیں ہوسکتی ہیں وہ صاف نظر آتی ہیں، اور ان کا جائزہ اگر ان کی فنی خصوصیت کو سامنے رکھ کر لیا جائے تو بہت ہی مؤثر نمونے سامنے آتے ہیں، اور ان کو ادب کے دائرہ میں بہت خصوصی جگہ دی جاسکتی ہے۔لیکن چونکہ وہ عظیم رہبر دین کے نمونے ہیں، اس لیے ان کو دین کے دائرہ میں ہی محدود کر کے ان کی زبان واسلوب کی خوبی کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، بلکہ مزید یہ کہ دین کا لیبل جس کلام پر بھی لگا ہوا نظر آئے تو اس کو بھی ادب کے دائرہ سے باہر کر دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ طریقہ غیر دیانتدارانہ طریقہ شمار کیے جانے کے لائق ہے، اور اس کو بدلنے اور ہر حقیقت کو اس کا جائز حق دینے کی ضرورت ہے، لہذا ہم کو دینی رجحان ودینی نقطۂ نظر کے دائرے میں آنے والے حال وقال کو اگر وہ ادبی خصوصیات رکھتا ہو تو ادب سے باہر نہ کرنا چاہئے۔ ہماری ادب اسلامی کی دعوت اسی ادب کو اس کے وسیع دائرہ کے لحاظ سے دیکھنے اور اس کے اس حق کو تسلیم کرنے کے لیے ہے، لہذا ہم ادب کی اسی وسعت کا لحاظ رکھتے ہوئے ادب کو دیکھنے اور اس کا جائزہ لینے کو اپناتے ہیں۔

ہم جب ادب کے ساتھ اسلامی کا لفظ وابستہ کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ محض دعوتی دائرہ میں یا محض وعظ ونصیحت کے اندر محدود ہے، وہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں صحت مندانہ انداز سے ترجمانی کرنے والا ادب ہے۔شاعری کے اصناف ہوں، یا نثر کی اقسام افسانہ ہو یا ناول، وہ سب ادب اسلامی کے دائرے کے اندر آسکتے ہیں۔اس کے نمونے مسلمان ادیبوں، شاعروں اور نثر نگاروں کی طویل تاریخ میں بہت ملتے ہیں، اور ان سے مسلمانوں کی زندگی پر اچھے اثرات پڑے ہیں، اور ان سے نوخیز ذہنوں اور مزاجوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔

اسلام میں ادب کی سرپرستی اور ہمت افزائی کی مثالیں قرن اول ہی سے خاصی ملتی ہیں، اولاً تو اس کی سرپرستی قرآن وحدیث سے ہوئی، قرآن مجید میں ایسے متنوع اسلوب اور حسن بیان کے ایسے معجزانہ نمونے ہیں جو بلاغت وادب کے ماہرین کے سامنے برابر ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔حضور (ﷺ) کے یہاں ان کے مقام کے مطابق اعلیٰ نمونے ملتے ہیں، ان میں ایک طرف مناجاتیں اور دعائیں ہیں، دوسری طرف قابل قدر اشخاص اور محبین کے ساتھ محبت وتعلق کے بلیغ جملے ہیں، اور اغیار سے گفتگو میں جو کلام آپ (ﷺ) نے فرمایا ہے، اس میں موقع ومحل کی نزاکت کا مؤثر لحاظ ہے۔

اور آپ (ﷺ) کی زبان مبارک سے متعدد موقعوں پر ایسے جملے نکلے ہیں جو عربی زبان وادب میں کہاوت اور مثل بن گیے، اور آج تک ضرب الامثال کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ پھر آپ (ﷺ) کی گفتگو اور خطاب کو دیکھئے تو وہاں ادبی حسن و تاثیر کی بڑی چھاپ ملتی ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔

اس کے علاوہ آپ (ﷺ) اپنے صحابۂ کرامؓ کے شعر کہنے کو نہ صرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، بلکہ مسلمان ہوجانے والے شاعروں کو اپنی شاعری دین کی حمایت میں استعمال کرنے کا حکم دیتے تھے۔آپ (ﷺ) نے خود شاعری نہیں کی، لیکن نثر میں بڑی بلاغت اور ادبیت ظاہر فرمائی۔آپ (ﷺ) نے انسانی سرشت بتاتے ہوئے ایک بار ایک واقعہ

قصہ کی شکل میں اور سہل انداز میں بیان کیا۔ اس قصہ میں ایک نابینا، ایک گنجے اور ایک کوڑھی کے طرز عمل کا تذکرہ فرمایا۔ اور اس طرح کی بیشمار مثالیں ہیں جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کے انسانی فطرت و احساسات اور نفسیاتی حال کی عکاسی آپ (ﷺ) کے کلام بلاغت نظام میں بکثرت ملتی ہیں۔

مسلمان خواہ ادیب ہو خواہ شاعر، ادب کی اسلامی قدروں کو جاننا اور اختیار کرنا اس کی ادبی کارگذاری کے لیے ممد و معاون ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں جن کو آپ (ﷺ) کی رہنمائی ملی تھی، شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ وہ ادب کی وسعتوں میں اسلامی اصول کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے ادب و شاعری کو چلاتے تھے، اور حضور (ﷺ) کی طرف سے ان کو اجازت بلکہ تائید حاصل رہتی۔

عربی شاعری کے مقابلہ میں عربی نثر کا دائرہ قرآن مجید کے نزول سے قبل عربوں میں بہت محدود تھا۔ قرآن مجید کے اثر سے اور حضور (ﷺ) کے کلام کے ذریعہ وسیع ہوا، اور اس میں حضور (ﷺ) کے غیر معمولی کلام بلاغت نظام کا اظہار ہوا۔ آپ (ﷺ) اپنے کلام کی بلندی و خوبی میں تمام عربوں پر فائق اور اعلیٰ مقام پر فائز تھے، اور اس کو غیر مسلم عربوں نے بھی تسلیم کیا ہے، آپ (ﷺ) نے شاعری کو اپنے کلام کا ذریعہ نہیں بنایا، لیکن نثری ادب میں آپ بہت فائق تھے۔ آپ کی تقریریں، گفتگوئیں، تذکرے، اظہار تاثر، دعائیں و مناجاتیں عربی کا بہترین ذخیرۂ ادب ہیں۔ آپ کے کلام کا اثر آپ کے اصحاب پر اور آپ کے بعد آنے والوں پر بہت اچھا پڑا، چنانچہ آپ کے زمانہ کے بعد کی نثر پر آپ (ﷺ) کے ادب کی نمایاں چھاپ ملتی ہے۔ آپ (ﷺ) کا کلام نثر تک محدود ہونے کے باوجود اقسام نثر کے لحاظ سے آپ (ﷺ) کے یہاں تنوع بھی ملتا ہے۔ مثلاً زن و شو کے تعلق کے سلسلہ میں ایک حکایتی گفتگو آپ (ﷺ) کے اور آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان ہوئی تھی، جو آپ نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی، اور وہ حدیث میں محفوظ ہے، اس میں اس خاص گوشۂ ادبی کی بھی نمائندگی ملتی ہے، یہ حدیث ام زرع کے نام سے موسوم ہے۔

آپ (ﷺ) کی گفتگو اور خطاب بعض بعض وقت اتنا مؤثر ہوتا تھا کہ سننے والے انتہائی درجہ میں متاثر ہو جاتے تھے، اس کی ایک مثال ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تقریر میں بھی ملتی ہے جو آپ (ﷺ) نے غزوۂ حنین کے بعد انصار کے سامنے فرمائی تھی، یہ وہ موقع تھا جب آپ (ﷺ) نے مال غنیمت کا بڑا حصہ قریش کے درمیان تقسیم فرما دیا تھا اور انصار کو اس سے محروم رکھا تھا، اس پر ان کے ایک شخص کو یہ خیال پیدا ہوا کہ رسول اللہ (ﷺ) نے اپنی قوم کی طرف داری کی ہے، اور اس کے ساتھ جانب داری برتی ہے، اور اس انصار کے قبیلہ کو جو قربانی و جاں نثاری اور فداکاری میں آپ کا شریک رہا ہے، نظر انداز فرمایا اور اس کا حق پورا ادا نہ کر سکے۔ جب رسول اللہ (ﷺ) کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے انصار کو جمع فرمایا۔ آپ (ﷺ) ان کی اس عارضی جذباتی کیفیت کے ساتھ ساتھ ان کی حقیقی ذہنیت کو بھی جانتے تھے، چنانچہ آپ (ﷺ) نے ان کی اسی نفسیاتی کیفیت اور ذہنی حالت کی رعایت کرتے ہوئے انہیں مخاطب فرمایا، اس خطاب میں اختصار کے ساتھ فصاحت الفاظ، بلاغت اسلوب اور دل موہ لینے والا اسلوب تھا۔

''اے گروہ انصار! تمہاری سرگوشیاں اور چہ می گوئیاں کیا ہیں، تمہارے دلوں میں کچھ احساس شکایت ہے، کیا تمہیں اس کا خیال نہیں آتا کہ جب میں نبی ہو کر تمہارے پاس پہونچا تو تم گم کردہ راہ تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ تمہیں صحیح راستہ پر لگایا، اور تم غریب تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے واسطہ سے تمہارے لیے دولت کے ذرائع پیدا کر دئے، تم آپس میں دشمن

تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے تمہارے دلوں میں محبت و اتحاد اور آپس کی الفت پیدا کردی۔

انصاری حضرات بولے، سچ ہے، احسان و کرم اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) ہی کا ہے، پھر آپ (ﷺ) نے فرمایا: اے گروہ انصار! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا، انہوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول (ﷺ)! ہم آپ کو کیا جواب دیں؟ سب احسان و کرم ہم پر اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) ہی کا ہے۔ تب آپ (ﷺ) نے فرمایا: دیکھو، اگر تم کہنا چاہو تو کہہ سکتے ہو، اور کہو گے تو سچ کہو گے اور میں تمہاری تصدیق بھی کروں گا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ آپ (ﷺ) ہمارے پاس اس وقت آئے جب لوگ آپ (ﷺ) کو جھٹلا رہے تھے، ہم نے آپ (ﷺ) کی تصدیق کی، لوگوں نے آپ (ﷺ) کا ساتھ چھوڑ رکھا تھا، ہم نے آپ (ﷺ) کی مدد کی، لوگوں نے آپ کو وطن سے نکال دیا، ہم نے آپ (ﷺ) کو پناہ دی، آپ کم مائیگی میں تھے، ہم نے اپنے مال سے آپ (ﷺ) کی کم مائیگی دور کی، یہ سب تم کہہ سکتے ہو، اے گروہ انصار! کیا تم کو مجھ سے شکایت دنیا کی ایک چیز اور معمولی چیز پر ہو رہی ہے، وہ معمولی چیز جس کے ذریعہ میں نے ایسے کچھ لوگوں کو جو دل سے میرے قریب نہیں آرہے تھے، اسلام نہیں لائے ہیں، قریب کرنا چاہا، اور تم کو تمہارے ایمان و اسلام پر چھوڑتے ہوئے اس میں حصہ نہیں دیا۔

اے گروہ انصار! کیا تم یہ نہیں پسند کرو گے کہ دوسرے لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر اپنے گھروں کو جائیں، اور تمہارا حاصل اللہ کا رسول (ﷺ) ہو جس کو لے کر اپنے گھروں کو لوٹو گے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، تم جو چیز لیکر لوٹو گے وہ اس چیز سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ لیکر اپنے گھروں کو جائیں گے، میرا تعلق تو تم سے ایسا ہے کہ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا (یعنی انصاری خاندان میں ہی مدینہ میں پیدا ہوتا) اگر انصار ایک راستہ اور گھاٹی میں چل رہے ہوں، اور دیگر لوگ دوسرے راستہ اور گھاٹی میں چل رہے ہوں تو میں انصار ہی کے ساتھ ان کی گھاٹی میں چلوں گا، اور انہیں کا ساتھ دوں گا، انصار کی مجھ سے قربت ایسی ہے جیسی لباسوں میں جسم سے وابستہ لباس کی ہوتی ہے، دوسروں کا نمبر اس کے بعد کا ہے، اے اللہ! انصار پر رحم فرما، ان کی اولاد پر رحم فرما، اور ان کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما۔ راوی کا کہنا ہے کہ یہ پر اثر باتیں سن کر لوگ اتنا روئے کہ ان کی ڈاڑھیاں اشکوں سے بھیگ گئیں، اور وہ چلا اٹھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے حصہ میں آئے، اس پر ہم پوری طرح راضی اور خوش ہیں۔" (زاد المعاد)

اس خطاب میں رسول اللہ (ﷺ) کا کلام تین جہتوں سے نفسیاتی کیفیت کی رعایت پر مشتمل تھا، اول یہ کہ آپ (ﷺ) نے ان کے اس جذبہ اور احساس تعلق کو ابھارا جو انصار کو رسول اللہ (ﷺ) کے ساتھ تھا، اور وہ سب تھا جس میں اتباع کامل، اسلام پر یقین، اور اس کو ہر چیز پر ترجیح، پھر قربانی و جاں نثاری کا وہ جذبہ جو تمام صحابۂ کرام میں غالب اور حاوی تھا، اور اسی جذبہ نے مسلمانوں کی جماعت کو کفار کے مقابلے میں طاقت و قوت اور جلادت و صلابت عطا کر رکھی تھی، اور جب آپ (ﷺ) نے دیکھا کہ ان کے اس جذبہ کو حرکت دینے اور بیدار کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور ان سے اس کا اقرار کرالیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے احسانات بے حد و بے شمار ہیں تو پھر آپ (ﷺ) نے دوسرے پہلو پر توجہ دی، یعنی ان کی طرف سے پذیرائی، خصوصی تعاون اور اخلاص کی قدر اور اس کا اقرار و اعتراف فرمایا، اور ان کے ایمانی تعلق کو مؤثر ڈھنگ سے سراہا، اس طرح ان کے دلوں میں جاگزیں رنج کو دور فرمایا، اس میں آپ (ﷺ) نے ان کے فطری بشری احساس کی پوری رعایت فرمائی، اور تسلیم فرمایا کہ انہوں نے

مشکل حالات میں آپ (ﷺ) کو خوش آمدید کہا، اور آپ (ﷺ) کا استقبال کیا، آپ (ﷺ) کا ساتھ دیا اور اس محبت وایمان کے راستہ میں ہر طرح کی قربانی پیش کی، پھر جب آپ (ﷺ) نے دیکھا کہ ان کے دل کھل گیے اور ان میں جو شکایتی اثر پیدا ہوا تھا، وہ زائل ہوگیا، اور وہ اپنی سابق صفائی قلب پر لوٹ آئے تو آپ (ﷺ) نے انہیں ان کے ایمان کی قدر و قیمت اور قربانی و جان نثاری میں ان کے مقام و مرتبہ سے آگاہ فرمایا، ان کے لیے دعاء فرمائی، ان کی تعریف کی، اپنے لیے ان کی محبت کی قدر شناسی فرمائی، اسے سراہا، ان پر شفقت کا اظہار فرمایا، اور اپنے کو پورے اخلاص کے ساتھ ان کے اندر شامل بتایا، اور خود کو انہیں میں کا ایک فرد گردانا، ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شدت تأثر سے رو پڑے، اور ان کے دلوں سے گرد و غبار چھٹ گیا، اس طرح آپ (ﷺ) کا کلام مخاطب کی نفسیاتی کیفیت کی رعایت کرنے کی ایک عمدہ و دلکش مثال ہے کہ گفتگو کے وقت اس کے حسب موقع طرز تخاطب استعمال کیا جائے، اور اس کے لیے اس کے مناسب کیفیات کے حامل الفاظ کا انتخاب کیا جائے۔

حضور (ﷺ) کے مذکورہ خطاب کا عربی سے اردو میں یہ ترجمہ ہے، اس ترجمہ سے اس خطاب کے مؤثر اسلوب کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، لیکن اصل تأثیر اصل خطاب ہی میں دیکھی جاسکتی ہے جو عربی میں ہے۔

حضور (ﷺ) کے یہاں خطابت کے علاوہ بات و چیت و دیگر اقسام کی بھی مؤثر و متنوع مثالیں ملتی ہیں،، جو آپ (ﷺ) کے حکایتی کلام میں، نصیحت میں، دعاء میں، بعض کیفیات و حالات میں اظہار تأثر میں اور دیگر قابل احساس مواقع کی صورت میں ملتی ہیں۔ یہ مثالیں حدیث شریف کی کتابوں میں چند در چند موجود ہیں، اور ان سے اس عہد کے لوگوں کو بڑا فائدہ حاصل ہوا، اور بہت سے لوگ آپ (ﷺ) کے کلام کے اثر سے آپ (ﷺ) کی طرف کھنچ کھنچ کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ آپ (ﷺ) کے کلام سے آپ (ﷺ) کے اصحاب نے فائدہ اٹھایا، اور تابعین مستفید ہوئے، پھر تبع تابعین اور ان کے بعد میں بھی آپ (ﷺ) کا فیض جاری رہا، خاص طور پر آپ (ﷺ) کی دعائیں اور مناجاتیں جن میں آپ نے اپنے رب کے حضور میں اپنے دل کو کھول کر الفاظ میں پیش کیا، خلفائے راشدین اور ان کے رفقاء، پھر ان کے بعد کی شخصیتیں پر اثر زبان اور مؤثر کلام میں ممتاز ہوئیں۔ ان شخصیتوں کے کلام کو ان ہی کی زبان میں دیکھا جائے تو اس کی اصل خوبی اور اصل ادبی اثر کا بہتر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

حضور (ﷺ) کا کلام بلیغ آپ کی احادیث شریفہ میں جگہ جگہ ملتا ہے، جو آپ کے حسن اداء اور خوبیوں کو ظاہر کرتا ہے، لیکن آپ کے کلام کا ترجمہ دوسری زبان میں اور آپ کی سیرت و احوال زندگی اور تعلیمات کی ترجمانی جو آپ کے صحابہ اور ان کے بعد کے حضرات نے عربی زبان ہی میں کی، اور وہ جو عربی سے دوسری زبانوں میں ترجمہ کے بعد سامنے آئی، اس کی ترجمانی کرنے والے نے اپنے اسلوب میں ادا کیا، اس طرح اس میں دو اہم پہلو جمع ہوگیے، ایک پہلو اصل صاحب سیرت کے واقعاتی و انفعالی احوال کا، اور دوسرا پہلو ترجمانی کرنے والے کے حسن ادا کا۔ یہ صورت کسی بھی شخصیت کے حالات اور اقوال کی ترجمانی کرنے والے کے اسلوب میں دیکھی جاسکتی ہے، اس طرح سیرت نگاری یعنی کسی اہم شخصیت کے اقوال و احوال پیش کرنا تاریخی انداز رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان کی فنی خصوصیت کی بنیاد پر ادب کا ہی ایک شعبہ قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس کے اسلوب کی خصوصیت اس کی ترجمانی میں اپنا الگ رنگ ظاہر کرسکتی ہے۔

حضور (ﷺ) کا جو مرتبہ و نبوی مقام ہے اس کی بنیاد پر ان کے احوال پیش کرنے میں سیرت نگاروں نے بڑی ذمہ داری اور احتیاط رکھی ہے، اور اس کا لحاظ عام طور پر آپ کے سب مسلمان سیرت نگاروں نے کیا ہے، ان کی اس احتیاط کے ساتھ ان کی پیشکشوں کے اسلوب میں ان کی اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق تنوع ملے گا، حضور (ﷺ) کے سیرت نگاروں کو آپ (ﷺ) سے جو عقیدت و محبت ہے وہ بھی سیرت نگار کے اسلوب میں جھلکتی ہے، ایک طرف تو سیرت کے احوال بیان کرنے میں انہوں نے کمال امانت و دیانتداری رکھی ہے۔ دوسرے آپ سے محبت و عقیدت کی جھلک بھی اس میں شامل ہوگئی ہے، اس طرح سیرت نگاروں کی کتابوں میں تنوع اور خوبی اور اس کے مطابق اثر انگیزی پیدا ہوگئی ہے، جو اپنا اپنا ڈھنگ رکھتی ہے۔

چودہ سو سال میں سیرت نبوی پر جو کتابیں تصنیف کی گئیں، ان کی تعداد بہت ہے، اور وہ عربی کے علاوہ بہت سی زبانوں میں ہیں، ان کا اپنا اپنا رنگ ڈھنگ ہے، جس میں تنوع ہے۔ اسی لیے سیرت نبوی کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والے سیرت کی ان کتابوں سے اپنے اپنے ذوق و محبت نبوی کے اعتبار سے مستفید ہوتے ہیں، اور اثر لیتے ہیں، اور اس طرح سیرت نبوی کی کتابیں ایک پُر اثر و خوش نما باغ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں، جس میں طرح طرح کے پھل پھول ہیں، اور باغ سے فائدہ اٹھانے والا متنوع قسم کے فائدے اٹھاتا ہے۔ اس طرح سیرت نبوی پر لکھی گئی صرف ایک تصنیف کے مطالعہ پر اکتفاء کرنا کافی نہیں ہوتا، مختلف سیرت نگاروں کی تصنیفات دیکھنے سے اس باغ و بہار سیرت کے مختلف گوشے اور مختلف پہلو اجاگر ہو کر سامنے آتے ہیں، اور اس طرح مختلف سیرت نگاروں کی کتابیں دیکھنا اپنا الگ اثر رکھتا ہے۔

☆☆☆

غزل

نشورؔ واحدی

حقیقت جس جگہ ہوتی ہے تابانی بتاتی ہے
کوئی پردہ میں ہوتا ہے تو چلمن جگمگاتی ہے
وہ آئے بھی نہیں اور زندگی کی رات جاتی ہے
سحر ہوتی ہے اور شمع تمنا جھلملاتی ہے
مری ناکامئ غم ذوقِ حیرانی بناتی ہے
یہ دنیا دور سے میری نظر میں جگمگاتی ہے
سکوت وصل کا لمحہ بھی کیا بیدار خوابی ہے
محبت جاگتی ہے اور جوانی سوئی جاتی ہے
ہوائے دامن نکہت رساں کا واسطہ تم کو
ذرا ٹھہرو چراغ زیست کی لو تھرتھراتی ہے
مسلسل گلشن ہستی میں کانٹے اس نے بوئے ہیں
یہ دنیا پھر انھیں کانٹوں سے کیوں دامن بچاتی ہے
یہی ہستی نشورؔ اک روز ہے انجام ہستی بھی
یہی دنیا کسی منزل میں عقبیٰ ہو کے آتی ہے

☆☆☆

مختلف زبانوں میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ

محمد واضح رشید حسنی ندوی
سکریٹری رابطہ ادب اسلامی، لکھنؤ

اورنگ آباد کے اس عظیم تاریخی شہر میں ملک عنبر کی تعمیر کردہ عظیم تاریخی جامع مسجد کے جوار میں قائم ''جامع کاشف العلوم'' کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے رابطہ ادب اسلامی کے اس سے قبل تین سیمنار منعقد کئے ہیں اور یہ اس کے تعاون سے ہونے والا چوتھا سیمنار ہے، جو اس کے ادب اسلامی سے تعلق اور اس کی فکر سے وابستگی کی جہاں دلیل ہے، وہیں اس کے مؤسس صدر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے اس کی محبت اور ان کی شخصیت، فکر، ادبی ذوق اور علمی اور دینی مسلک سے اتفاق اور اس سے وابستگی کی دلیل ہے، اہل شہر اور مدرسہ کے ذمہ دار خاص طور سے مولانا ریاض الدین صاحب فاروقی ندوی کا حضرت مولانا سے ہمیشہ قریبی تعلق رہا ہے، رابطہ کی تأسیس سے قبل حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کئی اسفار ہوئے اور اورنگ آباد سے مولانا کا ہمیشہ شاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق سے جنہیں علی طنطاوی نے ''خلیفہ سادس'' قرار دیا، بڑا انس اور وہاں کے باشندوں سے اپنائیت اور محبت رہی ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

اورنگ آباد کو یہ امتیاز حاصل ہے، کہ اس نے پہلا سیمنار جو نعتیہ شاعری کے موضوع پر تھا، عالمی پیمانہ پر کیا تھا، جس میں عالم عربی کی ندوۃ العلماء کے سیمنار کے بعد سب سے زیادہ نمائندگی ہوئی، خود حضرت مولانا نے اس سیمنار کا ذکر اپنی آپ بیتی ''کاروان زندگی'' میں اس طرح کیا ہے:

''۲۵-۲۶-۲۷ر صفر ۱۵۰۹ھ مطابق ۷-۹ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کی تاریخوں میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کی ہندوستان کی شاخ نے شہر اورنگ آباد میں واقع مدرسہ کاشف العلوم میں نعتیہ شاعری کے موضوع پر ایک عالمی علمی سیمنار کیا، موضوع کی اہمیت، دلوں پر اس کی تاثیر، اس سے لوگوں کی عقیدت و احترام، اخبارات و ذرائع ابلاغ کے بھرپور اہتمام، پرسکون فضا اور سکینت ووقار کے ماحول اور اچھی خاصی تعداد میں ہندو بیرون ہند سے ممتاز علماء، ادباء، شعرا اور داعیان اسلام کی شرکت کے اعتبار سے یہ سیمنار اپنی نوعیت کا منفرد و نادر سیمنار ثابت ہوا۔''

مسلمانوں کے دلوں میں اس موضوع کی قدر و قیمت کا اندازہ سیمنار میں شرکت کرنے والے مندوبین کی بھاری تعداد سے بھی لگایا جاسکتا ہے، اس سیمنار میں شرکت کرنے کے لئے ایک موقر وفد پروفیسر مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانی کی قیادت میں پاکستان سے آکر شریک ہوا، مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانی پشاور یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ عربی اور علامہ سید سلیمان ندوی کے خلیفہ و مجاز ہیں، جو اپنے مرض اور مجبوری اور چلنے پھرنے سے یکسر معذوری، معمولی نقل و حرکت کے لئے بھی اپنے رفقاء کی مدد کی محتاجی کے باوجود ایک طویل و بامشقت سفر کی صعوبتیں و زحمتیں برداشت کر کے تشریف لائے، یہ سب کچھ موصوف نے صرف موضوع کے اعزاز و اکرام، سیمنار کے احترام اور منتظمین کی محبت کے جذبات کی قدر افزائی میں کیا، اسی طرح ممتاز حجازی فاضل اور اسلامیات کے مشہور مقالہ نگار استاذ احمد محمد جمال اور عزیز گرامی استاذ محمد محمود حافظ ندوی مکہ مکرمہ سے رابطہ عالم اسلامی کے نمائندہ بن کر تشریف لائے، ڈاکٹر علی رضا عدنان نحوی اور پروفیسر محمد حسن بریغش نے ریاض سے زحمت فرمائی، اسی طرح ہندوستان کے دور دراز اور قرب و جوار کے شہروں اور دینی مدارس سے مختلف وفود نے شرکت کی، اس سیمنار کے لئے۔ جو مقالے تیار کئے گئے تھے ان کی تعداد پینتالیس (۴۵) سے بھی زائد تھی۔

یہ ایک بہت ہی عطر بیز و سحر انگیز موقعہ تھا، ہر جگہ اس کا چرچا رہا، جس نے بھی اس کو دیکھا یا اس کے بارے میں سنا اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوگیا، ایک مقامی اخبار کے نمائندہ نے تو یہاں تک لکھا کہ ''سیمنار کے دنوں میں پورے شہر پر سکینت و طمانینت کا ایک شامیانہ چھایا رہا۔'' (کاروان زندگی، ۱۹/۴-۲۳)

اس سیمنار کے بعد دوسرا سیمنار سفرناموں کے موضوع پر ہوا تھا اور وہ بھی بڑا کامیاب سیمنار تھا اور اس میں بھی اچھی نمائندگی ہوئی۔

تیسرا سیمنار خود حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شخصیت پر ہوا، جو حضرت مولانا کی رحلت کے فوراً بعد ہوا تھا۔

اس طرح اورنگ آباد کو دوسرے شہروں پر سبقت حاصل ہوئی، امید ہے کہ یہ چوتھا سیمنار جس کا تعلق پہلے سیمنار کی طرح ذات نبوی شریف سے ہے، اسی طرح کامیاب ہوگا جس طرح پہلا سیمنار ہوا تھا۔

درحقیقت سیرت نبوی ایسا موضوع ہے جس پر دوسرے موضوعات سے زیادہ کتابیں تصنیف کی گئیں، عہد اول سے اس عصر تک مختلف زبانوں میں لکھا گیا ہے اور لکھنے والوں نے اپنے ذوق اور ذات نبوی سے وابستگی کے اعتبار سے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اور اس میں اپنے تأثر کو بھی پیش کیا ہے، اس پر لکھنے والے، مؤرخ بھی ہیں اور محقق بھی، سیرت نگار بھی ہیں ادیب بھی، سیاسی ذہن رکھنے والے بھی ہیں اور مفکر بھی، موافق اور معتقد بھی ہیں اور مخالف اور معاند بھی، اس کی وجہ سے اس موضوع پر تصنیف کی جانے والی کتابوں میں اسلوب اور بیان اور تأثر کے اظہار میں جتنا تنوع ہے اتنا تنوع کسی دوسرے موضوع میں نہیں ہے۔

ولادت باسعادت سے پہلے دنیا کی جو حالت تھی، صرف اس کو لیجئے اور مختلف سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے، تو آپ کو مصنف کے ذوق اور ادبی صلاحیت اور عرض کی قوت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ولادت رسول کے اہم واقعہ کو سیرت نگاروں نے کس طرح بیان کیا ہے، اس سے سیرت نگار کی ادبی صلاحیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، علامہ شبلی نعمانی جیسا ادیب شاعر مؤرخ صاحب قلب اور حب نبوی سے سرشار سیرت نگار کی کشمکش کا

اندازہ اس مختصر مؤثر اور شاہکار تحریر سے کیا جاسکتا ہے، جو ظہور قدسی کے عنوان سے انہوں نے سپردِ قلم کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی بار انہوں نے اپنی تحریر کو بدلا ہوگا اور اس کو ناکافی سمجھا ہوگا اور آخر کار اس تحریر پر قناعت کی ہوگی، وہ تحریر فرماتے ہیں:

''چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں،
چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سرومان سے
سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئیں''

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کردئے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جان نواز کے لئے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضاوقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابروباد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید براہیم، جمال یوسف معجز طرازئ موسیٰ، جانوزائ مسیح سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں قدر شہنشاہ کونین ﷺ کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبح جانواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرح فال ہے، ارباب سیر اپنے محدود پیرائے بیان میں لکھتے ہیں: کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہوگیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں، بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے، آتش فارس نہیں، بلکہ جحیم شر، آتش کدہ کفر، آزرکدہ گمراہی سرد ہوکر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازہ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعائیں، ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا، یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہ حرم، حکمرانِ عرب، فرمانروائے عام، شہنشاہ کونین۔

شمسہ نہ مسند ہفت اختران
ختم رسل خاتم پیغمبراں
احمد مرسل کہ خرد خاک اوست
ہر دو جہان بستہ فتراک اوست
امی و گویا بہ زبان فصیح
ازالف آدم و میم مسیح
رسم ترنج است کہ در روزگار
پیش وہد میوہ پس آرد بہار

عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہو، اللّٰهم صل علیه و علی آله و اصحابه وسلم" (سیرۃ النبی: ۱/۱۱۱)

ولادت باسعادت ہی کو ماہر القادری صبح سعادت کے عنوان سے اس طرح بیان کرتے ہیں:

کچھ کفر نے فتنے پھیلائے، کچھ ظلم نے شعلے بھڑکائے
سینوں میں عداوت جاگ اٹھی، انساں سے انساں ٹکرائے
پامال کیا برباد کیا کمزور کو طاقت والوں نے
جب ظلم وستم حد سے گزرے تشریف محمد لے آئے
رحمت کی گھٹائیں لہرائیں، دنیا کی امیدیں بر آئیں
اکرام وعطا کی بارش کی، اخلاق کے موتی برسائے
تہذیب کی شمعیں روشن کیں، اونٹوں کے چرانے والوں نے
کانٹوں کو گلوں کی قسمت دی، ذروں کے مقدر چمکائے
کچھ کیف دیا، کچھ ہشیاری، کچھ سوز دیا کچھ ساز دیا
میخانۂ علم وعرفاں میں توحید کے ساغر چھلکائے

ہر چیز کو رعنائی دیکر دنیا کو حیات نوبخشی
صبحوں کے بھی چہروں کو دھویا راتوں کے بھی گیسو سلجھائے
اللہ سے رشتے کو جوڑا، طوفان میں سفینے تیرائے
تلوار بھی دی، قرآن بھی دیا، دنیا بھی عطا کی، عقبیٰ بھی
مرنے کو شہادت فرمایا، جینے کے طریقے سمجھائے

سیرت نبوی میں ایسے مواقع آئے ہیں جن کو بیان کرنا مشکل کام ہے، پہلی وحی کے موقع پر جو کیفت ہوئی اس کو حضورﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا، ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے تسلی دی اور ورقہ بن نوفل کے یہاں لے گئیں، اس واقعہ کو مختلف سیرت نگاروں نے مختلف انداز سے بیان کیا ہے، عربی میں اس طرح ہے:

"خاف علی نفسه ورجع إلیٰ بیته، ترتعد فرائصه، و قال: زملوني زملوني، لقد خشیت علی نفسي"

غار حراء کے واقعہ اور وحی کے نزول کی کیفیت کو علامہ شبلی نعمانی اس طرح بیان کرتے ہیں اور صحیح تصویر کشی سے اپنی عاجزی کا اعتراف کرتے ہیں:

''نبوت کا دیباچہ یہ تھا کہ خواب میں آپﷺ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے، جو کچھ آپ خواب دیکھتے تھے، بعینہ وہی پیش آتا تھا، ایک دن جب کہ آپﷺ حسب معمول غار حراء میں مراقبہ میں مصروف تھے، فرشتۂ غیب نظر آیا کہ آپ سے کہہ رہا ہے:

"إقرأ باسم ربك الذي خلق، خلق الإنسان من علق، إقرأ و ربك الأكرم الذي علم بالقلم، علم الإنسان مالم یعلم"،(علق:۱-۵)

پڑھ اس خدا کا نام جس نے کائنات کو پیدا کیا، جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ تیرا خدا کریم ہے، وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، وہ جس نے انسانوں کو وہ باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔

آپﷺ گھر واپس تشریف لائے تو جلال الٰہی سے لبریز تھے۔ آپ نے حضرت خدیجہ سے تمام واقعہ بیان کیا، وہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، جو عبری زبان جانتے تھے اور توریت انجیل کے ماہر تھے، انہوں نے آپ سے واقعہ کی کیفیت سنی، تو کہا: یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اترا تھا۔

روایت میں ہے کہ آنحضورﷺ کو ڈر پیدا ہوا، حضرت خدیجہ نے کہا آپ متردد نہ ہوں، خدا آپ کا ساتھ نہیں چھوڑے گا، پھر وہ آپ کو ورقہ کے پاس لے گئیں، انہوں نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی۔

آنحضورﷺ کی زبان سے بے شبہ یہ الفاظ نکلے:

''مجھ کو ڈر ہے''لیکن یہ تردد، یہ ہیبت، یہ اضطراب، جلال الٰہی کا تأثر (اور نبوت کے بار گراں کی عظمت کا تخیل تھا) آپ نے کیا دیکھا؟ ناموس اعظم نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں۔'' (سیرۃ النبی:۱/۱۲۸)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ غار حراء کو دیکھ کر اپنے تأثر کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''میں جبل نور پر چڑھا اور اس کے غار پر جو''غار حراء'' کے نام سے مشہور ہے، جا کھڑا ہوا، یہاں پہونچ کر میں نے اپنے دل میں کہا: یہی جگہ ہے جہاں خداوند کریم نے حضرت محمدؐ کو پیغمبری کا شرف عطاء فرمایا اور پہلی مرتبہ وحی نازل فرمائی، پس یہ کہنا حق ہے کہ یہیں سے وہ آفتاب طلوع ہوا، جس کی کرنوں نے دنیا پر نور برسایا اور اسے ایک نئی زندگی بخشی، یہ عالم ہر دن ایک نئی صبح کو

خوش آمدید کہتا ہے، لیکن اکثر و بیشتر اس صبح میں نیا پن ہوتا ہے نہ کوئی ندرت، اور نہ ہر صبح، صبح سعادت، ان صبحوں کی آمد سے انسان تو جاگ جاتے ہیں، مگر دلوں کی نیند میں ذرا فرق نہیں آتا اور روحوں کی بستی یونہی خواب غفلت میں پڑی رہتی ہے، کیا شمار ایسے تاریک دنوں کا اور ایسی جھوٹی صبحوں کا؟ البتہ اس غار سے حقیقی معنی میں صبح صادق نمودار ہوئی تھی، جس کے نور نے ہر چیز کو چمکایا اور اس کی آمد نے ہر شئے کو جگایا اور اسی صبح سے تاریخ کا رخ مڑا اور زمانہ کا رنگ بدلا۔''

(کاروان مدینہ، ص:۳۸)

دعوت اسلام پیش کرنے پر قریش کے معاندانہ رویہ پر سخت حالات پیش آئے خاص طور پر جب ابوطالب نے جو ہمیشہ تسلی دیتے رہتے تھے، مجبور ہو کر آپ سے کہا: ہم پر رحم کرو، میں اب ضعیف ہوں، جس کے بعد حضور ﷺ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور حضور ﷺ نے فرمایا:

''چچا! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دیں اور (اس کے بدلہ) یہ چاہیں کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں، تو بھی میں ایسا نہیں کر سکوں گا، مجھے تو یہ کام کرنا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو غالب کر دے یا میں اسی راستہ میں ہلاک ہو جاؤں''

سیرت نبوی اسراء اور معراج کا واقعہ ادبی حیثیت سے بہت اہمیت کا حامل ہے، عربی ادب کے ساتھ مغربی ادب پر بھی اس کا اثر پڑا، بعض محققین کی رائے میں ابوالعلاء المعری کا ادبی شاہکار ''رسالۃ الغفران'' اس کا مصداق ہے علامہ سید سلیمان ندوی واقعہ معراج کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بہر حال آپ جب پہلے آسمان پر چڑھے، تو آپ ﷺ کو ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آیا، جس کے دائیں بائیں بہت سی پرچھائیں تھیں، جب وہ دائیں جانب دیکھتا تو ہنستا تھا اور جب بائیں جانب نگاہ جاتی تھی، تو روتا تھا، آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر اس نے کہا: مرحبا اے نبی صالح، آنحضرت ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا، یہ آدم ہیں اور ان کے دائیں بائیں کی پرچھائیاں ان کی اولاد کی اولاد کی روحیں ہیں، دائیں جانب والے جنتی اور بائیں جانب والے دوزخی ہیں، اس لئے وہ دائیں جانب دیکھتے ہیں، تو ہنستے ہیں اور بائیں جانب نگاہ کرتے ہیں تو روتے ہیں'' (سیرۃ النبی:۲۲۹/۳)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی لکھتے ہیں:

''معراج میں آپ کو جو چیزیں دکھائی گئیں ان کا تذکرہ روایات میں آیا ہے، مثال کے طور پر جیسا کہ سنن ابوداؤد کی روایت ہے جس میں حضور ﷺ نے بتایا کہ جب میری معراج ہوئی میرا گذر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے تانبے کے ناخن تھے، جن سے وہ اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے، میں نے کہا اے جبرئیل یہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور لوگوں کی ناموس کا خیال نہیں کرتے تھے (یعنی غیبت کرتے اور بدنام کرتے تھے)''۔ (رہبر انسانیت، ص ۱۸۷)

ہجرت کے واقعہ اور غار ثور کے قیام کو عربی کے مشہور ادیب اور سیرت نگار عباس محمود العقاد نے سیرت کا اہم ترین واقعہ قرار دیا ہے، غار حراء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بعض سیرت نگاروں نے یہ بیان کیا ہے "قفز ع رسول اللّٰہ ﷺ و قال زملوني زملوني" اس پر حضرت خدیجہ

رضی اللہ عنہا نے تسلی دی، غارِ ثور میں خود قرآن کریم کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خوف محسوس ہوا تو حضور ﷺ نے تسلی دی۔ (إلا تنصروه فقد نصر الله إذ أخرجه الذين كفروا ثاني اثنين إذ هما في الغار إذ يقول لصاحبه لاتحزن إن الله معنا فأنزل الله سكينته عليه و أيده بجنود لم تروها وجعل كلمة الذين كفرو السفلى و كلمة الله هي العليا و الله عزيز حكيم) سورة التوبة: ٤٠۔

> مکہ کے اس فاتحانہ داخلہ میں جو جزیرۃ العرب کا قلب وجگر اور روحانی و سیاسی مرکز تھا، عدل و مساوات، تواضع اور اظہار عبدیت کا کوئی انداز ایسا نہ تھا جس کو آپ ﷺ نے اختیار نہ فرمایا ہو، اسامہ کو جو آپ ﷺ کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) حضرت زید کے صاحبزدے تھے، آپ ﷺ نے اپنی سواری کے پیچھے جگہ دی، بنی ہاشم اور اشراف قریش میں سے جن کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی یہ شرف کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ فتح مکہ کے روز ایک شخص نے آپ ﷺ سے گفتگو کی تو اس پر کپکپی طاری ہوگئی، آپ ﷺ نے فرمایا ڈرو نہیں، اطمینان رکھو، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں تو قریش کی ایک ایسی عورت کا لڑکا ہوں جو گوشت کے سوکھے ٹکڑوں کو کھایا کرتی تھی۔

اُم معبد نے حضور ﷺ کا جو وصف بیان کیا ہے وہ ادبی حیثیت سے شاہکار ہے اور اعلیٰ ترین ادب، اسکو دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان کام نہیں ہے، فن کار صاحب اسلوب ادیب ہی دوسری زبان میں اس کو منتقل کرسکتا ہے، اُم معبد کے واقعہ کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اس طرح بیان کیا ہے:

''غار سے نکل کر پہلے ہی دن اس مبارک قافلہ کا گزر اُم معبد کے خیمہ پر ہوا، یہ عورت قوم خزاعہ سے تھیں، مسافروں کی خبر گیری اور ان کی تواضع کے لئے مشہور تھیں، سرراہ پانی پلایا کرتی تھیں اور مسافر وہاں ٹھہرا کر ستایا کرتے تھے، یہاں پہونچ کر بڑھیا سے پوچھا کہ اس کے پاس کھانے کی کوئی چیز ہے؟ وہ بولیں: نہیں، اگر کوئی شئے موجود ہوتی تو دریافت کرنے سے پہلے میں خود حاضر کردیتی، نبی ﷺ نے خیمہ کے گوشہ میں ایک بکری دیکھی، پوچھا: یہ بکری کیوں کھڑی ہے؟ ام معبد نے کہا کہ کمزور ہے، ریوڑ کے ساتھ نہیں چل سکتی، نبی ﷺ نے فرمایا: اجازت ہے کہ ہم اسے دوہ لیں؟ ام معبد نے کہا کہ اگر دودھ معلوم ہوتا ہے، تو دوہ لیجئے، نبی ﷺ نے بسم اللہ کہہ کر بکری کے تھنوں کو ہاتھ لگایا، برتن مانگا، وہ ایسا بھر گیا کہ دودھ اچھل کر زمین پر گر گیا، یہ دودھ آنحضرت ﷺ اور ہمراہیوں نے پی لیا، دوسری دفعہ پھر بکی کو دوہا گیا، برتن پھر بھر گیا، یہ بھی ہمراہیوں نے پیا، تیسری مرتبہ برتن پھر بھر گیا اور اُم معبد کے لئے چھوڑ دیا گیا اور آگے کو روانہ ہو گئے۔

کچھ دیر بعد ام معبد کے شوہر آئے، خیمہ میں دودھ کا برتن بھرا دیکھ کر حیران ہو گئے کہ یہ کہاں سے آیا، ام معبد نے کہا کہ ایک بابرکت شخص یہاں آئے تھے، اور یہ دودھ ان کے قدوم کا نتیجہ ہے، وہ بولے کہ یہ تو وہی صاحب قریش معلوم ہوتے ہیں جن کی مجھے تلاش تھی، اچھا ذرا ان کی توصیف کرو، ام معبد بولیں:

''میں نے ایک شخص کو دیکھا، جس کی نظافت نمایاں، جس کا چہرہ تاباں اور جس کی ساخت میں تناسب تھا، پاکیزہ رو اور پسندیدہ خو، نہ فربہی کا عیب، نہ لاغری کا نقص، نہ پیٹ نکلا

ہوا، نہ سر کے بال گرے ہوئے، چہرہ وجیہ، جسم تنومند اور قد موزوں تھا، آنکھیں سرگیں تھیں، فراخ اور سیاہ تھیں، پتلیاں کالی تھیں، ڈھیلے بہت سفید تھے، پلکیں گھنی اور لمبی تھیں، پروقار خاموش دلبستگی لئے ہوئے، کلام شیریں اور واضح، نہ کم سخن، نہ بسیارگو، گفتگو اس انداز کی جیسے پروئے موتی، دونرم و نازک شاخوں کے درمیان ایک شاخ تازہ جو دیکھنے میں خوش منظر، رفیق ان کے گردوپیش رہتے ہیں، جو کچھ وہ فرماتے ہیں، وہ سنتے ہیں، جب حکم دیتے ہیں، تو تعمیل کے لئے جھپٹتے ہیں، مخدوم و مطاع، نہ کوتاہ سخن نہ فضول گو۔''

یہ صفت سن کر وہ بولا: کہ یہ تو ضرور صاحب قریش ہیں اور میں ان سے ضرور جاملوں گا'' (سیرت رسول اکرم، ص:۱۰۱-۱۰۲)

مدینہ منورہ میں استقبال، پھر غزوات میں جو آزمائشیں پیش آئیں، خاص طور پر بدر کے موقع پر اور احد وحنین کے موقع پر جو آزمائشیں پیش آئیں جن کو قرآن کریم نے بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے، اس خوف کی حالت کو قرآن کریم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: (إذ جاء و كم من فوقكم و من أسفل منكم، وإزاغت الأبصار، و بلغت القلوب الحناجر و تظنون بالله الظنونا، هنالك ابتلي المؤمنون وزلزلوا زلزالاً شديداً) [سورة الأحزاب: ۱۱)، (اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل مارے دہشت کے گلوں تک پہنچ گئے اور تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے، وہاں مؤمن آزمائے گئے اور سخت طور پر ہلائے گئے) ان کو سیرت نگاروں نے کس طرح بیان کیا ہے۔

علامہ شبلی غزوہ حنین کی منظرکشی کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''کفار نے معرکہ گاہ میں پہلے پہونچ کر مناسب مقامات پر قبضہ کرلیا تھا اور تیراندازوں کے دستے پہاڑ کی گھاٹیوں، کھوؤں اور دروں میں جابجا جمادئے تھے، فوج اسلام نے صبح کے وقت جب خوب اجالا بھی نہیں ہوا تھا حملہ کیا، میدان جنگ اس قدر نشیب میں تھا، کہ پاؤں جم نہیں سکتے تھے، حملہ آوروں کا بڑھنا تھا کہ سامنے سے ہزاروں فوجیں ٹوٹ پڑیں، ادھر کمین گاہوں سے قدر اندازوں کے دستے نکل آئے اور تیروں کا مینھ برسادیا، مقدمۃ الجیش ابتری کے ساتھ بے قابو ہوکر پیچھے ہٹا اور پھر تمام فون کے پاؤں اکھڑ گئے، صحیح بخاری میں ہے: ''فأدبرو عنه حتى بقي وحده'' یعنی سب لوگ ٹل گئے اور آنحضرت ﷺ اکیلے رہ گئے۔

تیروں کا مینھ برس رہا تھا، بارہ ہزار فوجیں ہوا ہوگئیں تھیں، لیکن ایک پیکر مقدس پابرجا تھا، جو تنہا ایک فوج، ایک ملک، ایک اقلیم، ایک عالم، بلکہ مجموعۂ کائنات تھا صلی اللہ علیہ وسلم۔

آنحضرت ﷺ نے داہنی جانب دیکھا اور پکارا: یامعشر الأنصار! آواز کے ساتھ صدا آئی ہم حاضر ہیں، پھر آپ نے بائیں جانب مڑکر پکارا، اب وہی آواز آئی، آپ ﷺ سواری سے اتر پڑے اور جلال نبوت کے لہجہ میں فرمایا: خدا کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہوں، بخاری کی دوسری روایت میں ہے ''أنا النبي لاكذب، أنا ابن عبد المطلب'' میں پیغمبر ہوں یہ جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نہایت بلند آواز تھے، آپ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو، انہوں نے نعرہ مارا:

يامعشر الأنصار! اے گروہ انصار! يا أصحاب الشجرة! اے اصحاب شجرہ (بیعت رضوان والے)

اس پر اثر آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج دفعتاً پلٹ پڑی، جن لوگوں کے گھوڑے کشمکش اور گھمسان کی وجہ سے مڑ نہ سکے انہوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود پڑے، دفعتاً لڑائی کا رنگ بدل گیا، کفار بھاگ نکلے اور جو رہ گئے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں، بنو مالک (ثقیف کی ایک

شاخ تھی) جم کر لڑے، لیکن ان کے ستر آدمی مارے گئے اور جب ان کا علم بردار عثمان بن عبداللہ مارا گیا تو وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے، شکست خوردہ فوج ٹوٹ پھوٹ کر کچھ اوطاس میں جمع ہوئی اور کچھ طائف میں جا کر پناہ گزیں ہوئی جس کے ساتھ سپاہ سالار لشکر (مالک بن عوف) بھی تھا۔ (سیرۃ النبی، جلد:۱/۳۰۳)

طائف کا واقعہ، حدیبیہ کا واقعہ، فتح مکہ اور مکہ مکرمہ میں داخلہ کے وقت جو کیفیت تھی جس میں منظر کشی اور نفسیاتی تجزیہ کی عظیم صلاحیت کی ضرورت ہے، سیرت کی مختلف کتابوں میں مختلف انداز سے سیرت نگار کی ادبی صلاحیت کے اعتبار سے پیش کی گئی ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی فتح مکہ کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے معافی اور امن وحفاظت کا دائرہ اس روز وسیع فرمادیا کہ اہل مکہ میں سے صرف وہی شخص ہلاک ہوسکتا تھا جو خود ہی معافی اور سلامتی کا خواہشمند نہ ہو اور اپنی زندگی سے بیزار ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کو پناہ ملے گی، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے گا وہ محفوظ ہے، جو مسجد حرام میں داخل ہوگا اس کو امن ہے، رسول ﷺ نے اہل لشکر کو ہدایت فرمائی کہ مکہ میں داخل ہوتے وقت صرف اس شخص پر ہاتھ اٹھائیں جو ان کی راہ میں حائل ہو اور ان کی مزاحمت کرے، آپ ﷺ نے اس کا بھی حکم فرمایا کہ اہل مکہ کی جائداد کے بارے میں مکمل احتیاط برتی جائے اس میں مطلق دست درازی نہ کی جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباسؓ کو ہدایت کی کہ ابوسفیان کو ایسی جگہ لے جائیں جہاں سے اسلامی دوستوں کی پیش قدمی کا نظارہ ہوسکے، یہ فاتحانہ دستے سمندر کی موجوں کی طرح متلاطم نظر آتے تھے، مختلف قبائل اپنے اپنے جھنڈوں کے ساتھ گزر رہے تھے، جب کوئی قبیلہ گزرتا تو ابوسفیان عباسؓ سے اس کا نام دریافت کرتے اور کہتے مجھے اس قبیلہ سے کیا سروکار۔

یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس ایک مسلح دستے میں تشریف لائے جو سبز معلوم ہو رہا تھا، یہ مہاجرین اور انصار کا آہن پوش دستہ تھا کہ ان کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں، ابوسفیان نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ خدا کی شان! عباس یہ کون لوگ ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو مہاجرین اور انصار کے جلو میں تشریف لے جا رہے ہیں، انھوں نے کہا ان میں سے کسی کو اس سے پہلے یہ طاقت اور شان و شوکت حاصل نہیں تھی، خدا کی قسم اے ابوالفضل! تمہارے بھتیجے کا اقتدار آج کی صبح کتنا عظیم ہے، انھوں نے کہا: ابوسفیان یہ نبوت کا معجزہ ہے۔

اس کے بعد ابوسفیان نے بلند آواز سے یہ اعلان کیا کہ اے قریش کے لوگو! یہ محمد (ﷺ) اتنی طاقت کے ساتھ تمہارے پاس آئے ہیں جس کا تم کو کبھی تجربہ نہ ہوا ہوگا، اب جو ابوسفیان کے گھر میں آجائے گا اس کو امان دی جائے گی، لوگ یہ سن کر کہنے لگے، اللہ تم سے سمجھے تمہارے گھر کی حقیقت ہی کیا ہے کہ ہم سب کو اس گھر میں پناہ مل سکے؟ پھر انھوں نے کہا جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے گا اس کو امان ملے گی، جو مسجد (حرام) میں چلا جائے گا اس کو امان ملے گی، چنانچہ لوگ منتشر ہو گئے اور اپنے اپنے گھروں اور مسجد حرام میں پناہ گیر ہو گئے۔

رسول اللہ ﷺ مکہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ سر مبارک عبدیت و تواضع کے غلبہ سے بالکل جھک گیا تھا، قریب تھا کہ آپ ﷺ کی تھوڑی اونٹ کے کجاوے سے لگ جائے، آپ ﷺ داخل ہوتے وقت سورۂ فتح پڑھ رہے تھے۔

مکہ کے اس فاتحانہ داخلہ میں جو جزیرۃ العرب کا قلب و جگر اور روحانی وسیاسی مرکز تھا، عدل ومساوات، تواضع اور اظہار

عبدیت کا کوئی انداز ایسا نہ تھا جس کو آپ ﷺ نے اختیار نہ فرمایا ہو، اسامہ کو جو آپ ﷺ کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) حضرت زید کے صاحبزدے تھے، آپ ﷺ نے اپنی سواری کے پیچھے جگہ دی، بنی ہاشم اور اشراف قریش میں سے جن کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی یہ شرف کسی کو حاصل نہیں ہوا۔

فتح مکہ کے روز ایک شخص نے آپ ﷺ سے گفتگو کی تو اس پر کپکپی طاری ہوگئی، آپ ﷺ نے فرمایا ڈرو نہیں، اطمینان رکھو، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں تو قریش کی ایک ایسی عورت کا لڑکا ہوں جو گوشت کے سوکھے ٹکڑوں کو کھایا کرتی تھی۔

جب حضرت سعد بن عبادہؓ جو انصار دستہ کے امیر تھے، ابوسفیان کے پاس سے گزرے، انھوں نے کہا "الیوم یوم الملحمة، الیوم تستحل الکعبة، الیوم أذل الله قریشا" (آج گھمسان کا دن ہے اور خونریزی کا دن ہے، آج کعبہ میں سب جائز ہوگا، اللہ تعالیٰ نے قریش کو ذلیل کیا ہے) جب رسول اللہ ﷺ اپنے دستے میں ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو انھوں نے آپ ﷺ سے اس کی شکایت کی اور کہا کہ یارسول اللہ آپ نے سنا سعد نے ابھی کیا کہا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا کہا ہے؟ انھوں نے وہ سب دہرادیا، سعد کے جملے کو آپ ﷺ نے ناپسند فرمایا اور فرمایا: "الیوم یوم المرحمة، الیوم یعز الله قریشاً، ویعظم الله الکعبة" (نہیں! آج رحم و معافی کا دن ہے، آج اللہ تعالیٰ قریش کو عزت عطا فرمائے گا اور کعبہ کی عظمت بڑھائے گا۔)

آپ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلوا بھیجا اور اسلامی پرچم ان سے لیکر ان کے صاحبزادے قیسؓ کے حوالہ کیا، آپ ﷺ نے یہ خیال فرمایا کہ ان کے صاحبزادے کو پرچم دینے کے معنی یہ ہوں گے گویا پرچم ان سے واپس نہیں لیا گیا ہے۔

اس طرح ایک حرف کی تبدیلی (الملحمۃ کے بجائے المرحمۃ فرمادینے) اور ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے تبدیل کردینے سے (ان میں سے ایک باپ کا ہاتھ تھا دوسرا بیٹے کا) آپ ﷺ نے سعد بن عبادہؓ (جن کے ایمانی اور مجاہدانہ کارنامے اظہر من الشمس تھے) کی ادنیٰ دل شکنی کے بغیر ابوسفیان کی (جن کی تالیف قلب کی ضرورت تھی) دل جوئی کا سامان ایسے حکیمانہ بلکہ معجزانہ طریقہ پر انجام دے دیا جس سے بہتر طریقے پر تصور میں آنا مشکل ہے، باپ کے بجائے ان کے بیٹے کو یہ منصب عطاء کردیا جس سے ابوسفیان کے زخم خوردہ دل کی تسکین منظور تھی، دوسری طرف آپ ﷺ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو آزردہ خاطر نہیں دیکھنا چاہتے تھے، جنھوں نے اسلام کے لئے بڑی خدمات انجام دی تھیں۔" (سیرت رسول اکرم: ۲۴۸-۲۵۲)

اسی طرح حضور ﷺ کی وفات اور صحابہ کرامؓ پر اس کا اثر، اس کو بھی سیرت نگاروں نے مختلف انداز میں بیان کیا ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر صحابۂ کرامؓ پر بجلی بن کر گری، اس کی وجہ ان کا وہ عاشقانہ تعلق تھا، جس کی نظیر نہیں، وہ آپؐ کے سایۂ شفقت میں اس طرح رہنے کے عادی ہوگئے تھے، جس طرح بچے ماں باپ کے آغوش میں رہتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ، اس لحاظ سے ان پر جتنا بھی اثر پڑتا کم تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لقد جاءکم رسول من أنفسکم عزیز علیه ماعنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤوف رحیم)
(سورۃ التوبۃ-۱۲۸)

(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے، اور تمہاری بھلائی

کے بہت خواہشمند ہیں (اور) مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے (اور) مہربان ہیں۔

ان میں سے ہر شخص سمجھتا تھا کہ وہ آپؐ کی نگاہ لطف وکرم میں سب سے زیادہ محبوب اور مورد الطاف وکرم ہے، بعض صحابہ کو اس پر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ واقعہ پیش آیا، ان میں پیش پیش حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، انھوں نے ایسے شخص پر جو یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی بہت نکیر کی، وہ مسجد نبوی میں آئے اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور کہا کہ ''رسول اللہ ﷺ کی وفات اس وقت تک نہ ہوگی جب تک اللہ تعالی منافقوں کو ختم نہ کردے گا۔

ان حالات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی نیابت وخلافت اور عزیمت وحکمت کے موقف کے لئے تیار کیا تھا) جیسے عالی حوصلہ اور عزم وہمت کے پہاڑ کی ضرورت تھی، جو اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرے، ابوبکر صدیقؓ کو جو مقام سخ (مضافات مدینہ میں تھے) اطلاع ہوئی تو اسی وقت تشریف لائے، (بخاری، ص ۶۴۰) اور مسجد نبوی کے دروازے پر ایک لمحہ کے لئے رکے، اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے خطاب کررہے تھے، پھر وہ کسی طرف ملتفت ہوئے بغیر سیدھے حضرت عائشہؓ کے گھر رسول اللہ ﷺ کے قریب پہونچے، آپ پر ایک چادر پڑی ہوئی تھی، انھوں نے ذرا سی چادر سرکائی اور جھک کر روئے مبارک کا بوسہ لیا اور کہا، میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! موت کا مزہ جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لئے مقدر کردیا تھا، آپؐ نے چکھ لیا، اب آپؐ کو کبھی بھی موت کی تکلیف نہ ہوگی، اس کے بعد انھوں نے چادر سے آپ کے روئے مبارک کو اسی طرح چھپادیا، اس کے بعد مسجد نبوی آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سلسلۂ کلام اس وقت تک جاری تھا، انہوں نے کہا: عمر! ذرا ٹھہرو، لیکن جوش کلام میں انہوں نے ان کی بات نہیں سنی، جب حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا کہ وہ خاموش نہیں ہورہے ہیں تو مجمع کی طرف متوجہ ہوکر انہوں نے اپنی بات شروع کی، لوگوں نے ان کو خطاب کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے حضرت عمرؓ کی طرف سے رخ پھیر کر ان کی بات سننی شروع کردی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد کہا:

''لوگو! اگر کوئی محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو اس کو معلوم ہو جائے کہ بلاشبہ ان کی وفات ہوگئی اور اگر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو اطمینان رکھے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے، اس کے لئے موت نہیں، پھر انہوں نے یہ آیت تلاوت کی:

"ومامحمد إلا رسول الله، قد خلت من قبله الرسل، أفإين مات أو قتل انقلبتم على آعقابكم، و من ينقلب على عقبيه فلن يضر الله شيئاً، وسيجزي الله الشاكرين"

(سورہ آل عمران:۱٤٤)

اور محمد ﷺ تو صرف خدا کے پیغمبر ہیں، ان سے پہلے بہت سے پیغمبر گزرے ہیں، بھلا ان کی وفات ہو جائے یا شہید کردئے جائیں، تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ (یعنی مرتد ہوجاؤ) اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا تو خدا کا کچھ نقصان نہیں کرسکے گا اور خدا شکر گزاروں کو بڑا ثواب دے گا۔

جو لوگ اس موقع پر حاضر تھے اور یہ منظر دیکھ رہے تھے، ان کا بیان ہے کہ ''خدا کی قسم جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ آیت تلاوت کی تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے اور حضرت ابوبکرؓ نے ان کے منہ کی بات کہدی'' حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ''میں نے جب ابوبکرؓ کو آیت تلاوت کرتے سنا

تو حیرت زدہ ہوکر بے ساختہ زمین پر گر گیا، میرے پیروں کی طاقت ختم ہو چکی تھی، اس وقت گویا مجھے یہ علم ہوا کہ حضور ﷺ کا انتقال ہو گیا ہے۔'' (نبی رحمت، ص: ۵۵۵)

ادب میں مخاطب کی فہم کی صلاحیت اور اس کی نفسیات کی رعایت کو بہت اہمیت دی جاتی ہے، کلام جو متکلم، مخاطب اور ماحول کے مطابق ہو وہ بلیغ کلام سمجھا جاتا ہے، حضور ﷺ کی سیرت میں بکثرت ایسی مثالیں ملتی ہیں، جن میں آپ نے اپنے شدید دشمن، قتل کی آرزو رکھنے والے سے مختصر گفتگو میں اس کے ذہن کو بدل دیا، وہ اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو گیا یا دشمنی ترک کر دی، ابوالولید عتبہ بن ربیعہ کا واقعہ اور انصار سے آپ ﷺ کا معجزانہ اور مؤثر خطاب اس کی بہترین مثال ہے۔ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی عتبہ کے واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''حضور ﷺ بدستور دعوت اسلام میں مصروف رہے اور قریش کی طرف سے ایذا رسانیاں اور رکاوٹیں صبر و برداشت کے ساتھ جھیلتے رہے، قریش حضور ﷺ کو قبیلۂ قریش کی شاخ عبد مناف جو آپ کی خاندانی شاخ تھی، کے دباؤ اور اس کے سردار ابوطالب کی حمایت کی وجہ سے قتل کر دینے کا ارادہ تو نہ کر سکے تھے، لیکن طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، راہ میں کانٹے بچھاتے تھے، دوران نماز جسم مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے، بدزبانیاں کرتے تھے، قریش متحیر تھے کہ آپ ﷺ یہ سب سختیاں کیوں جھیلتے ہیں؟ انسانی دماغ ایسی سخت نفس کشی اور جانبازی کا مقصد جاہ و دولت اور نام و نمود کی خواہش کے سوا اور کیا خیال کر سکتا ہے، لہٰذا قریش نے بھی یہ خیال کیا، اس بنا پر قریش کے ایک بڑے شخص ابوالولید عتبہ بن ربیعہ کو قریشی سرداروں نے حضور ﷺ کے پاس بھیجا اور وہ آیا اور کہا کہ تم سے ضروری بات کرنا ہے، تم نے کچھ دنوں سے یہ جو جھگڑے کا کام شروع کر دیا ہے جس سے خاندان میں کشمکش اور مصیبت کھڑی ہو گئی ہے:

یہ تم کیوں کر رہے ہو، تمہارا اس کے پیچھے کیا مقصد ہے؟ تم کیا چاہتے ہو؟ اگر کوئی ایسا مقصد ہے جس کو پورا کرنے میں ہم لوگ کچھ کر سکیں تو ہم کر دیں اور تم اپنی یہ دعوت چھوڑ دو، مکہ کی ریاست چاہتے ہو تو وہ بتاؤ، کسی بڑے گھرانے میں شادی چاہتے ہو تو وہ بتاؤ، دولت کا ذخیرہ چاہتے ہو تو وہ بتاؤ ہم کچھ کر سکتے ہیں تو کریں گے، ہم اس پر راضی ہیں کہ کل مکہ کا تم کو بادشاہ مان لیں، اگر آسیب اور جن وغیرہ کے اثر سے یہ بات ہے تو ہم اس کو دور کرانے کا کوئی ذریعہ فراہم کریں گے اور اس پر پوری فیاضی سے اپنا مال خرچ کریں گے، یہاں تک تم کو اس سے شفائے کامل حاصل ہو جائے، لیکن ان باتوں سے باز آؤ، عتبہ کو اس درخواست کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔

جب عتبہ سب کچھ کہہ چکا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا جو کچھ کہنا تھا آپ کہہ چکے؟ اس نے کہا: ہاں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: اب میری بات سنیئے!

اس کے بعد آپ ﷺ نے سورۂ فُصِّلَتْ کی کچھ آیتیں سجدہ تک ان کے سامنے تلاوت کیں:

"بسم الله الرحمن الرحيم، حٰمٓ، تنزيل من الرحمن الرحيم، كتاب فصلت آياته قرآنا عربيا لقوم يعلمون، بشيرا و نذيرا، فأعرض أكثر هم فهم لا يسمعون، و قالوا قلوبنا في أكنة مما تدعونا إليه وفي آذاننا وقر و من بيننا حجاب فاعمل إننا عاملون" (حٰمٓ السجدة: ۷)،

(شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، حٰمٓ، یہ کلام اتارا ہوا ہے بڑے مہربان بہت رحم والے کی طرف سے، ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں واضح رکھی گئیں

ہیں، یہ قرآن عربی زبان میں ان لوگوں کے لئے جو (تحقیق کا) علم رکھتے ہیں، خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا ہے پھر بھی ان میں سے اکثر لوگوں نے اس سے اپنا منھ پھیر لیا، اور وہ سنتے ہی نہیں، اور (مزید یہ کہ) انہوں نے کہا کہ تو جس کی طرف ہمیں بلا رہا ہے ہمارے دل تو اس سے پردے میں ہیں اور ہمارے کانوں (تک پہونچنے) میں (کانوں کی) گرانی (حائل) ہے اور ہم میں اور تم میں ایک حجاب (حائل) ہے (پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا کہ) اچھا تو اب اپنا کام کئے جاؤ ہم بھی یقیناً اپنا کام کرنے والے ہیں)

عتبہ کے کان میں جب یہ کلام پڑا تو اس نے خاموشی کے ساتھ اس کو سننا شروع کیا، اس نے دونوں ہاتھ پشت کی طرف ٹیک لئے تھے اور کان کلام ربانی کے سننے میں محو تھے، جب رسول اللہ ﷺ آیت سجدہ تک پہونچے تو آپ نے سجدہ فرمایا، اور ارشاد ہوا: ابوالولید! تمہیں جو کچھ سننا تھا سن لیا، اب جیسا تم سمجھو۔

کلام پاک سننے سے عتبہ پر محویت کا ایک عالم طاری ہو گیا وہ ہاتھوں پر سہارا دئے گردن پشت پر ڈالے ہوئے سنتا رہا، اور بالآخر چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا، عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، سرداران قریش نے پوچھا کیا دیکھا؟ کیا کہا؟ کیا سنا؟ عتبہ بولا: اے قریش کے لوگو! میں ایسا کلام سن کر آیا ہوں جو نہ کہانت ہے، نہ شعر ہے، نہ جادو ہے، نہ منتر ہے، تم میرا کہا مانو، میری رائے پر چلو، محمد کو اپنے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آجائیں گے تو یہ تمہاری ہی عزت ہے، ورنہ عرب ان کو خود فنا کر دیں گے، لوگوں نے یہ رائے سن کر کہا: لو عتبہ پر بھی محمد کی زبان کا جادو چل گیا اور عتبہ کی رائے منظور نہ کی۔" (رہبر انسانیت، ص: ۱۶۷)

غزوہ حنین میں حاصل ہونے والے غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں حضرات انصار کو کچھ شکایت محسوس ہوئی، جب حضور کو پتہ چلا تو حضرات انصار کو جمع کر کے ایک مؤثر خطاب فرمایا:

"اے حضرات انصار! یہ کیا باتیں ہیں؟ جو آپ لوگوں کی نسبت سے مجھ تک پہونچی ہیں اور وہ کیا احساس ہے جو آپ لوگوں نے اپنے دلوں میں محسوس کیا ہے، کیا ایسا نہیں کہ میں آپ لوگوں کے پاس آیا، اور حالت یہ تھی کہ آپ سب لوگ راستہ سے بھٹکے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ آپ کو راستہ دکھلایا اور آپ لوگ مالی تقویت کے معاملہ میں دوسروں کے دست نگر تھے اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ آپ لوگوں کی یہ محتاجی ختم کی اور آپ ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے، اللہ نے آپ کے دلوں میں آپس کی الفت پیدا کی، یہ سن کر حضرات انصار نے کہا کہ واقعی اللہ اور اس کے رسول کا بڑا احسان ہے اور وہ برتر ہیں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے انصار بھائیو! کیا تم مجھ سے اس کے جواب میں کچھ نہیں کہتے، انہوں کہا اے اللہ کے رسول ہم آپ ﷺ کو کیا جواب دے سکتے ہیں، احسان وکرم سب اللہ اور رسول ہی کا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: بخدا تم اگر چاہو تو تم یہ کہہ سکتے ہو اور تم یہ کہو گے تو سچ کہو گے اور میں تمہاری تصدیق بھی کروں گا کہ آپ ہمارے پاس اس حالت میں آئے تھے کہ آپ کو جھٹلایا جا چکا تھا، اس وقت ہم نے آپ کی تصدیق کی، لوگوں نے آپ کو چھوڑ دیا تھا اس وقت ہم نے آپ کی مدد کی، اور آپ اپنی جگہ سے نکالے ہوئے تھے ہم نے آپ کو جگہ دی، اور آپ دوسروں کے سہارے کے محتاج تھے، ہم نے آپ کے ساتھ ہمدردی کی، پھر آپ نے فرمایا: اے انصار بھائیو! کیا تمہارے دلوں میں میرے متعلق

شکایت پیدا ہوئی اور یہ شکایت دنیا کی کچھ تھوڑی سی مزیدار چیز کے سلسلہ میں ہوئی کہ جس کو دے کر میں نے کچھ لوگوں کو مانوس کرنے کی کوشش کی ہے، کہ وہ اسلام لے آئیں، اور میں نے تم کو تمہارے اسلام کے سہارے کے سپرد کر دیا، اے انصار بھائیو! کیا تم اس پر راضی اور خوش نہیں کہ دیگر لوگ یہاں سے بکریاں اور اونٹ لے لے کر لوٹیں اور تم اللہ کے رسول کو لے کر اپنے گھروں کی طرف لوٹو۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے تم جو لے کر لوٹو گے یقیناً اس سے بہتر ہے جس کو لے کر یہ لوگ لوٹیں گے، میں تو اگر ہجرت کرنے کا عمل ضروری نہ ہوتا تو انصار ہی کے اندر کا شخص ہوتا اور میرا طرز عمل تو یہ ہے کہ لوگ کسی ایک گھاٹی یا وادی میں چلیں اور انصار کسی دوسری گھاٹی اور وادی میں چلیں تو میں انصار ہی والی گھاٹی اور وادی میں چلوں گا، انصار تو شعار ہیں (یعنی اس لباس کی طرح ہیں جو ہر وقت جسم سے لگا رہتا ہے۔)، اور دیگر لوگ اوپری کپڑوں کی طرح ہیں (یعنی ایسے کپڑے جن کی ضرورت ہر وقت نہیں پڑتی)

پھر آپ نے اس دعاء پر خطاب پورا کیا کہ اے اللہ انصار پر رحم فرما اور انصار کی اولاد پر رحم فرما، اور انصار کی اولاد کی اولاد پر رحم فرماء، راوی کہتے ہیں کہ یہ سننا تھا کہ لوگ رونے لگے، اور اتنا روئے کہ داڑھیاں ان کے آنسوؤں سے تر ہو گئیں، اور انہوں نے کہا ہم بالکل راضی اور خوش ہیں کہ ہمارے حصہ میں اللہ کے رسول آئیں، اس طرح ہم زیادہ فائدے میں ہوں گے۔'' رہبر انسانیت، ص: ۳۰۸)

اسی طرح اصلاح اور تعلیم و تربیت کے طریقہ میں ایسا اسلوب اختیار فرمایا جس سے شکوک و شبہات کے ازالہ کے ساتھ وساوس کا بھی دروازہ بند ہو گیا، اس پہلو پر بعض سیرت نگاروں نے خصوصی توجہ دی ہے، عربی میں ''الرسول المربی''، ''الرسول المعلم''، اور ''الرسول الانسان'' اہم کتابیں ہیں، جنہوں نے حضور ﷺ کے اسلوب خطاب و اصلاح کے منہج کو مدنظر رکھا ہے۔

سیرت پر لکھنے والے ادیب بھی ہیں اور مورخ بھی، دونوں کے اسلوب بیان میں فرق پایا جانا طبعی بات ہے، دوسرے سیرت نگار کا ذات رسول سے تعلق اور وابستگی جس نوعیت کی ہے اس کا اثر اس کی تحریر پر پڑتا ہے۔

ہمارا یہ سیمنار اسی موضوع سے تعلق رکھتا ہے، اس میں سیرت رسول پر مختلف زبانوں میں جو کام ہوا ہے اس کا ادبی حیثیت سے جائزہ لیا جائے گا، اس میں وہ مواقع انتخاب کرنے ہونگے جہاں انفعال اور تأثر پایا جاتا ہے، اس لئے کہ انفعال اور تأثر کو بیان کرنا ہی ادب کا کام ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارا یہ سیمنار نعتیہ شاعری کے سیمنار ہی جیسا مؤثر ہوگا، اس لئے کہ گزشتہ سیمنار میں شعرا کے تأثر کو بیان کیا گیا تھا اس سیمنار میں نثر نگاروں کی مؤثر تحریریں پیش کی جائیں گی، لیکن موضوع ذات رسول علیہ اَلف اَلف تحیۃ وسلام ہی ہے اور حب رسول اور اس کا اظہار ہی اس کا محور۔

ہم آپ سب مندوبین کا اس عظیم شہر میں منعقد اس عظیم سیمنار میں استقبال کرتے ہیں اور جامعہ کاشف العلوم کے ذمہ داران کے ساتھ تعاون کرنے والے جامعہ انوار العلوم کے ذمہ داروں اور معزز شہریوں کا جنہوں نے تعاون کیا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

☆☆☆

تطور أدب السيرة النبوية باللغة العربية في الهند

.................سعيد الأعظمي الندوي ،رئيس تحرير مجلة البعث الإسلامي

السيرة النبوية و منتها الخالدة علي الإنسان:

سوف لايأتي الحصر على أولئك المؤرخين و الكتاب الذين تهيّأوا لتدبيج السيرة النبوية و تصوير حياة الرسول عليه الصلاة و السلام بأقلامهم البارعة، وقد استفاضوا **في التعبير** والتصوير، و أسدوا على المسلمين **معروفاً**، وزودوهم بالواقع الحي الذي حملته شخصية **الرسول** ﷺ فرأوا فيه مالم يكن بالحسبان، **و** لايخطر على بال، رأوا فيه صورة جامعة **شاملة** كاملة للرسول البشر الذي عاش الوحى **الإلهي** و الإلهام السماوي في هذا العالم المادي، فوصل بين السماء و الأرض، و ربط بين الدين والدنيا، و جمع بين الروح والمادة، و أبطل ماكان يعتقده رجال الأديان و الكهنوت و عبدة الأوهام والأصنام، من أنه لا لقاء بين هذين الجانبين، ولايكاد إنسان الأرض يتصل برب السماء إلا بالوسائط و عن طريق الوكالات المزعومة التي كانوا يعتبرونها ملكهم الخاص.

بلغت رسالته في الشمول و الكمال مبلغا يتعذر تفسيره كاملا بالقلم واللسان،فإن الوضع الذي سبق البعثة كان لايسمح لأيّ إنسان بأن يتنبأ أن هناك تغييراً بأحسن منه أو تحولا جديدا فيه، ذاك أن الفساد تجاوز حدود التصور، ولم يعد في الحياة، اجتماعيةكانت أو فردية، أي أمل في العودة إلى الوراء، وأي رجاء في التحسن، فضلا عن قلبه رأسا على عقب، وفعلا كانت المفاجأة العظيمة التي قفزت إلى الوجود و تركت كل إنسان مذعوراً مندهشاً، فوق كل تصور إنساني، وخرص عقلي، حيث قام الناس لمحاربته على جميع مستوياتهم، و ما تركوا أي أسلوب إلا وقد مارسوه في الحد على مالم يكونوا يعقلونه من المفاجأة التي ظهرت على يد محمد ﷺ ، ذاك الرجل المنزوي عن نشاط مجتمعه، ذلكم الإنسان الصموت الذي لم يكن يعرف للحياة معنى، ولا للاجتماع مفهوما -كما زعموا- إنما كان يهمه أن يعتزل عن القضايا التي

كان يعيشها قومه، و يعيش في معزل عن الشئون المعنية عندهم، و المعارك الساخنة التي جرت في القبائل و بين أصحاب الوجاهات و المناصب.

رحمة للعالمين:

ولكنني حينما أقرأ و أتأمل فيمعنى التأكيد للرحمة التي عمت العالمين عن طريق بعثته صلى الله عليه وسلم، و أرى أن الله سبحانه هو الذي يؤكد هذه الرحمةويعبر عنها بالعالمية في قوله" وماأرسلناك إلا رحمة للعالمين" فهنالك أجد الطريق إلى وصف رسول الله ﷺ بالرسول العالمي الذى جاء بالرحمة العالمية، و الشيئ الذي يوصف بالعالمية لايعتبر محدوداً، لا من الناحية الزمانية ولامن الناحية المكانية، بل إنه يعيش وينمو و يزدهر و يتناول الزمان و المكان كليهما بالعطاء و الرفد، والرحمة التي عمت العالم من طريق الرسول ليست في مجتمعات المسلمين وفي شئون حياتهم فحسب، إنما حظيت بها المجتمعات الإنسانية بأسرها، و تعدى أثرها إلىٰ الأكوان كلها، و إلى الكائنات بأجمعها، وكيف لايكون ذلك و قدأنزل الله سبحانه كتابه العظيم كعلامة قائمة دائمة باقية نامية للرحمة التي أنزلت مع الرسول ﷺ، و إن مجرد وجود هذا الكتاب الالٰهي يحمل مدلولات الرحمة بالإنسانية والكائنات كلها، ويؤكد أن هذا الحكم الرباني نحوالعالمين ليس صدفة ولاأمرا طارئا، إنما هو حكم محكم لاتغيير فيه ولا تعديل في أيّ وقت أو فترة حتى تقوم الساعة.

رسالة عالمية خالدة:

ومن خلال هذه الزاوية أنظر إلى رسول الرحمة و رسالته العالمية فإذا بى أتقاصر عن إسباغ الوصف، و أعجز عن رؤية الحقائق بكمالها التي حملها في نفسه، و كل ما أستطيع أن أعرفه هو أن هذا العالم مدين في بقائه و استمراريته و في جميع آثاره العلمية و العملية و الحضارية بوجود الرسول عليه الصلاة و السلام وبعثته، و أن الإنسان في سمو مكانته و إنسانيته مدين-بمعنى الكلمة- برسالته العالمية و دعوته الربانية الخالدة، ولولاه لما كان ما نراه من شرف الإنسان و نشاطاته العظيمة التي علمه الله تعالىٰ إياها و وفقه بها في جميع مجالات الحيلة والكون، ولولاه لما تخلص الإنسان من أغلال الذل و العبودية التي كانت تتشكل بأشكال كثيرة مهينة، من الشرك و الوثنية و الاعتبار بالضعة و الرفعة و التفاوت الطبقي، وتفضيل طبقة على طبقة، و توزيع عباد الله بين الشريف و الأشرف و الرذيل و الأرذل، من غيرسبب ولا علة، فكان من رحمة الله تعالىٰ عليهم أنه أعلن على لسان رسوله ﷺ أن الناس كلهم سواسية،كأسنان المشط، و لافضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي، إلا بالتقوى.

إعلان عن المساواة البشرية:

وكان ذلك إيذانا بانهيارقصور الفخر و الشرف المزعومة، و إعلاناً عن المساواة البشرية التي يشهدها تاريخ الإنسان لأول مرة، وبالتالي

کان ذلك تأكيدا لعلاقة الإنسان بالله تعالىٰ، و انتمائه إليه في كل صغير و كبير، وحقير و جليل، و أنه لايكاد يسعد في حياته بما إذا عاش في عزلة عن تصوره و بعيدا عن مراقبته، بل السعادة مربوطة باتصال الإنسان بالله، في كل حين ولدى كل نشاط، قلا تمر عليه لحظة مهماكانت، من غير هذا الاتصال و التصور و الانتماء والمراقبة، و طبيعي أن الشعور بالمراقبة والإيمان بعلم الله المحيط يجعل صاحبه في حذر وحيطة عند كل عمل يريد أن ينجزه، بل عند كل خاطرة تخطر على باله، وفي ذلك تحقيق للصلاح و الرخاء، والسلام و الأمن و العدل و الأمانة، و الصدق و النصح و كل مايحتاج إليه المرء في سبيل السعادة والكرامة، مما لايخفى على من يتدبر في معنى التقوى و نتائجها و آثارها في الحياة من جميع النواحي۔

إقبال علماء الأمة على الكتابة عن السيرة النبوية:

من هنالك كان لعلماء الأمة الإسلامية و مؤرخيها و المتعمقين في سيرة الرسول ﷺ و المعجبين بها إقبال شديد على أداء ضريبة هذا الحب و الإعجاب في العالم كله، بأساليب مختلفة من فنون العلم و الأدب و التأليف و الكتابة و التدوين فألفوا كتباً ومؤلفات و بحوثا و مقالا ت وقرضوا قصائد مدحية و شعرا وصفيا جميلا، و شفوا غليل الحب و الهيام من خلال هذه الآثار العلمية و الأدبية، ولقد نشأ من كثرة ماكُتب حول شخصية الرسول ﷺ نثرا و نظما في كل لغة من لغات العالم، أدب خاص، عرف بأدب السيرة، الذي كان سببا لاندفاع المسلمين إلىٰ الإسهام في هذا الأدب الرائع و الاستفادة منه باستمرارية منقطعة النظير۔

إسهام المسلمين في الهند في متابعة أدب السيرة:

لقد كان للمسلمين في الهند إسهام كبير في متابعة أدب السيرة و الزيادة فيه، فقد كتبوا و ألفوا في هذا الموضوع بلغات الهند المختلفة و جادت قرائحهم بالمدائح النبوية ذات الروعة و الجمال، وقد اشتهر عدد من الشعراء بالقريض في المديح و اختص بعضهم بهذاالنوع، ولكن ذلك لايتجاوز اللغات المحلية أو اللغة الفارسية و الأردية وقلما وجد من الشعراء في بلاد الهند من عرف اختصاصه بالمدائح النبوية باللغة العربية، إلا أن علماء الهند لم يقصروا في الكتابة و التأليف حول سيرة النبي ﷺ باللغة العربية، فزادوا بذلك إلىٰ ثروة أدب السيرة بهذه اللغة، اشتهر منهم السيد عبد القادر بن شيخ الحضرمي الكجراتي من رجال القرن العاشر الهجري،ومن مواليد ۹۷۸ھ بأحمد آباد، فإن له عدة كتب في السيرة النبوية باللغة العربية منها "الحدائق الخضرة في سيرة النبي ﷺ وأصحابه العشرة" و إتحاف الحضرة العزيزة بعيون السيرة الوجيزة" و المنتخب المصطفىٰ في أخبار مولد المصطفىٰ" و "المنهاج إلىٰ معرفة المعراج۔"

وقد جاء استعراض شامل للمؤلفات العربية في السيرة النبوية في بلاد الهند، في البحث القيم

الذي وضعه سعادة الدكتور محمد صلاح الدين العمري، رئيس قسم اللغه العربية و آدابها في جامعة عليكراه الإسلامية، بأسلوب تحقيقي علمي جيد، وقد نُشر هذا البحث بكامله في مجلة "البعث الإسلامي" الصادرة من جامعة ندوة العلماء لكناؤ (الهند) في العددين الرابع و الخامس من المجلد الثالث و الأربعين.

أدب السيرة في القرن العشرين فى بلاد الهند:

وعلى ذلك فإنني لاأرى حاجة إلى إعادة ذكرهذه المؤلفات العربية عن موضوع السيرة النبوية، و إنما أريد أن أتحدث بإ يجاز عن بعض المؤلفات و الكتب القيمة التي ألفت باللغة العربية أو نقلت إلى العربية في السيرة النبوية في هذا القرن بالذات مما يزيد إلى ثروة المكتبة العربية حول موضوع السيرة النبوية، و يعتبر كمرجع في الموضوع.

فمن هذه الكتب سيرة النبي ﷺ للعلامة شبلي النعماني و تلميذه النابغة العلامة السيد سليمان الندوي، في سبعة مجلدات ضخمة، تولى نشره و توزيعه المجمع العلمي الإسلامي، (أكاديمية شبلي النعماني) بمدينة أعظم كره(الهند)،ولقد نال هذا الكتاب إعجابا كبيرا في جميع الأوساط العلمية و الثقافية في الهند عامة، وفي خارج الهند بوجه خاص، وقد صدرت له طبعات كثيرة في الهند و باكستان، وبما أن هذا الكتاب الموسع كان باللغة الأردية، و كان موسوعة علمية كبيرةفي السيرة النبوية، قام بتلخيصه في مجلد واحد العلامة السيد سليمان الندوى رحمه الله في صورة محاضرات ألقاها في إحدى المراكز العلمية في مدينة مدراس، و نقلت فيما بعد إلى اللغة العربيةالفصحى بقلم تلميذه النجيب فضيلة الشيخ محمد ناظم الندوى رحمه الله.

الرسالة المحمدية:

والكتاب نموذج لأدب السيرة باللغة العربية وله مكانة عالية من الناحية البيانية و التربوية، و هو زاد علمي و أدبي و ديني، يحتوي على أهم معاني السيرة و أبرزجوانبها، و يحلو لي أن أسوق هنا نموذجاً أدبياً رائعاً من هذا الكتاب يدل على مدى جماله الأدبي والفني و العلمي.

"الحياة المثالية لن تكون أسوة للناس مالم تكن أعمال صاحبها الذى يؤسس ديناً ويدعو الناس إليه مثالا و أنموذجا لمن يدعو إليه، و لايتطرق الشك إلى الناس بأن مايدعو إليه هو مما يعمل به، و من السهل أن يدعو الداعي إلىٰ فلسفة تحظى بإعجاب الناس، و إلى فكرة يستحسنونها أو نظرية جديدة في الحياة تروق لهم، و كل ذلك مما يقدر عليه كثير من الناس متى شاؤا و أين شاؤا، أما الذي لايستطاع دائما فهو عمل الدعاة بما يدعون إليه وليست الأفكار الصحيحة و النظريات الشائقة و الأقوال الحسنة هي التي تجعل الإنسان إنسانا كاملا وتجعل من حياته أسوة للناس و مثلا أعلى في الحياة، بل أعمال الداعي وأخلاقه هي التي تجعله كذلك، و لولا ذلك لما كان هناك فرق بين الخير و الشر، ولما تميز

المصلح عن غيره، ولامتلأت الدنيا بالثرثارين و المتفيهقين الذين يقولون مالا يفعلون.

وهنا ينبغي لنا توجيه السؤال إلى العالم أجمع: من ذا الذي تعدّ حياته أسوة للبشر، و فيها المثل الأعلى للبشر، من بين مئات الألوف من الرسل و الأنبياء و عظماء المصلحين ممن شرعوا للإنسانية دياناتها و سنوا السنن للناس.؟

"تحب الرب الٰهك من قلبك و من كل نفسك و من كل فكرك، أحب أعداء ك، من لطمك على خدك الأيمن فحول له الآخر أيضا، و من سخرك ميلا فاذهب معه ميلين، ومن أرادأن يخاصمك و يأخذ ثوبك فاترك له الرداء أيضا، اذهب و بع أملاكك و أعط الفقراء، واعف عن أخيك سبعين مرة، يعسر أن يدخل غني إلى ملكوت السماوات."

إن هذا وأمثاله لاشك أنه من الموعظة الحسنة المحببة إلى النفوس، لكنها لاتعد سيرة مالم يقترن بها العمل، نعم، إنها قول لين و حديث لذيذ، ولكن الذى لايغلب عدوه كيف يتسنى له العفو، ومن لايملك و من لايكون له مال كيف يتصدق على الفقراء و المساكين و اليتامى، و كيف يقضي لهم حاجاتهم؟و من لازوج له و ولد ولا أهل كيف تكون حياته أسوة للأزواج و ذوي البنين و المتأهلين وهم هم الناس الذين تعمرالدنيا بهم؟ ومن لم يتفق له أن يصفح عن أحد في حياته كيف يقتدي به من كان شديد الغضب سريع البادرة؟ولست بمبالغ إذا قلت:إن التاريخ أصدق شاهد على أنه ليس في الدنيا أحد يصح أن تكون للإنسانية أسوةٌ من سيرته و حياته غيرسيرة محمد ﷺ و حياته، وليكن على ذُكر منكم ماتحدثت به إليكم من قبل، وهو أن حياة العظيم التي يجدر بالناس أن يتخذوا منها قدوة لهم في الحياة، ينبغي أن تتوفر فيها أربع خصال:

١- أن تكون "تاريخية" أي أن التاريخ الصحيح الممحص يصدقها و يشهد لها.

٢- أن تكون "جامعة" أي محيطة بأطوار الحياة و مناحيها و جميع شئونها.

٣- أن تكون "كاملة" أي أن تكون متسلسلة لاتنقص شيئا من حلقات الحياة.

٤- أن تكون "عملية" أي أن تكون الدعوة إلى المبادئ والفضائل و الواجبات بعمل الداعي و أخلاقه، و أن يكون كل مادعا إليه بلسانه قد حققه بسيرته و عمل به في حياته الشخصية و العائلية و الاجتماعية، فأصبحت أعماله مثلا أعلى للناس يأتسون بها، و أنا لا أقول: إن الأنبياء صفرت صحائف حياتهم من هذه الميزة مدة وجودهم في الحياة الدنيا، بل أقول: إن سيرتهم التي توجد الآن بين أيدى الناس لاتنص على هذه الأمور، و يخيل إليّ أن الحكمة الإلهية في ذلك ترجع إلى أن أولئك الأنبياء إنما بُعثوا لأزمانهم و شعوبهم، فكان الموفقون للخير من شعوبهم في أزمانهم، يرون سيرتهم فيأتسون بها، ولم يكن هنالك حاجة إلى أن تبقى سيرتهم معلومة للأجيال التالية بعدهم لأن النبوات ستختتم برسالة محمد ﷺ الكاملة

إلى الناس كافة في كل زمان و مكان، فمست الحاجة إلى أن تكون سيرته ﷺ معلومة على حقيقتها في كل زمان و مكان إلى يوم القيامة، ليتيسر التأسيّ بها لجميع أمم الأرض، وهذا من أصدق البراهين على كون محمد ﷺ خاتم النبين و لانبي بعده (ماكان محمد أبا أحد من رجالكم ولكن رسول اللّه و خاتم النبيين)،(الأحزاب: الآية ٤٠)

رحمة للعالمين للقاضي محمد سليمان المنصور فوري:

وهناك رجل موهوب من علماء الإسلام اسمه الشيخ القاضي محمد سليمان بن القاضى أحمد شاه المنصور فوري، ألف كتابا جامعا موسوعيا في السيرة النبوية و سماه "رحمة للعالمين" ألف هذا الكتاب باللغة الأردوية و حظي بالقبول العام و الإعجاب الكبير في جميع أوساط العلم و الدين و الثقافة و التاريخ و اللغة و الأدب، و كان جديرا بأن ينقل إلى اللغة العربية الفصحىٰ، لكي يستفيد منه الناطقون بالضاد في العالم كله، إن حكاية ترجمة هذا الكتاب لطيفة يحكيها لنا صاحب الاهتمامات الكبيرة بتحقيق ونشر التراث الإسلامي، سماحة العلامة الكبير الشيخ عبد اللّٰه إبراهيم الأنصارى رحمه اللّٰه عالم قطر و رجلها العظيم، يقول:

"بينما كنت في إحدى تجولاتي في الهند، وعند لقائي بالأخ الفاضل الشيخ مختار أحمد الندوى (توفي رحمه اللّٰه في مدينة ممبائى قبل سنتين، فمن أراد أن يطلع على حياته فليقرأ ترجمته فى مجلة البعث الإسلامي الصادرة فى ندوة العلماء لكناؤ، الهند) فى بومبائي، اطلعت على كتاب باللغة الأردوية بعنوان "سيرة رحمة للعالمين" لأحد العلماء القدامى و هوالقاضي محمد سليمان المنصور فوري، فهتف قلبي بالحب لمعرفة عباراته، فاخترت شخصين من العلماء الموجودين لدى الشيخ مختار أحمد الندوي، فترجموا لي بعض الصفحات فألفيته ذات عبارات واضحة و معان شيقة، فاستخرت اللّٰه سبحانه في ترجمته للعربية، و فعلا استعنا باللّٰه،ثم بمعلومات الشيخ الفاضل مختار أحمد، فأحضر لي عالمين جليلين، يقتنع بإدراكها في اللغة العربية والأردية، و هما ١- الدكتور مقتدى حسن الأزهري وكيل الجامعة السلفيةفي بنارس، ٢-الأخ الفاضل عبد السلام عين الحق رئيس قسم الترجمة في الدار السلفية بومبائي.

فقررنا معهما ترجمة الكتاب إلى اللغة العربية (من مقدمة الكتاب) وتكون الكتاب بعد الترجمة إلى العربية سفرا جليلا في موضوع السيرة العطرة و مرجعا عظيما لمؤرخي هذه السيرة وكتابها باللغة العربية، و الترجمة في غاية من النقاء و الجمال بأسلوب عربي مبين، كما يشهد بذلك ما يأتي من النموذج الأدبي الوجيز من قصة خروج النبي ﷺ في طريقه إلى المدينة وقت الهجرة إليها، و مالقيه في الطريق من ضيافة كريمة في خيمة أم معبد يقول:

"وبعد الخروج من الغار مر هذا الركب

الميمون في أول يومه بخيمة أم معبد الخزاعية، وكانت امرأة برزة جلدة، تحتبي بفناء الخيمة، ثم تطعم و تسقي من مرّ بها، وكان المارّون يستريحون لديها، فسألها النبي ﷺ هل عندها شيئ؟ فقالت: والله لوكان عندنا شيئ ما أعوزكم القِرى، و الشاة عازب و كانت سنة شهباء، فنظر رسول الله ﷺ إلى شاة في كسر الخيمة، فقال: ماهذه الشاة يا أم معبد؟ قالت: شاة خلّفها الجهد عن الغنم، فقال هل بها من لبن؟ قالت: هي أجهد من ذلك، فقال: أتأذنين لي أن أحلبها؟قالت: نعم، بأبي و أمي، إن رأيت بها حلباً فاحلبها، فمسح رسول الله ﷺ بيده ضرعها وسمى الله ودعا، فتفاجت عليه ودرّت، فدعا بإناء لها يربض الرهط فحلب فيه حتى علته الرغوة، فسقاها فشربت حتى رويت و سقى أصحابه حتى رُوُوا، ثم شرب و حلب فيه ثانياً حتى ملأ الإناء، ثم غادره عندها فارتحلوا، فقلما لبثت أن جاء زوجها أبومعبد يسوق أعنزا عجافا يتساوكن هُزالا لانقي بهن، فلما رأى اللبن عجب، فقال: من أين لك هذا و الشاة عازب ولا حلوبة في البيت؟ فقالت: لا، و الله إلا أنه مربنا رجل مبارك كان من حديثه كيت و كيت، و من حاله كذا و كذا، قال: والله إني لأراه صاحب قريش الذى تطلبه، صفيه لي يا أم معبد. قالت ظاهر الوضاء ة، أبلج الوجه، حسن الخلق، لم تعبربه ثجلة (استرخاء البطن و فخامته) ولم تزر به صعلة، وسيم قسيم، و في عينيه دعج، و في أشفاره وطف، وفي صوته صحل، وفي عنقه سطح، أحور، أكحل، أزج، أقرن، شديد سواد الشعر، اذا صمت علاه الوقار، و إن تكلم علاه البهاء، أجل الناس و أبهاهم من بعيد، و أحسنه وأحلاه من قريب، حلو المنطق، فصل، لانزر ولا هذِر، كأن منطقه خرزات نظم يتحدرن، ربعة لاتقحمه عين من قصر، ولاتشنئوه من طول، غصن بين غصنين، فهو، أنضر الثلاثة منظرا، و أحسنهم قدراً، له رفقاء يحفون به، إذا قال استمعوا لقوله، و اذا أمرتبادروا إلىٰ أمره، محفود و محشود، لاعابس و لامفند۔

حجة الوداع و عمرات النبي ﷺ:

هذا الكتاب الذي يتحدث عن حجة الوداع و عمرات النبي ﷺ قد قام بتأليفه العلامة المحدث الكبير الشيخ محمد زكريا الكاندهلوى رحمه الله ألفه بالعربية ثم ترجم إلىٰ الأردوية كذلك۔

وللتعريف بهذا الكتاب يحسن بي أن أنقل قطعة من مقدمة الكتاب التي كتبها العلامة الشيخ السيد أبي الحسين علي الحسني الندوىؒ، ففيها كفاية و غنى عن أي تعريف آخر يقول:

"ولماكان شيخنا العلامة محمد زكريا بن محمد يحي الكاندهلوى من أحرص علماء عصره على خدمة الحديث الشريف، والاشتغال به تعليما و تأليفا، و شرحا و تعليقا، ونشرا وإضافة، و كانت لذته و طيب عيشه و قرة عينه، (كما ذكرنا في تقديمنا لمقدمة أوجز المسالك) في أن يقضى فيه نهاره و يسهرفيه ليله، وكانت أمنيته أن يكون له في كل موضوع يتعلق بالحديث النبوي، و بالسيرة النبوية نصيب، وكان يعرف بحكم اشتغاله بالحديث، و ممارسته

لهذه الصناعة الشريفة، مدى عناية السلف بحجة الوداع و مايتعرض لطالب علم الحديث و من يطالع الشروح و الكتب المؤلفة و في شرحها و بيانها،وكيف اختلفت المذاهب، و تباينت الآراء في نوع حجة النبي ﷺ و أفعاله و هديه في هذه الحجة، لكل ذلك سمت همته، في ١٣٤٢ھ، و هو في السابعة و العشرين، من عمره(ولد لعشر خلون من رمضان سنة ١٣١٥ھ)إلىٰ أن يفرد جزئاً في حجة الوداع، وكان إذ ذاك شابا موفورالصحة، قوي الهمة يهون عليه سهر الليالي وعناء النهار، فانصرف إلىٰ تأليفه، و هو مستحضر لماكُتب في هذا الموضوع، و لأحسن ماقيل فيه، و قد بارك الله في وقته وهمته، ففرغ من تأليفه في يوم و ليلة، غير الحواشي التي أضافها في أوقات مختلفة-كما بين ذلك في خاتمة هذه الرسالة، فجدد بذلك ذكرى مآثر السلف في الانقطاع التام إلى العلم و التأليف، و العكوف عليه ليلا و نهارا، وبركة الأوقات و إتمام عمل كبير في وقت قصير، وماكان عطاء ربك محظورا".

السيرة النبوية للعلامة الندوي:

ويأتي الآن حديث عن كتاب عظيم أُلف باللغة العربية حول السيرة النبوية على صاحبها ألف ألف تحية و سلام، و هو ليس كتاب سيرة و تاريخ ولكنه مع ذلك نموذج عالٍ للأدب الرفيع و الكلام البليغ، و التعبير الجميل، بأحسن أسلوب أدبي علمي بحت، قد لايوجد له نظير في أدب السيرة النبوية المتطور، و هوكتاب سماحة العلامة الكبير و الداعية الإسلامي العظيم و المؤلف المقتدر على ناصية البيان العربي، عن السيرة النبوية باسم "السيرة النبوية".

يتميز هذا الكتاب بين كتب السيرة المعاصرة بالجمع بين ماكتب و ألف قديما و حديثا، و الاعتماد على المراجع الأجنبية التي توضح جوانب عديدة من السيرة العطرة و التاريخ المعاصر، و الجمع بين الجانب العلمي و الجانب التربوى البلاغي من غير أن يطغى جانب على جانب، يتميز بالاحتواء على أكبر مقدار من القطع النابضة الدافقة بالحيوية و التأثير، الآسرة للقلوب و النفوس، التي لايوجد لها نظير في سيرة إنسان ولافي تاريخ فرد من الأفراد أوجيل أودعوة و دين، وكل ذلك من غير تنميق أو تلوين أو تحبير و تحسين، فإن جمال الطبيعة و الحقيقة لايحتاج إلىٰ تجميلات خارجية أو تزيينات صناعية.

ولنقرأ ماقد كتبه المؤلف العلام في مقدمة الكتاب و هويتحدث عن الدقة البالغة و النظرة الشاملة التي يحتاج إليها كل من يتهيأ للكتابة حول هذه السيرة النبوية العظيمة العطرة، يقول:

"إن من درس علم النفس و الأخلاق، وعني بدراسة الشخصيات المعاصرة، و عاش معها طويلا عرف أن النزول في أعماق نفس إنسان والإحاطة بآفاقها، و تصويرها تصويرا دقيقا شاملا من أصعب أنواع المعرفة و أساليب البيان و أدقها و أنه لايحسن ذلك بعض الإحسان، ولا يقدر عليه بعض القدرة إلا من عرف شيئاً كثيرا من خوالج النفس و خواطرها، و آمالها و آلامها، و

أحزانها و أشواقهاوالتهاب الروح و لوعة القلب، وقد رأى كيف يبيت هذا الإنسان ليله ويقضي نهاره، و كيف يعاشر أهله و يعامل أصحابه، قد رآه في السلم و الحرب، و الرضا و الغضب، وفي العسر و اليسر، و الضعف و القوة، و من أحوال النفس الإنسانية، و معاشرها و أحاسيسها و من مظاهر الجمال و الكمال مالم توضع له ألفاظ بعد، ولاتفي به ثروة لغوية مهما اتسعت ودقت.

والسيرة النبوية المحمدية تتميز من بين سير أفراد البشر-وفيهم الأنبياء و غير الأنبياء- بدقتها و شمولها، واستيعابها لدقائق الحياة و تفاصيلها و ملامحهاوقسماتها، و ذلك بفضل علم الحديث الذي لايوجد له نظير لافي تاريخ الأنبياء و لافي تاريخ العظماء، وكتب السير و الشمائل، وما جمع و حفظ من الأدعية والأذكارالنبويةومناجاته -ﷺ- لربه آناء الليل و النهار وماحفظ و نقل من جوامع الكلم، وماأثر عن الوصافين الحاذقين من أصحابه و أهل بيته في صفته التي لم تحفظ كتب الآداب و التاريخ و الأنساب، صفة أكثر منها دقة، و أعظم منها استيعابا للملامح البشرية و الدقائق الخلقية ولذلك لم يكن الأمر في تأليف السيرة النبوية من الصعوبة و الغموض، و الافتراض و القياس، كما هوفي سيرة العظماء و الأبطال، و أن سيرته -ﷺ-أكمل السير كما كانت أجملها، و هي مؤسسة على نصوص قرآنية و وثائق تاريخية ودقائق في الخلق و الخلق، و تفاصيل في العادات و العبادات، و الأخلاق و المعاملات، لايتصور فوق ذلك، وهي أقرب إلىٰ الحقيقة و الواقع قربا لا يتصور فوقه ولايطمع في أكثر منه، بعد أن مضى على هذه الحياة الطيبة الكريمة مدة طويلة.

ولكن رغم وجود هذا الفارق الكبير بين سيرته ﷺ و بين سير العظماء بل و سير الأنبياء، ورغم دقتها التي لادقة فوقها، و شمولها الذي لاشمول فوقه، لابد من الاعتراف بأن تصوير حياته و أخلاقه، و استيعاب المعجزات التي اشتملت عليها سيرته و دعوته و حياته الانفرادية والاجتماعية و معاملته مع الله و مع الخلق، و آيات الحسن و الإحسان في تكوين خلقه و خلقه، وفي حبه و رأفته، و في دعائه و ابتهاله و في تألمه للإنسانية و مصيرها، و في منطقه و حكمته، وفي جامعيته و كماله، يكاد يكون مستحيلا، و إن ماجاء في كتب السير و الشمائل، -على جماله و روعته-هوبعض ماخصه الله به من جمال السير و كمال الخلق و الخلق لا كله، وإن جل ما هنالك أنها محاولات وجهود يشكرعليها هؤلاء المؤلفون و يؤجرون عليها، و هي ثروة عامة خالدة، يجد فيها كل إنسان وكل جيل من البشر، وكل طبقة من طبقات الناس حظها من الهداية و النور و التقليد و الاقتداء. (لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجوالله و اليوم الآخر و ذكر الله كثيرا)(۳)

الرحيق المختوم للأستاذ المباركفوري رحمه الله:

ألف الأستاذ صفي الرحمن المباركفوري هذا الكتاب الجليل في السيرة النبوية كمساهم في مسابقة الكتابة حول السيرة النبوية التي أقامته

رابطة العالم الإسلامي بمكة المكرمة في عام ١٣٩٦هـ (١٩٧٦ء) لتقديم جائزة تشجيعة مالية على أحسن خمسة بحوث في السيرة وكان الأستاذ المباركفوري الفائز الأول بالجائزة الأولىٰ، باعتبار أن كتابه من أحسن ماكُتب في هذا الموضوع و يستوفي جميع الشروط المطلوبة في وضعه.

من هنا كان كتاب "الرحيق المختوم" بمثابة كتب المراجع في السيرة النبوية و يتميز عن غيره في مجال البحث و الدراسة و التحقيق، و بلغته العربية الجميلة وأسلوبه العلمي والأدبي المتطور.ولمجرد الاطلاع على أسلوب البحث والدراسة ننقل إلىٰ القراء الكرام قطعة من الكتاب مما يتصل بغزوة أحد يقول:

"ومما لاشك فيه أن غزوة حمراء الأسد ليست بغزوة مستقلة، إنما هي جزء من غزوة أحد و تتمة لها، و صفحة من صفحاتها.

تلك هي غزوة أحد بجميع مراحلها وتفاصيلها، وطالما بحث الباحثون حول مصير هذه الغزوة، هل كانت هزيمة أم لا؟ والذى لايشك فيه أن التفوق العسكري في الصفحة الثانية من القتال كان للمشركين، و أنهم كانوا مسيطرين على ساحة القتال، و أن خسارة الأرواح و النفوس كانت في جانب المسلمين أكثر و أفدح، و أن طائفة من المؤمنين انهزمت قطعاً، و أن دفة القتال جرت لصالح الجيش المكي، لكن هناك أمورا تمنعنا أن نعبر عن كل ذلك بالنصر و الفتح.

فمما لاشك فيه أن الجيش المكي لم يستطع احتلال معسكر المسلمين، و إن المقدار الكبير من الجيش المدني لم يلتجئ إلىٰ الفرار-مع الارتباك الشديد و الفوضى العامة-بل قاوم بالبسالة حتى تجمع حول مقر قيادته، و أن كفته لم تسقط إلىٰ حد أن يطارده الجيش المكي، و أن أحداً من جيش المدينة لم يقع في أسر الكفار، و أن الكفارلم يحصلوا علىٰ شيئ من غنائم المسلمين، و أن الكفار لم يقوموا إلىٰ الصفحة الثالثة من القتال مع أن جيش المسلمين لم يزل فيمعسكره، و أنهم لم يقيموا بساحة القتال يوما أو يومين أوثلاثة أيام - كما هو دأب الفاتحين في ذلك الزمان -بل سارعواإلى الانسحاب و ترك ساحة القتال، قبل أن يتركها المسلمون، و لم يجترئوا على الدخول في المدينة لنهب الذراري و الأموال، مع أنه على بُعد عدة خطوات فحسب، وكانت مفتوحة و خالية تماما.

كل ذلك يؤكد لنا أن ماحصل لقريش لم يكن أكثر من أنهم وجدوا فرصة، نجحوا فيها بإلحاق الخسائر الفادحة بالمسلمين، مع الفشل فيما كانوا يهدفون إليه من إبادة الجيش الإسلامي بعد عمل التطويق-وكثيرا مايلقىٰ الفاتحون بمثل هذه الخسائر التي نالها المسلمون -أما أن ذلك كان نصرا و فتحا، فكلا و حاشا.

بل يؤكد لنا تعجيل أبي سفيان في الانسحاب و الانصراف، أنه كان يخاف على جيشه المعرة والهزيمة لوجرت صفحة ثالثة من القتال، ويزداد ذلك تأكدا حين ننظر إلىٰ موقف أبي سفيان من غزوة حمراء الأسد.

وإذن فهذه الغزوة إنما كانت حربا غير

منفصلة، أخذ كل فريق بقسطه و نصيبه من النجاح و الخسارة، ثم حاد كل منهما عن القتال، من غير أن يفر عن ساحة القتال و يترك مقره لاحتلال العدو، وهذا هومعنى الحرب غير المنفصلة.

وإلىٰ هذا يشير قوله تعالىٰ: (ولاتهنوا في ابتغاء القوم إن تكونوا تألمون فإنهم يألمون كما تألمون و ترجون من اللّٰه مالايرجون)(٤:١٠٤)فقد شبه أحد العسكرين بالآخر في إيقاع الألم، مما يفيد أن الموقفين كانا متماثلين، و أن الفريقين رجعا و كل غير غالب

وكتاب آخر له علاقة بموضوع السيرة:

صدر أخيرا كتاب "شعراء الرسول ﷺ في ضوء الواقع والقريض" لكاتب هذا البحث (سعيد الأعظمي) وهو يبحث عن شعراء الرسول ﷺ الثلاثة (حسان بن ثابتؓ، كعب بن مالكؓ وعبد اللّٰه بن رواحةؓ) ويضاف إليهم كعب بن زهيرصاحب قصيدة البردة (بانت سعاد) ويتضمن سيرة الرسول ﷺ في علمه بالشعر و أمره بالرد علىٰ خصوم الإسلام بالشعر، و حثه علىٰ قول الشعر، وطلبه إنشاد الشعر و وعده عليه بالأجر الجزيل و المثوبة الكاملة عنداللّٰه تعالىٰ.

يتحلى جيد الكتاب بكلمة تقديم لسماحة العلامة السيد أبي الحسن علي الحسني الندوي و كلمة تعريف لسعادة الشيخ محمد الرابع الحسني الندوي رئيس جامعة ندوة العلماء، و هو في الواقع رسالة دكتوراة لهذا العاجز،أحرز بها شهادة الدكتوراه من جامعة ندوة العلماء بالاشتراك مع عدة جامعات أخرىٰ.

ليس هذا البحث الوجيز مما يستوعب تطور أدب السيرة في الهند باللغة العربية ويستكمل الموضوع بحيث لايغادر صغيرة ولاكبيرة إلا أحصاها، إنما هودراسة سريعة تشتمل علىٰ ذكر أهم المصادر و المؤلفات التي صدرت في هذا القرن العشرين، وحلت محل الأهمية والمرجعية.

لذلك فإنني أعتذر إليكم إذا لم تجدوا في هذا البحث بيانا تفصيليا لجميع المؤلفات الصغيرة و الكبيرة التيتتصل بالموضوع مابين رسائل و كتب وقصائد و دواوين باللغة العربية،

وصدر أخيرا بعد شعراء الرسول ﷺ كتاب بالعربية حول سيرة النبي ﷺ، "الصادق الأمين" لفضيلة الشيخ المحقق السيد محمد لقمان السلفي، مؤسس و رئيس جامعة ابن تيمية فى جندن باره فى ولاية بهار ،بمديرية جمبارن، ومنشئ أكاديمية الشيخ عبد اللّٰه بن باز رحمه اللّٰه، في مدينة دهلي، ومنها تصدر مجلته الشهرية العربية باسم "الفرقان" و باللغة الأردوية "طوبى"

وله أعمال علمية كثيرة من بينها تفسير القرآن الكريم باللغة الأردوية. إن كتابه فى السيرة النبوية (الصادق الأمين)له أهمية علمية و تاريخية، وقد ترجم إلىٰ اللّغة الأردوية و طبع فى مدينة دلهي من أكاديمية الشيخ عبد اللّٰه بن باز رحمه اللّٰه و من مدينة الرياض كذلك. واللّٰه ولي التوفيق.

☆☆☆

''النبی الخاتم'' کا ادبی جائزہ

.....ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی مدنی

ساتکین کردار کی سطح سیمیں پر ہزار ہا نقوش ابھرے اور ابھرتے رہے، یار ان نکتہ داں نے ان نقوش کی سلوٹوں میں رنگ آمیزی اور قبائے صفات کی بخیہ گری کے ذریعہ ذات کو ہمدوش ثریا بنانے کی سعی ناتمام کی۔ دفتر کے دفتر تیار ہو گئے، قلم اپنی واماندگی اور ذہن رسا اپنی بے مائگی کے احساس سے بوجھل ہونے لگے، سالار قافلہ کی تلاش ہوئی اور ذات والا تبار (محمد ﷺ) پر نظریں ٹک گئیں کیونکہ:

''یوں آنے کو تو سب ہی آئے، سب میں آئے، سب جگہ آئے (سلام ہو ان پر) بری کٹھن گھڑیوں میں آئے، لیکن کیا کیجئے کہ ان میں جو بھی آیا جانے ہی کے لئے آیا ہے، پر ایک اور صرف ایک جو آیا اور آنے ہی کے لئے آیا، وہی جو اگنے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا، چمکا اور چمکتا ہی چلا جا رہا ہے، بڑھا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، چڑھا اور چڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، سب جانتے ہیں اور سبھوں کو جاننا ہی چاہئے کہ جنہیں کتاب دی گئی اور جو نبوت کے ساتھ کھڑے کئے گئے برگزیدوں کے اس پاک گروہ میں اس کا استحقاق صرف اسی کو ہے اور اس کے سوا کس کو ہوسکتا ہے جو پچھلوں میں بھی اسی طرح ہے جس طرح پہلوں میں تھا، دور والے بھی اس کو ٹھیک اسی طرح پا رہے ہیں اور ہمیشہ پاتے رہیں گے جس طرح نزدیک والوں نے پایا تھا، جو آج بھی اسی طرح پہچانا جاتا ہے اور ہمیشہ پہچانا جائے گا جس طرح پہچانا گیا تھا کہ اسی کے اور صرف اسی کے دن کے لئے رات نہیں، ایک اسی کا چراغ ہے جس کی روشنی بے داغ ہے۔ (النبی الخاتم: ص ۷)

ان الفاظ کے ذریعہ مولانا مَنَاظِر اَحسن گیلانی (وفات ۵/جون ۱۹۵۶ء) نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''النبی الخاتم'' (مصنفہ اپریل ۱۹۳۶ء) کا آغاز کیا ہے اور سرنامہ بنایا ہے ''زندہ نبی'' کو۔ دنیا کی ہر زبان واردات مصطفیٰ اور تجلی ہائے ذات مصطفیٰ کے عکس نو بہار سے آنکھوں کو نور اور دلوں کو سرور کی دولت بے بہا سے ہمکنار کر رہی ہے لیکن سیرت نبوی کے اس قابل قدر، محیر العقول اور عظیم الشان ذخیرہ کو اگر بے بہا، درخشندہ، تابندہ اور خیرہ کن موتیوں سے تشبیہ دی جائے تو النبی الخاتم ''درشہوار'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے مُناظِر اَحسن حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کو اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ :دریا بہ کوزہ کی مثال بہت مشہور ہے لیکن شائد دنیا کی کسی اور کتاب پر وہ اس سے بہتر طور سے صادق نہ ہو۔

(النبی الخاتم: ص ۲)

اور ''جدید تحریک سیرت'' کے بانی جناب عبد المجید صاحب قریشی ایڈیٹر اخبار ''ایمان'' 'النبی الخاتم' کے بارے میں

اس حقیقت کے اظہار پر مجبور ہوئے کہ: سیرت کی لائبریری میں اس قسم کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ (النبی الخاتم: ص ۲)

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے مکی دور کے واردات قلبی اور مدنی دور کے تجربات عقلی کے گلہائے رنگ رنگ سے سیرت کا ایسا حسین گلدستہ تیار کیا ہے جس میں رعنائی بھی ہے اور دلکشی بھی، ندرت بھی ہے اور نکہت بھی، تنوع بھی ہے اور توسع بھی، علم وتحقیق کی گیرائی بھی ہے اور عشق ومحبت کی سرمستی بھی، ایقان و اذعان کی فرزانگی بھی ہے اور تپش وگداز کی دیوانگی بھی۔

یہ اک زندہ حقیقت ہے کہ زندگی آزمائشوں کی آماجگاہ ہوتی ہے اور ہر شخص کے حصہ میں اس کی ہمت وعزیمت اور پامردی وثبات قدمی کے بقدر آتی ہے۔ تاریخ کے زرین صفحات پر اس راہ کے فرزانوں بلکہ دیوانوں کے کارنامے آج بھی اسی طرح درخشاں ہیں جس طرح کل درخشاں تھے اس فرودگاہ ارضی پر خیر کا جو بھی تصور پایا جاتا ہے وہ ان ہی قدسی نفوس، پاک نفس ﷺ، پاک باز اور ستودہ صفات خاصان خدا کی زہرہ گدازی، آہ سحرگاہی، نالۂ نیم شبی اور بلند نگہی کا پرتو ہے اور جس کے قافلہ سالار ہیں النبی الخاتم۔

''النبی الخاتم'' میں خلیل کی دعا، مسیحا کی نوید، بکہ کے صادق، حجاز کے امین، بدر حنین کے سپہ سالار، سدرہ کے مکین، حراء کے خلوت نشین، ثور کے سراپا یقین، احد کے زرہ پوش، خندق کے خارا شگاف، قبا کے مسافر، یتیموں کے اشک شو اور مکہ کے فاتح کی روداد اس قلم کی جنبش کا نتیجہ نہیں جس کی سر بازار بولی لگتی ہے اور نہ اس بحر کے شناور ''قدسیوں کے گروہ'' کا نتیجہ فکر ہے جو ''آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابر باراں'' کا منتظر رہتا ہے بلکہ خون جگر، قلب مضطر، چشم گریاں اور فکر وآگاہی کی خوشبو لفظ لفظ ہی نہیں بلکہ حرف حرف میں اس طرح رواں دواں ہے جس طرح برگ گل میں باد سحرگاہی کا نم اپنے وجود اور شناخت کا پیہم اعلان کرتا ہے کیونکہ ذکر اس کا ہے جس کے بارے میں کہنے والے نے یہ کہا ہے کہ:

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

بلکہ یہ بھی کہنا پڑا کہ:

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آیدہ جنید و بایزیداں جا

بلکہ اس منزل کے بعد کی منزل کی بھی نشاندہی کرنی پڑی:

اے زائر بیت نبوی یاد رہے یہ
بے قاعدہ یاں جنبش لب بے ادبی ہے
آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست ہو آواز
خوابیدہ یہاں روح رسول عربی ہے

عشق کی اس منزل پر پہنچ کر آدمی اس دنیائے ناسودت کی بو قلمونیوں کے دائرہ احتیاج سے باہر چلا جاتا ہے اور یوں گویا ہوتا ہے:

متاع لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زبان میں نے

غریب حجاز کا امیر شہر مکہ تھا اور مکہ کے تمام امیروں کے پاس مجموعی طور پر جو کچھ تھا انفرادی طور پر اسی قدر دولت کی مالکہ حضرت خدیجہ تھیں اور نکاح کے بعد حضرت خدیجہؓ نے پوری دولت حضور کے قدموں میں ڈال دی۔ لیکن ''بوریا ممنون خواب راحتش'' کے سرخیل کی کہانی ''النبی الخاتم'' کے مصنف کی زبانی سنئے۔

''ریشمی قالینوں'' عبقری گدوں، مزرکش چھپر کھٹوں پر بے فکر وتر دداگر وہ چاہتا تو بہ آسانی یوں بھی مل سکتی تھیں اور وہ تو ملی ہوئیں تھیں لیکن اس نے بجائے ایرانی ذرابی، رومی نمارق

کے زمین اور کھلی زمین کے پتھریلے فرش کو اپنا بچھونا بنایا اور خارا پتھروں کو اپنا تکیہ بنایا، خاک کے فرش کے سوا جس کے پاس کوئی فرش نہیں ہوا گر خاک پر سویا تھا کیا خاک سویا، جو تخت پر سوسکتا تھا وہ مٹی پر سویا۔ (النبی الخاتم: ص ۳۷-۳۸)

علامہ ابن جوزی کے فخر روزگار شاگرد شیخ سعدی نے اس حقیقت کی ترجمانی کیا خوب کی ہے:

توضع زگردن فروزاں نکوست
گداگر تواضع کند خوئے اوست

حضور اکرم ﷺ نے جب اعلان نبوت فرمایا تو یہ اعلان اہل مکہ کے دوش جہل مرکب کے لئے بارگراں ثابت ہوا اور دعوائے رسالت کی تصدیق میں سرداران مکہ نے فکری ژولیدگی کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ مولانا گیلانی میدان ضلالت کے ان سورماؤں کو دعوت مبارزت دے رہے ہیں اور کس انداز سے دے رہے ہیں سنئے اور سر دھنئے:

''اپنے اپنے معیاروں کو لے کر آؤ، اپنی اپنی کسوٹیوں کو لے کر دوڑو! کسو! کس کر دیکھو کہ جس کو قدرت کے ہاتھوں نے خالص اور آلائشوں سے قطعاً پاک، بالکل صاف پیدا کیا ہے، صداقت وراستی، امانت واخلاص کے سوا اس میں کوئی اور چیز بھی ہے، خوب کف گیریں مار مار کر دیکھو! کیا اس دیگ کا کوئی چاول کچا ہے، روشنی کی جو کرنیں اس کے اندر سے پھوٹ پھوٹ کر دنیا کو جگا رہی ہیں، گھورو! آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورو! خورد بینوں کو آنکھوں پر چڑھا چڑھا کر گھورو! تاریکی کا اس میں کوئی ریشہ ہے۔'' (النبی الخاتم: ص ۳۸)

اس کے آگے تحریر فرماتے ہیں:

''سلبی یا ایجابی کون سی شکل باقی رہی جس 'معیار' پر سچائی کی یہ لاہوتی حقیقت نہ پرکھی گئی، 'زر' لے کر دوڑے، 'زمین' لے کر دوڑے، 'زن' لے کر دوڑے، الغرض جو کچھ سوچا جاسکتا ہے ہر ایک سے رگڑ رگڑ کر، گھس گھس کر انہوں نے جانچا لیکن انہوں نے 'صدق وامانت' کے احساس کی وہی گرفت جو دعوے سے پہلے ان کے دلوں پر مسلط تھی کسی تدبیر سے ڈھیلی نہیں پڑتی تھی، اس میں کیا ہے، اس کے اندر کیا ہے؟ مال ہے، جاہ ہے، یا کچھ اور ہے اور ہر سوال کی سلائیاں لمبی لمبی سلائیاں ڈال ڈال کر ہر ایک نے دیکھا، بار بار دیکھا، لیکن 'سچ' کے سوا اس میں کچھ نہیں ہے۔ اخلاص کے سوا اس میں کچھ نہیں ہے۔'' (الخاتم النبی: ص ۴۲)

مشرکین مکہ نے مسلمانوں کا عرصہ حیات کس طرح تنگ کیا اور خدائے واحد کی پرستش کی راہ میں کس طرح حائل ہوئے، مولانا گیلانی اس کی تصویر کشی اس طرح کرتے ہیں:

''چڑیوں کے بھی گھونسلے ہوتے ہیں جن میں وہ پناہ لیتی ہیں اور سانپوں کی بھی بانبیاں ہوتی ہیں جن میں وہ چھپ کر رگیدنے والوں سے اپنی جان بچاتے ہیں لیکن دعوئے کے زور کو توڑنے کے لئے ستم کے جو پہاڑ جن غریبوں پر توڑے جارہے ہیں ان کے پاس تو وہ بھی نہ تھا..... اُف! کہ ان پیشانیوں کو خدا ہی کی زمیں کا اتنا ٹکڑا بھی میسر نہ تھا جس پر وہ اپنی پیشانی اپنے خدا کے آگے رکھ سکیں۔ (النبی الخاتم: ص ۴۴)

''اور پہلی دفعہ نہیں، بلکہ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ ایمان پر کبھی جبر نہیں کیا گیا بلکہ بے ایمانی پر مجبور کرنے کے واقعات سے تو تاریخ بھری پڑی ہے، اس پر بھی بے ایمانوں نے پھیلایا کہ ایمان ہی جبر سے پھیلا ہے۔'' (النبی الخاتم: ص ۴۴)

نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر، شاہ حبش پر اس کے اثرات اور مہاجرین صحابہ کرام کے ایمان محکم اور اذعان غیر متزلزل کو مولانا گیلانی نے الفاظ کی قبا اس طرح پہناتے ہیں:

''جولو ہا گرم تھا جب اس کی گرمی کا یہ حال ہے تو جس نے اس کو گرم کیا تھا (ﷺ) اس کی حرارت کون برداشت کر سکتا تھا، مگر وہی جنھوں نے چھوا نہیں تھا جو چھونے سے ہچکچا رہے تھے، ورنہ جنھوں نے چھو لیا تھا، دیکھ رہے ہو کہ آگ کسی طاقت سے بجھ رہی ہے؟ غریبوں سے، امیروں سے، شاہی قوت کے فوارے سے، بجھانے کی کوشش کی گئی لیکن بجائے بجھنے کے وہ اور بھڑکی، بجائے دبنے کے وہ اور بھبھکی۔''

(النبی الخاتم: ص ۴۷)

ابوطالب کی گھاٹی میں مسلسل تین سال کی زہرہ گداز آزمائشوں کی حکمتوں پر مولانا گیلانی کا قلم یوں سبک خرامی کا مظاہرہ کرتا ہے:

''لیکن یہاں تو باطن کو ظاہر کر کے دکھانا تھا، چھوڑ دیا گیا تھا تا کہ کریدنے والے جہاں تک ممکن ہو کریدیں، وہ مسل رہے تھے، رگڑ رہے تھے، انگلیاں ڈال ڈال کر ٹٹول رہے تھے کہ جو کچھ ظاہر کیا جا رہا ہے کیا اندر میں کچھ بھی، کہیں بھی اس کے سوا کچھ ہے، تجربہ کرنے والوں کے لئے تجربے کے سارے ساز و سامان، تمام آلات واوزار ایک ایک کر کے مہیا کر دیے گئے تھے کہ آئندہ ان ہی کو گواہی دینی تھی، ان ہی کو دنیا کے آگے شہادت دینا تھا۔'' (النبی الخاتم: ص ۵۱-۵۲)

دنیا آزمائشوں کی آماجگاہ ہوتی ہے، طائف کا دکھیارا بھی اسی مرحلے سے گذرا بلکہ گذار گیا اور اس کے بعد مژدۂ جاں فزاں کی باد بہاری اس کے حصہ میں آئی۔ اس خزاں کے بعد معراج کا واقعہ بہار کا پیش خیمہ بنا۔ جسے دوگز زمیں والوں نے گفتگو کے لائق نہ سمجھا اس کو آسمان والے نے شرف تکلم بخشا، جس کو طائف تک سفر کے لئے گدھی بھی میسر نہ آئی تھی اس کی سواری کے لئے براق بھیجا گیا، جس کی امامت سے کفار مکہ اور صنادید طائف نے پہلو تہی کی، ستودہ صفات انبیائے کرام نے اس کی امامت کو کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید تصور کیا، جس کو طائف کے عبد یالیلوں نے گدلا پانی پیش کرنا بھی باعث ننگ وعار سمجھا اس کی ضیافت، صاف وشفاف شیر شیریں سے کی گئی، جس کو پست سمجھا گیا اس کو رفعت عطا کی گئی، جس پر گھروں کے دروازے بند کئے گئے اس پر آسمانوں کے پٹ کھول دیے گئے، جس کو زمین پر گالیاں دی گئیں اس پر آسمان میں دعاؤں کی گلپاشی ہوئی، جس کو تنگ گھاٹی میں مقید کیا گیا اس کے لئے آسمان وزمین کی وسعتیں واکر دی گئیں، قریش کے سرداروں نے جسے دھتکارا فرشتوں کے سردار نے اس کی غاشیہ برداری کی۔

طائف کا واقعہ سیرت نبوی کا ایسا باب ہے جس کی ایک ایک فصل بلکہ ہر فصل کا ایک ایک مبحث بلکہ ہر مبحث کی ایک ایک سطر عبرت وموعظت کے صد ہا زاویے رکھتی ہے:

''جس کو جبال ملے، ملک الجبال ملا، وہ اپنی قوت سے کیا کام لیتا ہے، جنھوں نے اس کو ہلکایا، ان پر ان کی زندگی کو وہ بھاری کرے گا، چاہتا تو یہ کر سکتا تھا اور اس کو حق تھا کہ جنھوں نے اس کو پتھراؤ کیا تھا ان کو سنگسار کرے، اس نے طائف سے نکل کر جو کچھ کہا تھا، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا تھا، لیکن جنھوں نے اس کے ساتھ وہ سب کچھ کیا تھا جو وہ کر سکتے تھے تو پھر غور کرو، اس کے متعلق اس نے کچھ بھی کہا، جس قدر وہ نزدیک تھا اتنی نزدیکی جنھیں حاصل نہ تھی، جب اس کی آرزو نے نوح کا طوفان برپا کیا تو ان میں سب سے اونچا تھا، سمجھ سکتے ہو کہ وہ کیا کچھ نہ برپا کر سکتا تھا اور اب کس بات کی کمی تھی جو چاہے اب وہ کر سکتا تھا لیکن اسی تاریخ نے جس نے نوح کے طوفان، عاد کی آندھی، ثمود کے صیحہ، شعیب کے رجفہ، موسیٰ کے دریا کے واقعات کو محفوظ رکھا ہے اس نے

رکارڈ کیا کہ پہاڑ کے فرشتے سے کہا جارہا ہے: میں مایوس نہیں ہوں کہ ان کی پشت سے ایسی نسلیں نکلیں جو اللہ ہی کی پوجا کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک اور ساجھی نہ بنائیں، پہاڑ پانی ہوگیا ایک اس آواز نے آگ کو باغ بنادیا، جو مررہے تھے جی گئے، جو ختم ہوگئے تھے پھر شروع ہوگئے۔''

(النبی الخاتم: ص ۶۶-۶۷)

مقام قُباء کو مدینہ میں حضور اکرم ﷺ کی اولین فرودگاہ ہونے کا شرف حاصل ہوا اور آپ نے وہاں سب سے پہلے خدا کے گھر کی بنیاد ڈالی، اس حقیقت کو مولانا کا سحر طراز قلم یوں صفحہ قرطاس کی زینت بناتا ہے:

''قرن الثعلب کے موڑ پر طائف سے نکلتے ہوئے جس عمل کا ردعمل 'ملا اعلیٰ' سے شروع ہوا تھا، یہ اسی تسخیری قوت کا ظہور ہے جو 'مکہ' میں بھی ظاہر ہوا، 'ثور' میں بھی ظاہر ہوا۔ 'ثور' سے نکلنے کے بعد بھی ظاہر ہوا، 'قُبا' میں بھی ظاہر ہوا، جہاں خالق کا جو دروازہ مخلوقات کے لئے بند تھا، صدیوں کے بعد پہلی دفعہ قبا کی مسجد بنا کر کھولا گیا تا کہ جس کسی کو جہاں کہیں زمین پر قابو بخشا جائے پہلا کام یہی کرے، اور اب مدینہ میں بھی اسی ردعمل کا ظہور ہورہا ہے، آئندہ ہوتا رہے گا، اسی کا ظہور، 'کوفہ' میں بھی ہوگا۔ 'دمشق' میں بھی ہوگا، 'بغداد' میں بھی ہوگا، 'غرناطہ' میں بھی ہوگا، 'قاہر' میں بھی ہوگا، 'غزنی' میں بھی ہوگا، 'دہلی' میں بھی ہوگا، اور کیا بتاؤں کہ کہاں کہاں ہوگا، کب تک ہوگا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابد تک اب تو صرف اسی کا ظہور ہے، اسی کی نمود ہے، اسی لئے 'مدنی زندگی' کے اصلی عناصر یہ واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہ تو 'مکہ' ہی کے آثار ہیں جنھیں تم اب 'مدینہ' میں دیکھ رہے ہو، بلکہ 'مدنی' زندگی میں تم کو وہ باتیں تلاش کرنی چاہئیں جن میں 'دل' سے زیادہ 'دماغ' کا 'اخلاق' سے زیادہ 'عقل' کا تجربہ ہو۔

'مکہ' میں جس طرح دیکھا گیا تھا کہ اس 'دل' سے بہتر کوئی دل نہیں، اسی طرح ان باتوں کا مطالعہ 'مدینہ' میں کرو، جن کو دیکھ کر کہا جاتا کہ اس 'دماغ' سے بہتر کوئی 'دماغ' نہیں، ظاہر ہے کہ مدینہ میں سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ مسجد نبوی بنائی گئی اور اس کے ساتھ 'صفہ' کا مدرسہ بنایا گیا، لیکن کیا صرف مسجد نبوی بنائی گئی اور مدرسہ بنایا گیا، مسجد اور مدرسہ کون نہیں بناتا اور کہاں نہیں بنتے پھر اس میں بڑائی کیا ہے، باوجود استطاعت وقدرت کے پختہ اینٹ کے اور پتھر سے نہیں بنائی گئی، بلکہ کھجور کے تنوں اور شاخوں اور کچی اینٹوں سے بنائی گئی، بلاشبہ اس میں یہ نمونہ ضرور ہے کہ مسلمان جس آبادی میں پہونچیں، سب سے پہلے، وہ اپنے گھر سے بھی پہلے، وہاں خدا کی عبادت کی مسجد کی نیو کھودیں کہ مسجد ہی اسلام کی میخ ہے، اسلامی آبادی بناتے ہوئے سب سے پہلے چاہئے کہ اس میخ کو ہر مسلمان اس جگہ گاڑ دے جہاں وہ آباد ہوتا ہے۔ تعمیری تکلفات کی وجہ سے وقت نہ ہو اس لئے سب سے پہلی مسجد کا نمونہ وہ رکھا گیا جسے ہر شخص گاڑ سکتا ہے، ہر جگہ گاڑ سکتا ہے، آخر تعمیری سامان کے لحاظ سے جو مسجد بھی ہوگی اس سے کیا کم ہوگی جو مسلمانوں کی سب سے پہلی مسجد تھی۔''

(النبی الخاتم: ص ۸۷، ۸۸، ۸۹)

ہجرت کے بعد مہاجرین وانصار کے درمیان مواخاۃ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کا تذکرہ تمام سیرت نگاروں نے کیا ہے لیکن مواخاۃ میں پنہاں حکمت کے لعل وگوہر سے دامان قلب و نظر کو مولانا گیلانی نے جس طرح گلستاں بہ کنار کیا ہے سیرت کے گہر بار ذخیرہ میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''کس قدر سرسری طور سے لوگ گزر جاتے ہیں، جب سنتے ہیں یا کہتے ہیں کہ 'مدینہ' میں انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کرایا گیا تھا، ان میں عقد مواخات قائم کیا گیا تھا، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا، مہاجرین قریش اور قریشی نسل کے ساہوکار کعبہ

کے کلید بردار تھے اور انصار قبیلہ اوس وخزرج کے کسان اور کاشت کار تھے، حالانکہ دونوں انسان تھے لیکن جس طرح آریائی نسل والوں نے سامی نسلوں کو اور سامی نسلوں نے تورانی نسلوں کو یا برہمنوں نے شودروں کو بے رنگوں نے رنگینوں کو پھیکوں نے نمکینوں کو، آدمی کی نہیں بلکہ گھوڑوں کی اولاد بیل کی نسل سمجھا اور اسی قسم بلکہ ان سے بدتر سلوک انھوں نے ان لوگوں کے ساتھ روا رکھا جو ان کے ہم نسل ہم قوم نہ تھے۔

قریش کو اپنے نسب پر اپنے حسب پر بڑا ناز تھا، نسبی فخر ایک دیوتا تھا جو صدیوں سے ان میں پوجا جاتا تھا اور اس طرح پوجا جاتا تھا کہ غیر قریشی عربوں کے ساتھ یہ لوگ حج کرنے میں بھی اپنی اہانت محسوس کرتے تھے جس طرح آج بھی اجلے، کالوں کے ساتھ دعا تک مانگنے میں اپنی ذلت سے ڈرتے تھے۔ قریشی اسی قبرستان میں بھی دفن ہونا ننگ خیال کرتے تھے جس میں کوئی غیر قریشی بے چارہ دف ہوتا جس طرح آج شودروں کی مسان برہمنوں، چھتریوں کے مرگھٹ سے دور ہوتی ہے یہی مواخاۃ کا گرز تھا جس نے اس بت کو بھی ڈھیر کر کے رکھ دیا۔'' (النبی الخاتم: ص ۹۱)

عربوں میں وطن کی پرستش کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا لیکن خاتم النبین نے وطنیت کے اس جذبہ پر کاری ضرب لگائی۔ اس ضرب کاری کے چہرے سے مولانا گیلانی کچھ اس طرح پردہ اٹھاتے ہیں:

''عرب میں کعبہ موجود تھا، جو صرف عرب جاہلیت ہی میں نہیں بلکہ اسلام میں بھی محترم تھا، لیکن باایں ہمہ اس مسجد کا قبلہ عرب سے باہر فلسطین کے سلیمانی ہیکل کو کیوں ٹھہرایا جاتا ہے۔ لوگ سمجھے کہ صرف قبلہ مقرر ہوا، لیکن یہ کسی نہیں دیکھا کہ 'وطنیت' کا جو بت عرب میں صدیوں سے پوجا جاتا تھا اور اس زور وشور سے پوجا جاتا تھا کہ اس کا پجاری اپنے سوا سب کو 'عجم' اور گونگا سمجھتا تھا، دیکھو کہ صرف ایک اسی مخفی ضرب نے اس بت کو پاش پاش کر دیا۔ جب قرآن میں ہے کہ ابتداً عربوں پر یہ 'غیر ملکی' قبلہ گراں گزرا تو یہی غور کرنا تھا کہ کیوں گراں گزرا؟ لیکن اب تو گرانیوں کے برداشت کا انھوں نے عہد کیا تھا، جھجکے مگر اسی کے ساتھ ہی آگے بھی بڑھ گئے اور جو لادا گیا لادلیا، سترہ مہینے تک اس وطنیت شکنی کی مشق نے جب ان کے لئے عرب اور غیر عرب کو ایک بنا دیا تو اس سے بھی عجیب اور عجیب تر تماشا پیش ہوتا ہے۔ بیت المقدس کو قبلہ بنا کر عرب کے باشندے عرب سے الگ کئے گئے، لیکن اب عرب نہیں بلکہ عرب اور غیر عرب خدا کی ساری زمین سے یہ عرب اور غیر عرب کا قصہ ہی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جاتا ہے، سترہ مہینے کے بعد قبلہ بدلتا ہے اور بجائے سلیمان کی ہیکل کے سلیمانؑ و داؤدؑ، اسحاقؑ و اسماعیلؑ کے باپ ابراہیمؑ کے بنائے کعبہ کو قبلہ ٹھہرا کر حکم دیا جاتا ہے: "ومن حیث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام و حیث ماکنتم فولوا وجوهکم شطرهٗ۔"

اور جہاں سے تم نکلے اسی جگہ سے تم اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف موڑ دو اور جہاں کہیں (اے مسلمانو! تم ہو اپنے چہروں کو اس طرف موڑ دو۔ کیا مقصد ہے اس کا؟ یہی کہ جو کعبہ سے باہر کئے گئے ہیں وہ بھی کعبہ کے اندر ہیں اور جو کعبہ سے باہر تھے اپنے کو کعبہ کے اندر سمجھیں، پہلے غیر عرب کو عرب کا قبلہ بنایا گیا، اور جب یہ ہو چکا تو پھر عرب اور غیر عرب سب کو مٹا کر نہ عرب ہی رہا نہ غیر عرب رہا بلکہ خدا کی جو ایک دنیا تھی وہ ایک ہی دنیا کی شکل میں واپس آ گئی، کعبہ دنیا کی مسجد کی دیوار ٹھہرایا گیا اور بسیط زمین اسی دیوار کا صحن قرار پایا، یہی ہر مسلمان سمجھتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے، وہ افریقہ کو بھی کعبہ میں سمجھتا ہے اور امریکہ کو بھی اسی کے صحن کا ایک حصہ قرار دیتا ہے، ایشیا بھی اس کو کعبہ کی دیواروں کے نیچے نظر آتا ہے، یورپ میں بھی جب اس

کو نماز کی ضرورت ہوتی ہے، تو کعبہ کے آنگن میں کھڑا ہو کر وہ اپنی نماز ادا کرتا ہے، اور سٹ (ایوریسٹ) اسی کے صحن کا ایک ٹیلہ ہے اور 'بحر محیط' اسی صحن کا ایک حوض، بحر قلزم اسی صحن کی ایک نالی ہے، ایک مسلمان اپنی زندگی کے ہر دن میں پانچ وقت اس نظریہ کی عملی شکل میں مشق کرتا ہے، اس کو یہی بتایا گیا ہے، صحیح حدیث میں ہے: جعلت لي الأرض مسجداً (پوری زمین میری مسجد بنائی گئی ہے۔'' (النبی الخاتم: ص۹۰)

حیات مبارکہ میں جو غزوات پیش آئے، وہ تاریخ کا ایک حصہ ہیں لیکن مستشرقین اور مستغربین کی لن ترانیوں نے ژاژ خائی کا ایک ایسا طومار باندھا کہ اپنے بھی معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرنے لگے اور ذہنی ژولیدگی اور فکری ژندگی ان کا مقدر بن گئی۔ لیکن اس کے برعکس مولانا گیلانی جب اس مقام پر پہونچتے ہیں تو معذرت خواہانہ لہجہ تو دور کی بات ہے مستشرقین، مستغربین کی یاوہ گوئی کا پردہ اس قوت سے چاک کرتے ہیں کہ ان کی علمی دقیقہ سنجیوں کا فلک بوس قلعہ چشم زون میں زمین دوز ہو جاتا ہے، تحریر کی متانت دلیل کی قوت اور فکر و نظر کی جدت طرازی ملاحظہ ہو:

''ابراہیم کا بیت ایل پتھر کی کھودی ہوئی مورتیوں کی گندگی سے پاک ہو گیا اور حیرت ہے کہ بکھرا ہوا وحشی عرب جس میں وثنی، بت پرست، یہودی، عیسائی، صابئی، عقل پرست سبھی ہیں ان مختلف اقوام وقبائل کے باہمی انتشار، جنگ و جدال کو ختم کر کے ایک پرامن آئینی نظام سلطنت کے ساتھ وابستہ کرنے میں جھوٹوں نے جس قدر بھی جھوٹ چاہا پھیلا دیا لیکن واقعہ صرف اس قدر اور اسی قدر ہے کہ دس لاکھ مربع میل کی طویل وعریض سرزمین کا پایہ تخت جس وقت کسانوں کا وہی قصبہ ہو گیا تو دس سال کی اس لمبی اور دراز مدت میں وثنیوں، یہودیوں، عیسائیوں، مسلمانوں سب میں سے امن وامان کی اس جدوجہد میں طرفین کے جتنے آدمی کام آئے ان کی تعداد کروڑ، لاکھ بلکہ دو ہزار، چار ہزار بھی نہیں۔ اتنی بھی نہیں جتنی نیویارک کی سڑکوں یا لندن کی شاہ راہوں پر موٹر کے نیچے سے روزانہ اٹھائے جاتے ہیں یا ہندوستان کی معمولی جھڑپوں میں لاشوں کی جو فہرست تیار کی جاتی ہے بلکہ کل لے دے کر سب کی کل تعداد ایک ہزار اٹھارہ ہے، یہ ہے خونی پیغمبر کا بہایا ہوا خون یا قصابوں کی وہ دوکان جس کے شور سے گنبد گرداں بھی تھرّا اٹھا ہے۔ (النبی الخاتم: ص۹۶-۹۷)

ہجرت کے بعد جب دستور ربانی کا نفاذ عمل میں آیا تو مدینہ پایہ تخت قرار پایا، اس پایہ تخت کے بارے میں 'النبی الخاتم'' کی طرفہ طرازی قابل داد بھی ہے اور قابل دید وشنید بھی:

''پھر کیا مدینہ میں جو پایہ تخت قائم ہوا، وہاں منبر کی جگہ تخت بچھایا گیا، وہی منبر ہے، وہی مسجد ہے، وہی جھونپڑے ہیں، وہی چمڑے کا اکہرا گدا ہے، نہ حاجب ہیں، نہ دربان ہیں، امیر بھی آتے ہیں، اور غریب بھی آتے ہیں، دونوں کے ساتھ ایک معاملہ ہے، عجب دربار!

سلاطین کہتے ہیں، شاہی دربار تھا، کہ فوج تھی، علم تھا، پولیس تھی، جلاد تھے، محتسب تھے، گورنر تھے، کلکٹر تھے، منصف تھے، ضبط تھا، قانون تھا۔

مولوی کہتے ہیں، مدرسہ تھا درس تھا، وعظ تھا، افتاء تھا، قضا تھا، تصنیف تھی، تالیف تھی، محراب تھی، منبر تھا۔

صوفی کہتے ہیں، خانقاہ تھی، کہ دعا تھی، جھاڑ تھا، پھونک تھا، ورد تھا، وظیفہ تھا، ذکر تھا، شغل تھا، تخث (چلہ) تھا، گریہ تھا، وجد تھا، حال تھا، کشف تھا، کرامت تھی، فقر تھا، فاقہ تھا، زہد تھا، قناعت تھی۔

مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا، اس لئے کہ وہ سب کے لئے آیا تھا۔ آئندہ جس کسی کو چلنا تھا، جہاں کہیں چلنا تھا، جس زمانہ

میں چلنا تھا، اسی روشنی میں چلنا تھا۔'' (النبی الخاتم: ص ۱۰۰-۱۰۱)

حضور اکرم ﷺ کی شب وصال، کیفیت اندرون خانہ، احوال روز وشب اور فقر وانابت کی تصویر کشی جس طرح مولانا گیلانی کے موئے قلم نے کھینچی ہے اس میں نکہت فکر ونظر کی مشک باری بھی ہے اور دراز نفسی علم وآگہی کی فتنہ سامانی بھی، جدت وہم خیال کی نے نوازی بھی ہے ندرت قلب ودماغ کی مینا کاری بھی اور فراوانی عشق ومستی کی جگر کاوی بھی:

''دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ اس بستر پر لیٹنے کی جو آخری رات تھی اس کے روشن کرنے والے چراغ میں تیل کسی غریب پڑوسی سے قرض کر کے آیا تھا اور جو چادر اس وقت مرض واپسیں کے مریض پر پڑی ہوئی تھی، جب بعد کو دیکھا گیا تو صرف پھٹا ہوا ایک سیاہ کمبل تھا، جس کے اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے، اس کی زرہ تیس صاع جو پر ایک یہودی ساہوکار کے یہاں گروتھی۔ انصاف کے خونیو! کیا یہی مکہ کا وہ فقیر ہے جس کے متعلق تمہاری گندی زبانوں نے غل مچایا کہ وہ مدینہ کا بادشاہ ہوگیا تھا اور کیا آج بھی اس کا یہ حال ہے۔ دس سال کی اس مدت میں کس نے اس کے گھر سے روز دھواں اٹھتے دیکھا؟ ایسے بادشاہ کس دنیا میں گذرے ہیں جس کے منہ کو جو کے بے چھنے آٹے کی روٹی بھی میسر نہ آئی؟ فقیروں نے بھی کبھی دو دو تین تین مہینوں تک صرف پانی اور خشک چھواروں پر زندگی گذاری ہے؟ فاقہ مستوں نے بھی کبھی بھوک کی شدت میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے ہیں؟'' (النبی الخاتم: ص ۱۰۲)

تعدد ازدواج کے موضوع پر علمی بحوث اور فکری موشگافیاں ایک طرف اور علامہ گیلانی کی چند سطریں ایک طرف، ان سطروں میں دلیل کی جو قوت پنہاں ہے وہ عقل کو طمانیت اور فکر کو مشعل تسلیم ورضا سے اس قدر منور کرتی ہے کہ شکوک وشبہات اور کج فکری کی ساری ظلمتیں کافور ہوجاتی ہیں۔

''آخر میں ان تجربات کے سلسلہ میں نادر ترین تجربہ یہ ہے، اس کے بھی چند سال گذر چکے ہیں اور اب وہی جو عرب کے لئے بھی تھا، عجم کے لئے بھی تھا، مردوں کے لئے بھی تھا اور عورتوں کے لئے بھی تھا، زندگی کے آخری دنوں میں ارادہ فرمایا جاتا ہے کہ جس طرح مردوں میں قدوسیوں کی یہ آخری جماعت پیدا ہوگئی ہے سارے جہاں کی عورتوں کے لئے قیامت تک نسل انسانی میں جو عورتیں پیدا ہونے والی ہیں ان سب کے لئے، ان کی تعلیم کے لئے، تربیت کے لئے، ان کے نمونے کے لئے عورتوں کی بھی ایک جماعت تیار کی جائے۔'' (النبی الخاتم: ص ۱۰۶)

اس کے بعد ایک عظیم حکمت کی بازیابی اور ایک عظیم مفسدہ کی عقدہ کشائی مولانا گیلانی کے کلک عقدہ کشا نے کس طرح کی ہے اس کی سحر طرازی بھی ملاحظہ فرمائیں:

''یہ بھی ہوسکتا تھا کہ عورتیں خدمت مبارک میں اسی حیثیت سے رہتیں جس حیثیت سے مردوں کی ایک منتخب اور چیدہ جماعت ساتھ رہتی تھی لیکن دماغ کی بیداری کا یہ کیسا روشن تجربہ ہے کہ اس نے مصنوعی مذہبی مقتداؤں اور روحانی پیشواؤں کی ان مجرمانہ پیش قدمیوں کا راستہ ان عورتوں سے نکاح کر کے ہمیشہ کے لئے مسدود کردیا۔ ہیکل کی خدمت کے لئے عمران کی عورت نے ایک لڑکی پیش کی تھی، پھر دیکھو اس کنواری کی آڑ میں چرچوں پر، گرجاؤں پر، ان کے اماموں پر، خطیبوں پر، رہبانوں پر، بطریقوں پر کتنی کنواریاں روز بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ خدانخواستہ اگر کسی ایک اجنبی عورت کو نزدیکی وہ حیثیت دی جاتی جو باہر میں مردوں کو حاصل تھی تو کون اندازہ کرسکتا ہے کہ بعد میں آدم روابلیسوں کے ذریعہ قرب ونزدیکی کا یہ حیلہ کن خباثتوں اور شرارتوں کی بنیاد بن جاتا، جب کوئی نمونہ نہیں موجود ہے اس وقت تو بغیر نمونہ کے زندگی گذارنے والوں نے فتنے برپا کئے، خدانخواستہ اگر 'نیم بیضہ' بھی میسر ہوجاتا تو پھر سیخ میں

کتنے ہزار مرغ گتھے جاتے اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔'' (النبی الخاتم: ص ۱۱۰-۱۱۱)

''النبی الخاتم'' پر از اول تا آخر ایک نظر ڈالئے، آپ محسوس کریں گے کہ سیرت نگار نے سیرت نگاری کی عام روش سے ہٹ کر ایک انوکھی روش اختیار کی ہے اور ایک ایسی نرالی ڈگر اپنالی ہے کہ ان سے پہلے نہ کسی نے یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی نے اس شاہراہ پر چلنے کی ہمت کی۔ کتاب کے پرگواختصار کی بہم کردہ فنی آسودگی قاری کو حقائق کی بازیابی، تخیلات کی نکتہ سنجی، قلب غیور کی عزیمت نوازی، فکر روشن کی دروں بینی، جنون بے ریا کی جامہ دری، خرد مصلحت اندیش کی بخیہ گری، دربار رسالت کی دُرباری اور فکر وآگہی کی دیدہ وری تک آپ ہی رسائی کا مقدس فریضہ انجام دیتی ہے حالانکہ اطناب کے مقابلے میں ایجاز کا فن نسبتاً آزمائشی ہوتا ہے جس سے ہر شخص بہ کمال خوبی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

اسلوب کے لحاظ سے فنی نکات کو تراکیب کی بندش، الفاظ کے دروبست اور جملوں کی ساخت میں بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے تاکہ انسان کی رگ وپے میں خفیہ تخلیقی تحریک کو بالیدگی اور برانگیختگی کا سامان میسر آئے۔ مولانا گیلانی کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے متن کے ساتھ ساتھ تحت المتن کو مرکز توجہ ہی نہیں بلکہ نکتہ ارتکاز بنادیا ہے۔ یہ ایک منفرد تخلیقی تجربہ ہے جو متجسس افتادطبع اور عاشقانہ بصیرت کے عمل اور ردعمل کے نتیجہ میں وجود میں آیا اور ماہرانہ پیش قدمی اور محتاط تیز گامی نے سیرت نگاری کے میدان میں ایسی نظیر قائم کی ہے جو بے نظیر ہے۔ سیرت کے تمام تر حقائق اور احساسات و جذبات کے تمام تر لوازمات کے فنی دروبست کے ساتھ منظر نگاری، مرقع نویسی، لسانی ساخت، اسلوب اور لب ولہجہ کے متوازن اور متناسب اشتراک نے پوری کتاب کو ادب عالیہ کا شاہکار بنادیا ہے۔ اس کتاب کا ہر جملہ، مصنف کی تنقیدی بصیرت کا آئینہ دار، اس کی شدف نگاہی کا ارژنگ اور زبان وبیان پر اس کی خلاقانہ گرفت کا شاہد عدل ہے، تخلیقی حسیت اور ادبی بصیرت اس پر مستزاد۔

اب النبی الخاتم ہی کے ایک اقتباس پر جس میں جذبات کی شدت بھی ہے اور عقیدت کی حدت بھی، اذعان کا رکھ رکھاؤ بھی ہے اور عشق کی سرشاری بھی، فکر کی جدت طرازی بھی ہے اور خرد کی طرفگی بھی، طائر قلم کی زمزمہ سنجی اپنے اختتام کو پہونچتی ہے:

''جس طرح وہ بھیجا گیا، جن صفات وکمالات کے ساتھ بھیجا گیا، اسی شان، اسی آن کے ساتھ چمکتے ہوئے آفتاب اور دمکتے ہوئے سورج کی مانند ہم میں وہ اسی طرح موجود ہے، ہر جگہ موجود ہے، ہر خطہ میں موجود ہے، اس کا وجود مغرب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح مشرق میں وہ آب وتاب کے ساتھ چمک رہا ہے، شاہوں کے قصور اور غریبوں کے کلبہ ہائے دیجور دونوں کو روشنی بانٹ رہا ہے اور یکسانی کے ساتھ بانٹ رہا ہے، وہ سب کے لئے برابر ہے، سب کے لئے یکساں ہے، وہ فضا میں بھری ہوئی ہوا ہے جس میں سب سانس لیتے ہیں اور وسعت کون ومکاں کا وہ نور ہے جس میں سب چلتے ہیں، پلتے ہیں، پھولتے ہیں، پھلتے ہیں، یقیناً اس کی ضرورت جتنی چھٹی صدی کے باشندوں کو تھی اتنی ہی ضرورت اس وقت تک باقی ہے، پھر جب تک پیاس ہے پانی چھلکے گا اور جب تک بھوک ہے روٹی معدوم نہ ہوگی، آخر اس وقت تک کیا تھا جواب نہیں ہے۔'' (النبی الخاتم: ص ۱۲۱-۱۲۲)

ساڑھے چار سو عنوانات کے تحت ایک سو تینتیس صفحات پر پھیلی ہوئی سیرت کے موضوع پر شاہکار کتاب کی تھی یہ مختصر روداد ع

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

☆☆☆

خطبات مدراس علم وادب کا خزانہ

..... پروفیسر محمد حسان خان

میرے والد صاحب مولانا محمد عمران خان ندوی ازہریؒ کی زندگی اور شخصیت پر علامہ سید سلیمان ندویؒ کی محبت، شفقت، رہنمائی اور سایہ عاطفت کی ایک طویل داستان ہے، میں نے اس داستان کے بعض اجزاء خود والد صاحب کی زبانی سنے اور والد صاحب کی بعض تحریریں پڑھیں مثلاً والد صاحب نے لکھا کہ ''حضرت استاذ الاساتذہ اور عہد جدید کے معلم اول علامہ شبلی نعمانی کی فکری اور علمی امنگوں اور تمناؤں کو اگر مجسم کیا جائے تو ان کا نام سید سلیمان ندوی ہوگا، مولانا شبلی کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے اگر علماء وفضلاء کی پوری ایک جماعت ہوتی تو وہ کام نہ آسکتی تھی جو ایک فرد واحد سلیمان ندوی نے کیا، اس تحریر میں ایک جملہ یہ بھی ہے کہ''.....سیرۃ النبی کے ناتمام اوراق کو ماہ تمام بنا کر اسلامی علوم وفنون کا دائرۃ المعارف بنادیا۔''

سید صاحب کا بھوپال سے رشتہ ان کی حیات سلیمانی کا ایک اہم اور نمایاں باب ہے، اسکی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں، لیکن خاندان اور وطنی ان نسبتوں کی وجہ سے سید صاحب کی تحریروں کے متعلق کچھ لکھنا سعادت کے حصول کے علاوہ احسان شناسی کی بھی ایک شکل ہے۔

اردو سیرت النبی کے ادبی پہلو پر مطالعہ کرنے کے لئے نظر سب سے پہلے سیرت النبی کی طرف جاتی ہے، علامہ شبلی کی اس تالیف کو سید صاحب نے جس طرح مکمل کیا اس کے متعلق والد صاحب کا جملہ ابھی میں نے ذکر کیا کہ ناتمام اوراق کو ماہ تمام بنادیا، سیرۃ النبی کے متعلق ہم بھوپالیوں کے لئے فخر وناز کی بات یہ بھی ہے کہ اس شہرہ آفاق سیرت کی تالیف میں خادمة الملة النبوية مخدومة الأمة المحمدية، نواب سلطان جہاں بیگم تاج الہند فرمانروائے بھوپال کا نام بھی شامل ہے۔ سیرت النبی کی تالیف واشاعت کے لئے جب پچاس ہزار روپئے کی ضرورت پیش آئی تو بقول سید صاحب سیکڑوں مسلمان اس خدمت کے لئے آگے بڑھے، ان میں فقراء ملت بھی تھے اور امرائے ملت بھی لیکن یہ سعادت اخروی ازل سے ہی والیہ بھوپال کے لئے مقدر تھی وہ آگے بڑھیں اور سوانح نگار نبوت کو دوسرے استانوں سے بے نیاز کر کے اس سرمایہ سعادت کو اپنے خزانہ عامرہ میں شامل کرلیا۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں بھی سیرت النبی کے مطالعہ کو اولیت دیتا خصوصاً ان جلدوں کا مطالعہ جو سید صاحب کے علم و ادب کا خزانہ ہیں، لیکن میرے سامنے سید صاحب کی خطبات مدراس بھی تھی، جس کا مطالعہ ہمیشہ ہی اختصار وجامعیت کی وجہ سے میرے لئے زیادہ آسان اور اس بھی زیادہ رسول اللہ ﷺ

کی مکمل سیرت کے عطر کی حیثیت سے پر کشش رہا، ایک وجہ اور بھی ہے کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک قریبی اہل تعلق عبدالحفیظ صاحب مینار کو تحریر فرمایا کہ:

''اگر آپ سید صاحب کو دیکھتے تو ان کی بزرگی کی وجہ سے ان کے عاشق ہوجاتے ''خطبات مدراس کے متعلق تحریر فرمایا کہ ابتک میں ۴۰ بار پڑھ چکا ہوں لیکن سیری نہیں ہوئی.....''

اس کے علاوہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریر بھی خطبات مدراس کے میرے مطالعہ کی محرک رہی ہے، حضرت مولانا نے تحریر فرمایا ہے:

''میرے محدود علم میں کسی اسلامی زبان میں سیرت پر اتنی طاقتور، دل آویز، دل پذیر اور ایمان آفریں کتاب دیکھنے میں نہیں آئی، اس میں سیرت کے کتب خانے کا عطر آگیا ہے اور تاریخی حقائق، تقابلی مطالعہ، نفسیاتی تجزیہ، علم الاخلاق، علم الاجتماع اور پھر اپنی ادبیت اور خطیبانہ انشاء پردازی کی آمیزش سے اس کی افادیت اور اس کی علمی قدر و قیمت میں ایسا اضافہ ہوا ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں اور سلیم الطبع طالبان حق غیر مسلموں کو دینے کے لئے اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کا یہ جملہ بھی خطبات مدراس کی ادیبانہ خوبی اور انشاء پردازانہ خطابت کے حسن اسلوب کے لئے سننے کے لائق ہے وہ لکھتے ہیں:

''اس کی اصلی خوبی انشاء پردازانہ انداز بیان ہے، اس کا مطالعہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول صلعم کی زندگی کی مرقع آرائی کرنے میں حضرت سید صاحب کا قلم مانی کا موئے قلم بن گیا ہے اور آپ کی سیرت کی نقش آرائی میں بہزاد کی مصوری کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، اس کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے حضرت سید صاحب کی شیفتگی کے گنبد پنہائی پر ان کے سوز پنہاں کا چراغاں ہورہا ہے۔''

میں نے جب اس کتاب کا مطالعہ کیا تو ہمارے بزرگوں کے یہ اقوال حرف بحرف صحیح نظر آئے، خطبات مدراس کے بارے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ۱۹۲۵ء میں مدراس کی ایک اسلامی تعلیمی انجمن کی فرمائش پر سید صاحب نے سیرت کے موضوع پر آٹھ خطبے دیئے تھے اس کا مقصد یہ تھا کہ اس وقت مدراس یونیورسٹی کے طلبہ کے سامنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دین مسیحی کے موضوع پر ہر سال کوئی عیسائی مبلغ خطبہ دیتا تھا۔ یہ دیکھ کر بعض دردمند مسلمانوں نے یہ سوچا کہ حضور ﷺ کی سیرت پاک پر وقت کی زبان اور عصری ذوق کے مطابق ایسے خطبے دیئے جائیں جن سے نئی نسل کو تسلی بخش نور و سرور حاصل ہو، اس کے لئے سب سے پہلے ان مدراس والوں کی نظر جس اہم شخصیت پر پڑی وہ حضرت سید صاحب کی ہستی تھی، سید صاحب نے دو مہینوں میں وقفے وقفے سے آٹھ خطبے دیئے، ان کے عنوان اس طرح تھے۔

۱۔ انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء کرام کی سیرتوں سے ہوسکتی ہے۔
۲۔ عالم گیر اور دائمی نمونہ عمل صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے۔
۳۔ سیرت نبوی کا تاریخی پہلو۔
۴۔ سیرت نبوی کی کاملیت۔
۵۔ سیرت نبوی کی جامعیت۔
۶۔ سیرت نبوی کی عملیت۔
۷۔ اسلام کے پیغمبر کا پیغام۔
۸۔ ایمان و عمل۔

لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ یہ آٹھ تقریریں دراصل آٹھ

کتابیں ہیں، یعنی یہ خطبات صنعت ایجاز کا ایک نادر نمونہ ہیں، اگر ان کو صنعت اطناب میں منتقل کیا جائے تو ہر خطبہ ایک کتاب بن سکتا ہے۔

ان سب میں ایک منطقی ربط ہے یعنی ایک مضمون کو ختم کرتے کرتے قاری کو اس سے متعلق ایک اور مضمون کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اچانک وہی مضمون اس کے سامنے آجاتا ہے، خطبات مدراس، منطقی ترتیب کا نمونہ ہے، اس کے مضامین کیا ہیں اور کن کن شکلوں سے سید صاحب نے یہ مضامین باندھے ہیں؟ یہ سوالات ہیں، مگر اس وقت ہم صرف سیرت کی اس غیر معمولی کتاب کے صرف ادبی پہلو پر ہی گفتگو کر سکتے ہیں۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کا جملہ نقل کر چکا ہوں جس میں انھوں نے اس کتاب کی ادیبانہ خوبی اور خطیبانہ انشاء پردازی کی بات کی تھی۔

حقیقت یہی ہے کہ سید صاحب کے قلم نے تاریخ وسیر کی عکاسی میں ادب کی جس طرح آمیزش کی ہے وہ قابل داد ہے، مزید یہ کہ اس میں خطیبانہ آہنگ کو جس طرح شامل کیا ہے اس سے یہ خطبات بار بار پڑھنے کے لائق بن گئے ہیں، اب پہلے خطبہ کا یہ رنگ ملاحظہ کیجئے اس میں اسلوب لہجہ اور بیان کی کون سی ایسی دلکشی نہیں ہے جس سے عبارت شاہکار میں بدل جاتی ہے، لکھتے ہیں:

''بہرحال تاریخ کی دنیا میں ہزاروں لاکھوں اشخاص نمایاں ہیں جنھوں نے آنے والوں کے لئے اپنی زندگیاں نمونے کے طور پر پیش کی ہیں۔ ایک طرف شاہان عالم کے شان وشوکت کے دربار ہیں، ایک طرف سپہ سالاروں کی جنگی صفیں ہیں، ایک طرف شعراء کی بزم رنگین ہے، ایک طرف دولت مندی اور خزانوں کے مالکوں کی نرم گدّیاں اور کھنکھناتی تجوریاں ہیں، ان میں سے ہر ایک کی زندگی آدم کے بیٹوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کارتھیج کا کابنی ہال، مقدونیہ کا سکندر، یورپ کا نپولین ہر ایک کی زندگی ایک کشش رکھتی ہے، سقراط، افلاطون، جالینوس اور یونان کے دوسرے مشہور فلسفیوں سے لے کر اسپنسر تک تمام حکماء اور فلاسفوں کی زندگی میں ایک خاص رنگ نمایاں ہے۔ نمرود، فرعون، اور ابوجہل اور ابولہب کی دوسری شخصیتیں ہیں، قارون کی الگ زندگی ہے غرض دنیا کے اسٹیج پر ہزاروں قسم کی زندگیوں کے نمونے ہیں جو بنی آدم کی عملی زندگی کے لئے سامنے ہیں۔ لیکن بتاؤ کہ ان مختلف افراد میں سے کسی کی زندگی بنی نوع انسان کی سعادت وہدایت کی ضامن اور اس کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔

ان لوگوں میں بڑے بڑے فاتح اور سپہ سالار ہیں جنھوں نے اپنی تلوار کی نوک سے دنیا کے طبقے الٹ دیئے، لیکن کیا انسانیت کی فلاح وہدایت کی لئے انھوں نے کوئی نمونہ چھوڑا، کیا ان کی تلوار میدان جنگ سے آگے بڑھ کر انسانی اوہام وخیالات فاسدہ کی بیڑیوں کو بھی کاٹ سکی، انسانوں کے باہمی برادرانہ تعلقات کی گتھی سلجھا سکی، انسانی معاشرت کا کوئی خاکہ پیش کر سکی، ہماری روحانی مایوسیوں اور ناامیدیوں کا کوئی علاج بتا سکی، ہمارے اخلاق واعمال کا کوئی نقشہ بتا سکی۔''

یہ تو صرف ایک اقتباس ہے ورنہ جس جگہ نظر جاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ادب وانشاء کے موتی سیرت طیبہ کے بیان میں خود سے نچھاور ہوتے جارہے ہیں۔ سیرت سید صاحب کا محبوب ترین موضوع رہا ہے اور خطبات مدراس تو جیسے سیرت کے تمام باغوں کے پھولوں کا نچوڑ ہے، اس کی سرمستی کا پوچھنا ہی کیا، کسی صفحہ کو کھولئے تو کوئی نہ کوئی عبارت دامن دل کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔

تلوار کی دھار ہو کہ برچھی کی انی، بہرحال یہ آنی تکلیف

ہے اس سے زیادہ استقلال اور اس سے زیادہ صبر آزما آزمائش کی وہ زندگیاں ہین جو سالہا سال حق کی مصیبتوں میں گرفتار ہیں، جنھوں نے آگ کے شعلوں اور گرم ریت کے فرش پر آرام کیا اور پتھر کی سلوں کو اپنے سینے پر رکھا، جن کے گلے میں رسیاں ڈال کر گھسیٹی گئیں، جب پوچھا گیا تو وہی محمد کا کلمہ ان کی زبانوں پر تھا، مضمون جاری ہے۔ خطابت کا جوش مدو جزر کے عالم میں ہے لیکن اب کی جوئے رواں بہر حال جاری ہے۔ آگے یہ جملے اچانک سامنے آجاتے ہیں..... گویا محمد رسول اللہ ﷺ کا وجود مبارک آفتاب عالم تاب تھا جس سے اونچے پہاڑ، رتیلے میدان، بہتی نہریں، سرسبز کھیت، اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق نور حاصل کرتے تھے ابر باراں تھا جو پہاڑ اور جنگل، میدان وکھیت وریگستان اور باغ ہر جگہ برستا تھا اور ہر ٹکڑا اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا تھا.....'' ان نیرنگیون کے ساتھ اور اس اختلاف واستعداد کے باوجود ایک چیز تھی جو مشترکہ طور پر سب میں نمایاں تھی وہ ایک بجلی تھی جو سب میں کوند رہی تھی، ایک روح تھی جو سب میں تڑپ رہی تھی، وہ بادشاہ ہوں یا گدا، امیر ہوں یا غریب، حاکم ہو یا محکوم، قاضی ہو گواہ، افسر ہون یا سپاہی، استاذ ہوں یا شاگرد، عابد وزاہد ہوں یا کاروباری، غازی ہوں یا شہید، توحید کا نور، اخلاص کی روح، قربانی کا ولولہ، خلق کی ہدایت اور رہنمائی کا جذبہ اور بالآخر ہر کام میں خدا کی رضا طلبی کا جوش ہر ایک کے اندر کام کر رہا تھا، وہ کچھ بھی ہوں، جہاں بھی ہوں، اور جو کر رہے ہوں، یہ فیضان حق سب میں یکساں اور برابر، افراد اور اشخاص میں رنگتوں اور مذاقوں کا اختلاف تھا، مگر خدا ایک تھا قرآن ایک تھا، رسول ایک تھا اور قبلہ ایک تھا۔''

یہ اقتباسات سیرت النبی کے مؤلف کی یاد دلاتے ہیں، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھوپال کے ایک سمینار میں فرمایا تھا کہ:

''خطبات مدراس میں حقیقتاً سیرت النبی کی جلدوں کا عطر کشید ہو کر آ گیا، مولانا عبد الماجد دریابادی نے لکھا تھا کہ مدیر معارف اور مصنف نقوش سلیمانی کی ذات اس کا حق رکھتی ہے کہ اس کے ادب پارے نصاب ادب کے مختلف کلاسوں میں داخل ہوتے اور تاریخ ادب کے اوراق میں اس کا نام ادب و احترام کے عنوان جلی کے ساتھ درج ہوتا۔

الغرض تاریخ وسوانح اور خطابت وانشاء کے اتنا گونا گوں جلوے سید صاحب کی کسی اور تصنیف میں یکجا نہیں ملتے۔ ادب اگر الفاظ کی شوکت، فقرون کی برجستگی، ترکیبوں کی چستی اور بیان کی دلکشی کا نام ہے تو جانشین شبلی کی اس کتاب کے ادبی مقام کا کون منکر ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

علم وادب

اظہر ندوی

علم و ادب کی قیمت سمجھی نہ جاہلوں نے
سر کو ہی بیچ ڈالا پائی جو دُم کی قیمت
انسان سب ہیں لیکن ہے فرق کتنا واضح
کیا اور طریقہ کیا فہم اور فراست
کتنا گراں ہے سونا لیکن جو دیکھئے تو
پیتل کی بھی وہی ہے سونے کی ہے جو رنگت
کیا اور لکڑیوں سے ممتاز لوگ سمجھیں
جلنے سے عود گر پھیلے نہ اس کی نکہت

عربی سے ترجمہ

النبی الخاتم میں مولانا گیلانی کا اسلوب نگارش

.....ڈاکٹر عبدالرشید ندوی مدنی

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی کتاب النبی الخاتم جو ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے دراصل ایک طویل مقالہ ہے جو ۱۹۳۶ء کو ماہ اپریل میں تحریر کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ جدید تحریک سیرت کے بانی عبدالمجید قرشی ایڈیٹر اخبار ''ایمان'' لاہور کی فرمائش پر لکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں ساڑھے چار سو عنوانات ہیں اور ان میں سے تین سو سے زائد عناوین کا تعلق جدید نظریات سے ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی بڑے فاضل، محقق اور وسیع النظر عالم ہیں ان کی متعدد تصانیف ان کے بحر العلم ہونے کی دلیل ہیں ان میں بالخصوص امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی، تذکرہ شاہ ولی اللہ، ابوذر غفاری، تدوین حدیث، اسلامی معاشیات اور الدین القیم، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ان کی وسعت نظر، کثرت مطالعہ اور علمی ذہانت کی گواہی دیتی ہیں لیکن النبی الخاتم ان کے برعکس ایک خاص کیفیت ایک خاص موڈ کی پیداوار ہے، مولانا منظور نعمانی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ:

''یہ کتاب اگرچہ سیرت پر لکھی گئی ہے جو تاریخ ہی کا ایک شعبہ ہے لیکن مصنف کا مقصد اس سے صرف سوانح نبویہ کی تدوین نہیں ہے اسی لئے واقعات میں تاریخی ترتیب کا التزام نہیں کیا گیا بلکہ ان کا مطمح نظر اس میں تبلیغ اور دعوت الی الحق ہے۔''

مولانا نے حضور اکرم ﷺ کی زندگی کے واقعات مربوط اور مسلسل درج کرنے کے بجائے صرف مخصوص پہلوؤں کا انتخاب کیا ہے اور بہت سی جگہ صراحت کی بجائے اشارات و کنایات سے کام لیا ہے۔ بنیادی طور پر النبی الخاتم ایک مقالہ ہے جو پھیل کر ایک کتاب بن گیا ہے۔ کتاب کی اولین اشاعت میں عناوین بھی موجود نہیں تھے لیکن بعد کی اشاعتوں میں عام قارئین کے لئے مولانا نے ہر پیرے پر عنوان قائم کر کے اور حاشیے میں بعض امور کی وضاحت کر کے بڑی حد تک اسے عام فہم اور قابل قبول بنا دیا۔

النبی الخاتم کو مصنف نے دو پہلوؤں پر منقسم کیا، ایک مکی زندگی اور دوسرے مدنی زندگی۔ اول الذکر کی زندگی سے تعبیر کیا تو مؤخر الذکر کو دماغ کی زندگی قرار دیا۔ یہ ایک دلچسپ نقطۂ نظر ہے کہ دراصل مکی زندگی دعوت و تبلیغ کی اساس ہے جس کا تعلق واردات قبیلہ سے ہے جبکہ مدنی سیاسی اور عمرانی زندگی ہے جس کی گتھیاں سلجھانے کے لئے دماغ سوزی اور گہرے فکر و خیال کی ضرورت ہے۔

اس کتاب میں مولانا کا انداز بیان ایک جوشیلے خطیب کا سا ہے جو جم غفیر کے سامنے منبر پر بیٹھے سامعین کو جھنجھوڑ رہا ہے۔

کتاب کا آغاز ''زندہ نبی'' کے عنوان سے ہوتا ہے لکھتے ہیں کہ:

''یوں آنے کو تو سب ہی آئے، سب میں آئے، سب جگہ آئے (سلام ہو ان پر) بڑی کٹھن گھڑیوں میں آئے، لیکن کیا کیجئے کہ ان میں جو بھی آیا جانے ہی کے لئے آیا، پر ایک اور صرف ایک جو آیا اور آنے ہی کے لئے آیا، وہی جو اگنے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا، چمکا اور چمکتا ہی چلا جا رہا ہے، بڑھا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، چڑھا اور چڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔''

خطابت کا یہی انداز پوری کتاب میں اپنایا گیا ہے۔ مکی زندگی والے حصے میں آنحضرت کی ولادت کے وقت ہندومت، بدھ مت، پارسیت، یہودیت اور عیسائیت کو مردہ مذاہب قرار دیتے ہوئے پہلے حضرت مسیح علیہ السلام، مہاتما بدھ اور اسرائیلی انبیاء کی ان پیشن گوئیوں کو دھرایا گیا ہے جو انہوں نے آنحضرت کی آمد کے بارے میں کہیں جو مذہبی صحائف میں موجود ہیں اس کے علاوہ آنحضرت کے والد، والدہ اور دادا کی یکے بعد دیگرے وفات کو بھی حکمت الٰہی سے تعبیر کیا ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ آنحضرت نے ابو طالب پر بوجھ بننے کے بجائے ان کی معاشی تنگی میں بکریاں چرا کر ہاتھ بٹایا، پھر حلیمہ سعدیہ کی رضاعت عہد طفلی، جوانی، نکاح، غور و فکر کی زندگی، وحی، دعوت دین، مصائب صحابہ، ہجرت حبشہ، ترغیب و ترہیب، شعب ابی طالب کی ایذا رسانی، یثرب کے انصار کا ایمان لانا اور ہجرت مدینہ وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

مدنی زندگی کے اہم واقعات میں مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر، تحویل قبلہ، سلسلہ مواخات، یہودیوں کی سازشیں، غزوات، امن و امان کی زندگی، وفات، نجی زندگی، عورتوں سے عادلانہ سلوک، قریبی اعزاء اور ازواج سے محبت، صحابہ کرام کی خصوصیت، مسئلہ ختم نبوت اور اسلام کی برکات کا اس والہانہ انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔

مصنف نے جابجا آنحضرت کی نبوت کے اثبات کے لئے تورات، انجیل، مہاتما بدھ کی تعلیمات اور ویدوں کے اقتباسات دے کر واضح کیا ہے کہ آپ کی دنیا میں تشریف آوری امر الٰہی تھی جس کی بشارت اللہ تعالیٰ کے فرستادوں نے دی۔

مزاج کی اضطرابی کیفیت کی وجہ سے مولانا کے پاس تصنیفی منصوبہ بندی یا ترتیب مضامین مفقود ہیں وہ اکثر لکھتے لکھتے موضوع سے ہٹ جاتے ہیں اور ضمنی بحثوں میں چلے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ جملوں کی موضوع نشست و برخاست اور لفظی تراش و خراش کے بھی زیادہ قائل نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مکتوب میں حضرت سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کو لکھا:

''ایک دفعہ جھونک میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو لکھتا چلا جاتا ہوں، پھر اس کی نظر ثانی، چوک و اصلاح میرے لئے مشکل ہوتی ہے، میں چھاپنے والوں پر چھوڑ دیتا ہوں کہ خرافات کو حذف کر کے کارآمد اجزاء کا انتخاب کر لیں۔'' (بزم رفتگاں: ص، ۲۰۴)

یہ ضرور ہے کہ ان کے مضامین میں تہذیب و تنظیم کے بجائے ایک قسم کا انتشار ہوتا ہے جو دراصل ان کی علمی شوریدگی کا نتیجہ ہے اس کے باوجود ان کی کوئی تحریر ایسی نہیں جو فکر و نظر کی گہرائی اور وسعت سے خالی ہو یا جس میں ان کی غیر معمولی ذہانت اور بصیرت نمایاں نہ ہو۔ وہ ایک واقعہ کی سچائی اس کی حقیقت اور اس کی منظر کشی اس طرح اور اس درد کے ساتھ کرتے ہیں کہ قاری اس درد میں شریک ہو جاتا ہے۔ اللہ کے رسول کی خلوت گزین اور سادہ زندگی کا ذکر ملاحظہ ہو ان کا یہ اقتباس:

''جب وہ ہفتوں، عشروں غاروں میں دن ہی نہیں بلکہ ڈراؤنی اور بھیانک راتیں گذارتا تھا، سانپوں اور بچھوؤں، درندوں اور موذیوں سے بھرے ہوئے پہاڑوں وادیوں میں اس کو ان ہی چیزوں کے لئے

جانے کی کیا ضرورت تھی جو مخملی طنفسوں، ریشمی قالینوں، عبقری گدوں، مزرکش چھپرکٹوں پر بے فکر و تردد اگر وہ چاہتا تو بہ آسانی یوں بھی مل سکتی تھی اور وہ تو ملی ہوئی تھی لیکن اس نے بجائے ایرانی، زرابی، رومی، نمارق کے زمین اور کھلی زمین کے پتھریلے فرش کو اپنا بچھونا اور خارا پتھروں کو اپنا تکیہ بنایا، بی بی کی عصمت کا پتہ بیچارگی میں نہیں چلتا، چارہ ہو اور عصمت ہو عصمت اسی کا نام ہے خاک کے فرش کے سوا جس کے پاس کوئی فرش نہیں وہ اگر خاک پر سویا تو کیا خاک سویا جو تخت پر سو سکتا تھا، وہ مٹی پر سویا اس کا سونا ایسا خالص سونا ہے جس میں کھوٹ نہیں ہے۔'' (النبی الخاتم: ص، ۶۶)

لگتا ہے وہ خالی اوقات میں سوچا کرتے اور جب لکھنے بیٹھتے تو سفینہ ان کے علم سینہ کا متحمل نہیں ہوتا تھا وہ اپنے غور و فکر کے سارے نتائج کسی نہ کسی شکل میں ان لوگوں تک پہونچا دینے کی کوشش کرتے تھے، سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ:

''النبی الخاتم..... ایک گلدستہ عقیدت ہے جس کو مناظر احسن کے عقیدت مند قلم نے سجایا ہے اس میں مولانا نے اپنے خاص والہانہ رنگ میں سیرت پاک کے واقعات کو ایک خاص انداز اور ترتیب کے ساتھ پیش کر کے نہایت لطیف نتائج پیدا کئے ہیں اس حیثیت سے یہ اپنے طرز میں منفرد ہے کہ تاریخی واقعات کو دلچسپی بیان کے ساتھ اس طرح نبھایا گیا ہے کہ ناقد مؤرخین اور ارباب وجد و حال دونوں اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اٹھا سکتے ہیں۔ زبان صاف و سادہ لیکن صنائع لفظی سے مالا مال ہے۔''

ملاحظہ ہو ایک اقتباس جو حضور آزمائے گئے طریقوں کا اظہار ہے:

''سلبی یا ایجابی کون سی شکل باقی رہی جس 'معیار' پر سچائی کی یہ لاہوتی حقیقت نہ پرکھی گئی، 'زر' لے کر دوڑے، 'زمین' لے کر دوڑے، 'زن' لے کر دوڑے، الغرض جو کچھ سوچا جا سکتا ہے ہر ایک سے رگڑ رگڑ کر، گھس گھس کر انھوں نے جانچا لیکن انھوں نے 'صدق و امانت' کے احساس کی وہی گرفت جو دعوے سے پہلے ان کے دلوں پر مسلط تھی کسی تدبیر سے ڈھیلی نہیں پڑتی تھی، اس میں کیا ہے، اس کے اندر کیا ہے؟ مال ہے، جاہ ہے، یا کچھ اور ہے اور ہر سوال کی سلائیاں لمبی لمبی سلائیاں ڈال ڈال کر ہر ایک نے دیکھا، بار بار دیکھا، لیکن 'سچ' کے سوا اس میں کچھ نہیں ہے، اخلاص کے سوا اس میں کچھ نہیں ہے۔''

آپ ﷺ کے سفر طائف سے واپسی پر دردبھری دعا کو مولانا نے اپنے الفاظ کے قالب میں ایسا ڈھالا کہ وہ ہر قلب کی صدا بن گئی:

''میرے اللہ تیرے پاس اپنی بے زوری کا شکوہ کرتا ہوں تیرے آگے اپنے وسائل و ذرائع کی کمی کا گلہ کرتا ہوں، دیکھ، انسانوں میں میں ہلکا کیا گیا، لوگوں میں یہ میری کیسی سبکی ہو رہی ہے، اے سارے مہربانوں میں سب سے مہربان مالک، میری سن، میرا زور، میرا رب ہی تو ہے، مجھے تو کن کے سپرد کرتا ہے جو ہم سے دور ہوتے ہیں، مجھے ان کے نزدیک کرتا ہے، یا تو نے مجھ کو میرے سارے معاملات کو دشمنوں کے قابو میں دے دیا، پھر بھی اگر مجھ پر تیرا غصہ نہیں ہے تو مجھے ان باتوں کی کیا پرواہ مگر کچھ بھی ہو میری سمائی تیری عافیت ہی کی گود میں ہے، تیرے چہرے کی وہ جگمگاہٹ جس سے اندھیریاں روشن بن جاتی ہیں، میں اسی نور کی پناہ میں آتا ہوں کہ اس سے دنیا و آخرت کا سدھار ہے، مجھ پر تیرا غصہ بھڑکے اس سے پناہ مانگتا ہوں، مجھ پر تیرا

غضب ٹوٹے اس سے تیرے سایہ میں آتا ہوں، منانا ہے اس وقت تک منانا ہے جب تک تو راضی نہ ہو، نہ قابو ہے، نہ زور ہے مگر علی وعظیم اللہ ہی ہے۔'' (ص،۱۰۲)

پھر اس کے معاً بعد آپ کے رحمۃ اللعالمین ہونے کا ثبوت ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''دیکھو جس کو جبال ملے، ملک الجبال ملا، وہ اپنی قوت سے کیا کام لیتا ہے، جنھوں نے اس کو ہلکایا، ان پر ان کی زندگی کو وہ بھاری کرے گا، چاہتا تو یہ کرسکتا تھا اور اس کو حق تھا کہ جنھوں نے اس کو پتھراؤ کیا تھا ان کو سنگسار کرے، اس نے طائف سے نکل کر جو کچھ کہا تھا، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا تھا، لیکن جنھوں نے اس کے ساتھ وہ سب کچھ کیا تھا جو وہ کرسکتے تھے تو پھر غور کرو، اس کے متعلق اس نے کچھ بھی کہا، جس قدر وہ نزدیک تھا اتنی نزدیکی جنھیں حاصل نہ تھی، جب ان کی آرزو نے نوح کا طوفان برپا کیا تو ان میں جو سب سے اونچا تھا، سمجھ سکتے ہو کہ وہ کیا کچھ نہ برپا کرسکتا تھا اور اب کس بات کی کمی تھی جو چاہے اب وہ کرسکتا تھا لیکن اسی تاریخ نے جس نے نوح کے طوفان، عاد کی آندھی، ثمود کے صیحہ، شعیب کے رجفہ، موسیٰ کے دریا کے واقعات کو محفوظ رکھا ہے اس نے رکارڈ کیا کہ پہاڑ کے فرشتے سے کہا جارہا ہے: میں مایوس نہیں ہوں کہ ان کی پشت سے ایسی نسلیں نکلیں جو اللہ ہی کی پوجا کریں۔''

مولانا کی النبی الخاتم میں بعض اوقات عبارت کے درمیان میں جملہ معترضہ آجاتا ہے اور وہ اتنا طویل ہوجاتا ہے کہ جملے کا باقی حصہ کہیں درمیان ہی میں دم توڑ رہا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس:

''مدینہ میں سب سے پہلا کام کیا گیا کہ مسجد نبوی بنائی گئی اور اس کے ساتھ 'صفہ' کا مدرسہ بنایا گیا، لیکن صرف مسجد نبوی بنائی گئی، اور مدرسہ بنایا گیا، مسجد اور مدرسہ کون نہیں بناتا اور کہاں نہیں بنتے پھر اس میں بڑائی کیا ہے، باوجود استطاعت وقدرت کے پختہ اینٹ کے اور پتھر سے نہیں بنائی گئی، بلکہ کھجور کے تنوں اور شاخوں اور کچی اینٹوں سے بنائی گئی، بلاشبہ اس میں یہ نمونہ ضرور ہے کہ مسلمان جس آبادی میں پہونچیں، سب سے پہلے، وہ اپنے گھر سے بھی پہلے، وہاں خدا کی عبادت کی مسجد کی نیو کھودیں کہ مسجد ہی اسلام کی میخ ہے، اسلامی آبادی بناتے ہوئے سب سے پہلے چاہئے کہ اس میخ کو ہر مسلمان اس جگہ گاڑ دے جہاں وہ آباد ہوتا ہے۔'' (ص ۸۸)

النبی الخاتم کی اصل خوبی اس کا پرجوش والہانہ اور ولولہ انگیز انداز بیان ہے کہا جاتا ہے کہ جوانی کے زمانے میں داستان امیر حمزہ اور واقدی کی تصانیف کا بڑے شوق سے مطالعہ کیا تھا۔ ابوالکلام آزاد کے الہلال نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، خود ان کا بیان ہے کہ وہ قاضی سلیمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین کے ممنون ہیں کیونکہ سیرت طیبہ کے بعض اہم رخ انھیں کے اشارے پر سامنے آئے۔ (مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں: ص ۶۸)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس کتاب کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا کہ:

''مولانا کی تصنیفات میں سے غالباً سب سے پہلے النبی الخاتم پڑھی۔ کتاب عجیب البیلے انداز میں لکھی گئی ہے، صحف سماوی کا انداز بیان، خطیبوں کا جوش و برجستگی، عشاق کی مستی اور وارفتگی، عقل و جذب کی لطیف آمیزش حسب معمول معمولی اور مشہور واقعات سے لطیف نکتے اور عظیم نتیجے نکالتے چلے جاتے ہیں اور اس سرعت و کثرت کے ساتھ کہ پڑھنے والا مصنف سے

شکایت کرنے لگتا ہے کہ

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

''مدنی زندگی کے شروع میں جو یہ دکھایا گیا کہ ھوانی علی الناس کے فریادی کو 'الناس' اور 'ناس' کے ساتھ جو کچھ ہیں سب پران کو وزن بخشا جارہا ہے یا طائف کی گلیوں میں جو رد کیا گیا تھا سلع کے دامن میں سب اسی پر رد کیے جارہے ہیں، بھوکوں کے لئے روٹی لے کر دوڑے آتے ہیں، پیاسوں کے لئے پانی لے کر دوڑے آتے ہیں، گاتے ہیں، بجاتے ہیں، باہم ایک دوسرے کو للکارتے ہیں، ابھی ابھی جس کو جمادی چٹانیں 'ھلم' الي يارسول الله کے ساتھ پکار رہی تھیں اس کو انسانی زبانیں آگے آگے بڑھ کر ٹھیک اس طرح: يارسول الله "هلم الي القوة و المنعة" عرض کرتے ہوئے جان حاضر کرتے ہیں، مال حاضر کرتے ہیں تو یہ مدینہ کا نہیں بلکہ قرن الثعلب کے موڑ پر طائف سے نکلتے ہوئے جس عمل کا ردعمل ''ملاء اعلیٰ'' سے شروع ہوا تھا۔ یہ اسی تسخیری قوت کا ظہور ہے جو 'مکہ' میں بھی ظاہر ہوا، 'ثور' میں بھی ظاہر ہوا، 'ثور' سے نکلنے کے بعد بھی ظاہر ہوا، 'قبا' میں بھی ظاہر ہوا، جہاں خالق کا جو دروازہ مخلوقات کے لئے بند تھا، صدیوں کے بعد پہلی دفعہ قبا کی مسجد بنا کر کھولا گیا تا کہ جس کسی کو جہاں کہیں زمین پر قابو بخشا جائے پہلا کام یہی کرے، اور اب مدینہ میں بھی اسی ردعمل کا ظہور ہو رہا ہے۔ آئندہ ہوتا رہے گا، اسی کا ظہور 'کوفہ' میں بھی ہوگا، 'دمشق' میں بھی ہوگا، 'بغداد' میں بھی ہوگا، 'غرناطہ' میں بھی ہوگا، 'قاہرہ' میں بھی ہوگا، 'غزنی' میں بھی ہوگا، 'دہلی' میں بھی ہوگا، اور کیا بتاؤں کہ کہاں کہاں ہوگا، کب تک ہوگا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابد تک اب تو صرف اسی کا ظہور ہے، اسی کی نمود ہے، اسی لئے 'مدنی زندگی' کے اصلی عناصر یہ واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہ تو 'مکہ' ہی کے آثار ہیں جنھیں تم اب 'مدینہ' میں دیکھ رہے ہو، بلکہ 'مدنی' زندگی میں تم کو وہ باتیں تلاش کرنی چاہئیں جن میں 'دل' سے زیادہ 'دماغ' کا 'اخلاق' سے زیادہ 'عقل' کا تجربہ ہو۔''

مولانا نے آپ ﷺ کی مدنی زندگی کو انسانیت کے لئے امن کا گہوارہ اور قیامت تک کے لئے انسانوں کو ایک نسخۂ کامیابی کا ضامن قرار دیتے ہوئے آپ کی عالمگیری پیغام امن واخوت کا اظہار جس البیلے انداز میں کیا ہے ملاحظہ ہو:

''اب دیکھو کہ جہاں انسان، مسجود ملائکہ انسان کی جان ایک مچھر اور مکھی سے بھی زیادہ قیمت نہیں رکھتی تھی اس کی جان تو بڑی چیز ہے اس کے کپڑے کا دھاگا بھی رات کی اندھیروں میں کوئی نکال نہیں سکتا۔ امن و امان کا دور دورہ ہے انسان زندگی کے جس آئین و دستور کا نقش مدینہ کے پرچم میں کاڑھا گیا تھا اس کے نیچے بے تابانہ چلے آتے ہیں، پھر کیا مدینہ میں جو پایہ تخت قائم ہوا، وہاں منبر کی جگہ تخت بچھایا گیا، وہی منبر ہے، وہی مسجد ہے، وہی جھونپڑے ہیں، وہی چمڑے کا اکہرا گدا ہے، نہ حاجب ہیں، نہ دربان ہیں، امیر بھی آتے ہیں اور غریب بھی آتے ہیں، دونوں کے ساتھ ایک معاملہ ہے، عجب دربار! سلاطین کہتے ہیں، شاہی دربار تھا، کہ فوج تھی، علم تھا، پولیس تھی، جلاد تھے، محتسب تھے، گورنر تھے، کلکٹر تھے، منصف تھے، ضبط تھا، قانون تھا، مولوی کہتے ہیں، مدرسہ تھا کہ درس تھا، وعظ تھا، افتاء تھا، قضا تھا، تصنیف تھی، تالیف تھی، محراب تھی، منبر تھا، صوفی کہتے ہیں، خانقاہ تھی، کہ دعا تھی، جھاڑ تھا، پھونک تھا، ورد تھا، وظیفہ تھا، ذکر تھا، شغل تھا، تخت تھا، گریہ تھا، بکا تھا، وجد تھا حال تھا، کشف تھا، کرامت تھی، فقر تھا، فاقہ تھا، زہد تھا، قناعت تھی، مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا، اس لئے کہ وہ سب کے لئے آیا تھا۔''

☆☆☆

''خطباتِ مدراس''
کا ادبی رنگ و آہنگ

.....عارف عزیز (بھوپال)

بیسویں صدی کے اوائل میں برصغیر کے ادبی اُفق پر جو ممتاز شخصیتیں جلوہ افروز ہوئیں، سید القلم علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴ء تا ۱۹۵۲ء) کو کئی پہلوؤں سے ان میں بلند مقام حاصل ہے، بالخصوص سید صاحب کے یہاں ایک نوع کی جامعیت اور علوم وفنون کا تنوع جمع ہوگئے ہیں، بے مثال سیرت نگار، عظیم مورخ، غیر معمولی عالم، ماہر فقیہ اور صاحبِ طرز ادیب و انشاء پرداز کی حیثیت سے انہوں نے جو کارنامے انجام دیئے بلاشبہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں، لیکن سیرتِ نبوی کے دائرہ کو رسول کریم ﷺ کی حیات، شمائل اور معمولات سے آگے بڑھا کر پیغام رسالت، تعلیماتِ نبوی اور احکامِ شرعی کے گونا گوں پہلوؤں تک وسیع کر کے سیرت کے مطالعہ کو ایک نئی جہت دینے میں سید صاحب کے قلم نے جو کردار ادا کیا وہ اپنی مثال آپ اور سیرت النبیؐ اس کا ایک شاہکار ہے، جس کو اہل نظر اسلامی علوم کی انسائیکلو پیڈیا بھی قرار دیتے ہیں، لیکن اِسی موضوع پر سید صاحب کی ایک ''خطباتِ مدراس'' حجم میں نہایت مختصر تاہم بڑی خوبی و ندرت کی حامل ہے، اس میں اختصار و جامعیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی سیرت ہی نہیں اس کے تاریخی پہلو، کاملیت، جامعیت اور عملیت کا احاطہ کر کے اسلام کے پیغام اور ایمان و عمل کو شیر و شکر کر دیا گیا ہے، سید صاحب کے نامور شاگرد اور معتبر ناقد مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے الفاظ میں:

> ''کسی اسلامی زبان میں سیرت پر اتنی طاقتور، دل آویز، دل پذیر اور ایمان آفریں کتاب دیکھنے میں نہیں آئی، اس میں سیرت کے کتب خانے کا عطر آ گیا ہے اور تاریخی حقائق، تقابلی مطالعہ، نفسیاتی تجزیہ، علم الاخلاق، علم الاجتماع اور پھر اپنی ادبیت اور خطیبانہ انشا پردازی کی آمیزش سے اس کی افادیت اور اس کی علمی قدر و قیمت میں ایسا اضافہ ہوا ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں اور سلیم الطبع اور جویائے حق غیر مسلموں کو دینے کے لئے اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں۔'' (مطالعہ سلیمانی: ص ۱۵)

یہ آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے جو علامہ نے مدراس مسلم

ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کی دعوت پر مدراس جا کر دیئے تھے۔ حقیقت میں ان خطبات کو سیرت نبویؐ کے جوہر کی حیثیت حاصل ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی یہ بھی فرماتے تھے کہ خطاب وتقریر سے پہلے ''خطباتِ مدراس'' کا مطالعہ موصوف کے لئے ایک نئی تحریک کا باعث ہوتا تھا۔ (۱۹۴۹ء میں بھوپال کی ایک تقریر سے)

مذکورہ خطبات میں سید صاحب علیہ الرحمہ نے یہ واضح کیا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں سے ہوسکتی ہے اور عالمگیر و دائمی نمونہ علمی صرف نبی کریمؐ کی سیرت ہے، کسی انسانی زندگی کا مکمل نمونہ اور ہر نقص سے بری ہونا، اُس وقت تک ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ اس انسان کی زندگی کے تمام پہلو سامنے نہ ہوں، رسول پاک ﷺ کی زندگی کا ہر لمحہ پیدائش سے وفات تک، اپنے عہد کے انسانوں کے سامنے رہا، آپؐ کی زندگی کو اس لئے بھی کامل قرار دیا گیا کہ اس میں تمام انبیاء کی خصوصیات جمع ہوگئی ہیں جن کو عملی شکل میں آپؐ نے کر کے دکھایا، اِسی لئے بحیثیت ایک عملی پیغمبر آپ کی حیاتِ طیبہ قرآنِ حکیم کی تفسیر ہے، دوسرے انبیاء کے پیغامات ایک مخصوص عہد اور قوم کے لئے تھے، اس لئے دائمی نہیں، وقتی تھے، لیکن آنحضرت ﷺ کا پیغام آخری اور پوری دنیا کے لئے ہے لہذا آپ کو رحمۃ للعالمین کہا گیا۔

''خطباتِ مدراس'' کے تیسرے ایڈیشن کے دیباچہ میں مصنف کتاب علامہ سید سلیمان ندوی خود فرماتے ہیں۔ ''خدائے تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان خطبات کو جو سرسری طور پر لکھے گئے، حد سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور مسلمانوں کے ہر طبقہ میں وہ یکساں ذوق وشوق کے ہاتھوں لئے گئے اور عقیدت کی آنکھوں سے پڑھے گئے، مدرسوں میں، اسکولوں میں، مجلسوں میں ہر جگہ پڑھے جاتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، یہ جو کچھ ہے خداوند تعالیٰ کا فضل وکرم ہے۔''

علمی دنیا کا اسے غیر معمولی تجربہ ہی کہا جائے گا کہ سیرت مبارکہ پر مذکورہ خطبات کو جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی وہ اس موضوع پر بعض دوسری ضخیم کتب کو میسر نہ آسکی۔ سید صاحب کوئی دوسرا تصنیفی کام نہ کرتے تو تنہا ''خطباتِ مدراس'' انہیں اردو کے بڑے ادیبوں کی صف میں جگہ دلانے کے لئے کافی تھے، ان کے قلم سے اس سے پہلے اور بعد میں کئی کتابیں منظر عام پر آئیں لیکن سیرت پر مذکورہ خطبات میں قلم کی جو روانی بلکہ جولانی نظر آتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، یقیناً اس کی وجہ سے سید صاحب کی وہ خطیبانہ نثر ہے، جو قاری کے دل ودماغ پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ عربی اور انگریزی میں ان خطبات کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

سید صاحب نے مذکورہ خطبات کے عنوانات بھی مقرر کئے ہیں، جن پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آٹھ تقاریر نہیں سیرت پر الگ الگ کتابیں ہیں، کوزے میں سمندر کی طرح جن میں سیرت پاک کے خزینہ کو جمع کر دیا گیا ہے، ان خطبات میں شگفتگی، حلاوت، دلکشی اور حسنِ انشا کے جو نمونے ہیں وہ ادبِ عالیہ میں شمار ہوسکتے ہیں، یہ علامہ شبلی نعمانیؒ، مہدی افادی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم کا امتیاز تو تھا، سید صاحب کی دوسری تصانیف میں عام طور پر یہ رنگ نہیں ملتا کیونکہ ان کے اسلوب کے بنیادی عناصر اعتدال وتوازن اور عالمانہ وقار ہے جو ''خطبات مدراس'' میں رسول اللہ کی حیات وکارناموں کی مرقع آرائی میں تبدیل ہوکر بہزاد کی مصوری میں تبدیل ہوگیا ہے۔

''خطباتِ مدراس'' کے پہلے خطبہ کا عنوان ہے ''انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرتوں سے ہوسکتی ہے'' دوسرے خطبہ میں ''عالمگیر اور دائمی نمونہ عمل، صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے'' کو موضوع بنایا گیا ہے، تیسرا

خطبہ ''سیرت نبوی کے تاریخی پہلو''، چوتھا ''سیرت نبوی کی کاملیت''، پانچواں ''سیرت نبوی کی جامعیت''، چھٹا ''سیرت نبوی کی عملیت''، ساتواں ''اسلام کے پیغمبر کا پیغام'' اور آٹھواں ''ایمان وعمل'' پر مشتمل ہے، مذکورہ خطبات کے مطالعہ سے ان میں ایک واضح ربط اور منطقی تسلسل نظر آتا ہے اور یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ انھیں سرسری طور پر نہیں، گہرے غور وفکر کرنے کے بعد قلم بند کیا گیا ہے، ڈیڑھ سو صفحات کی اس مختصر کتاب میں نہایت دلنشیں پیرایہ اور دلائل کی روشنی میں سید صاحب علیہ الرحمہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ ختم المرسلین کے سایہ رحمت کے بغیر انسانیت کی تکمیل ممکن نہیں اور نہ عالمِ انسانیت کو فوز وفلاح حاصل ہوسکتی ہے، ''خطباتِ مدراس'' میں ادب وانشاء کے جو لعل وگوہر موجود ہیں ان کا تفصیلی جائزہ اس موقع پر ممکن نہیں، تاہم کچھ عبارتوں کے اقتباسات سے اس کا لطف لیا جاسکتا ہے مثال کے طور پر پہلے خطبے میں جس کے موضوع کا ذکر گزر چکا، سید صاحب لکھتے ہیں:

''کارتھیج کانی بال، مقدونیہ کا سکندر، روم کا سیزر، ایران کا دارا، یورپ کا نپولین، ہر ایک کی زندگی کشش رکھتی ہے، سقراط، افلاطون، ارسطو، دیوجانیس اور یونان کے دوسرے مشہور فلسفیوں سے لے کر اسپنسر تک تمام حکماء اور فلاسفروں کی زندگیوں میں ایک رنگ نمایاں ہے، نمرود و فرعون اور ابوجہل وابولہب کی دوسری شخصیتیں ہیں، قارون کی ایک الگ زندگی ہے۔

غرض دنیا کے اسٹیج پر ہزاروں قسم کی زندگیوں کے نمونے ہیں جو بنی آدم کی عملی زندگی کے لئے سامنے ہیں لیکن بتاؤ کہ ان مختلف اصناف انسانی میں سے کس کی زندگی نوع انسانی کی سعادت، فلاح اور ہدایت کی ضامن اور کفیل اور اس کے لئے قابل نمونہ ہے۔

ان لوگوں میں بڑے بڑے فاتح اور سپہ سالار ہیں، جنہوں نے اپنی تلوار کی نوک سے دنیا کے طبقے الٹ دیئے ہیں، لیکن کیا انسانیت کی فلاح وہدایت کے لئے انہوں نے کوئی نمونہ چھوڑا، کیا ان کی تلوار کی کاٹ میدان جنگ سے آگے بڑھ کر انسانی اوہام وخیالاتِ فاسدہ کی بیڑیوں کو بھی کاٹ سکی؟ انسانوں کے باہمی برادرانہ تعلقات کی گتھی بھی سلجھا سکی؟ انسانی معاشرت کا کوئی خاکہ پیش کرسکی؟ ہماری روحانی مایوسیوں اور ناامیدیوں کا کوئی علاج بتاسکی؟ ہمارے دلوں کی ناپاکی اور زنگ کو مٹاسکی؟ ہمارے اخلاق اور اعمال کا کوئی نقشہ بناسکی؟ (خطبات مدراس، ص۱۴-۱۵)

''خطبات مدراس'' میں ایسی کئی عبارتیں ہیں جن کے مرصع ومسجع جملے شعر کا لطف دیتے ہیں، اس کا جائزہ لینے کے لئے ہر خطبے سے عبارتیں پیش کرنا چاہئے لیکن صفحات اور وقت کی کمی اس میں مانع ہے، لہذا سیرت نبوی کی جامعیت کے خطبہ کے ایک اقتباس پر اکتفا کرتا ہوں، سید الطائفہ سید صاحبؒ فرماتے ہیں:

''.....کامل اخلاق کا مجموعہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے، اگر دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو۔ اگر غریب ہو تو شعبِ ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال پڑھو، اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو، اگر فاتح ہو تو بدر وحنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ، اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکہ اُحد سے عبرت حاصل کرو، اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفہ کی درسگاہ کے معلم قدس کو دیکھو، اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ، اگر واعظ وناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگر تنہائی و بے کسی کے عالم میں حق کے منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو

مکہ کے بے یارو مددگار نبی کا اسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہو، اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو، اگر یتیم ہو تو عبداللہ و آمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو، اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کو دیکھو، اگر تم جوان ہو تو مکہ کے چرواہے کی سیرت پڑھو، اگر عدالت کے قاضی اور پنچایتوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نور آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجر اسود کو کعبہ کے ایک گوشہ میں کھڑا کر رہا ہے.....اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہؓ اور عائشہؓ کے مقدس شوہر کی حیاتِ پاک کا مطالعہ کرو، اگر اولاد والے ہو تو فاطمہؓ کے باپ اور حسنؓ اور حسینؓ کے نانا کا حال پوچھو، غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو، تمہاری زندگی کے لئے نمونہ اور تمہاری سیرت کی درستی و اصلاح کے لئے سامان، تمہارے ظلمت خانہ کے لئے ہدایت کا چراغ اور راہنمائی کا نور محمد رسول اللہ ﷺ کی جامعیت کبریٰ کے خزینہ میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔'' (خطباتِ مدراس صفحہ ۷۴-۷۵)

ادب کی ایک خوبی ایجاز و اختصار ہے۔ ''خطبات مدراس'' ادبی پیرایہ بیان کے ساتھ ایجاز و جامعیت کا بھی ایک شاہکار ہے، جس میں ختم المرسلین ﷺ کی حیات، کارنامے اور پیغام کو فاضل مصنف نے صرف ڈیڑھ سو صفحات میں سمیٹنے کی سعی کی ہے اور فضول عبارت آرائی یا الفاظ کے گورکھ دھندوں سے دامن بچا کر نفسِ موضوع کو ابھارنے اور قاری کے دل و دماغ کو اس سے محظوظ کرنے پر قلم کا زور صرف کر دیا ہے، یہ خطبات جہاں علم کا خزانہ ہیں، وہیں ادب کی حلاوت، زبان کی چاشنی اور سلاست و روانی کا بھی اعلیٰ مظہر ہیں۔

☆☆☆

غزل

رضوانؔ فاروقی الہ آبادی

وقف ہیں دیدۂ پاک ہی کے لئے
ان کے جلوے نہیں ہر کسی کے لئے

کیا ٹھہرتی نظر پیکرِ یار پر
حسن ان کا ہے یا پاکیزگی کے لئے

خود کو پنہاں حجابات میں کر لیا
ڈال اک نظر دلدہی کے لئے

تجھ سے ممکن ہو تو عکسِ انوار سے
لے لے کچھ دل کی تابندگی کے لئے

حسنِ خلوت بھی ہو، حسن جلوت بھی ہو
حسن ہی حسن ہو زندگی کے لئے

وہ ترے دست و پا چشم بن جائیں گے
بندگی سیکھ لے داوری کے لئے

بندگی ہو کہ رضوانؔ ہو زندگی
سب اسی کے لئے، سب اسی کے لئے

☆☆☆

حیاتِ رسول امی (ﷺ)..... ایک جائزہ

.....ابوسفیان اصلاحی

سیرت پاک ایک ایسا موضوع ہے جس پر مسلمین اور مستشرقین کی جانب سے تصانیف اور مقالات کا ایک انبار وجود میں آ گیا، اور یہ ایسا سلسلہ ہے جسکی انتہا وانقطاع ناممکنات میں سے ہے، احادیث کے علاوہ قدیم ماخذ ومصادر اتنے ہیں کہ عقل انسانی دنگ رہ جائے!۔ یہ لامتناہی سلسلہ دو چیزوں کا غماز ہے ایک تو موضوع کی عظمت واہمیت اور دوسرے سیرت پاک سے عقیدت وانسیت، اسی سلاسل زریں کی ایک قابل قدر کڑی ''حیات رسول امیؐ'' ہے جس کے مصنف تلمیذ مولانا امین احسن اصلاحی جناب خالد مسعود (متوفی ۲۰۰۳) ہیں۔ جنھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے .M.Sc کی ڈگری حاصل کی اور کنگز کالج لندن سے کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ کیا، ۱۹۵۸ء میں مولانا امین احسن اصلاحی کے حضور زانوتلمذتہہ کیا تاکہ قرآنیات اور اسلامیات کا سنجیدگی سے مطالعہ کرسکیں، اسے یوں بھی کہئے کہ انھوں نے خود کو مکتب فراہی سے وابستہ کرلیا جس کی اساس اور بنیادی نقطۂ نظر ہے کہ تمام علوم وفنون کا مطالعہ قرآن کریم کی روشنی میں کیا جائے[۲]۔ چنانچہ جناب خالد مسعود صاحب نے مولانا حمیدالدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی تصانیف کا نہایت گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کیا۔ نیز فکر فراہی کی ترویج کے لئے کئی مقالات تحریر کئے اور مولانا فراہی کی کئی چیزوں کو اردو میں منتقل کیا۔ اسی فکر کی احیاء کے لئے ۱۹۸۱ء میں سہ ماہی مجلّہ ''تدبر'' شائع کیا جس کی ادارت آخری سانس تک انجام دیتے رہے۔

اس مضمون میں ''حیات رسول امیؐ'' کا ایک جائزہ پیش کیا جائے گا، خاکسار کو اپنے محدود مطالعہ کی روشنی میں کہنے کا مجاز ہے کہ عربی اور اردو میں موجودہ تمام سیرتی لٹریچر میں موضوع اور مباحث کے اعتبار سے اسے اولیت حاصل ہے۔ اس قابل قدر تصنیف میں قرآن کریم کی وساطت سے سرور کائنات ﷺ کا ایک مذکی ومصفی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ سیرت پاک سے متعلقہ آیات کریمہ کی جس انداز سے تفسیر وتوضیح کی گئی ہے وہ ایک انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔ اس عظیم کام کے منظر عام پر آنے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ تفسیر ''تدبر قرآنی'' کی تکمیل کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی سے التماس کی گئی کہ قرآن کریم کی روشنی میں سیرت پاک کو ترتیب دیا جائے، لیکن آپ عمر کے اس مرحلہ میں تھے جہاں اس مقدس فریضے کی تکمیل آپ کے بس سے باہر تھی۔ لیکن آگے چل کر آپ کے شاگرد وعزیز خالد مسعود نے اسے پائے تکمیل کو پہنچایا[۳]۔

یہ کتاب دراصل آیت کریمہ:

"قد أنزل الله إليكم ذكراً رسولاً يتلو عليكم

آیات اللّٰہ مبینات لیخرجکم من الظلمات إلیٰ النور" (الطلاق :۶۵/۱۰-۱۱)

اللہ نے تمہاری طرف ذکر اتارا یعنی رسول اللہ، جو اللہ کی واضح آیات تمہیں سناتا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے۔

کی تفسیر تشریح ہے۔ اسی آیت کی تفسیر حضرت عائشہؓ کا وہ جواب ہے۔ جب آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی قدر کے متعلق بتائیے تو آپ نے اس طرح جواب دیا!

"کان خلقه خلق القرآن" آپ کا طرز زندگی، طرز قرآن کے بالکل مطابق تھا۔

مذکورہ اسی خیال کے مختلف پہلوؤں کو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب پچاس ابواب پر مشتمل ہے جس کو اس طرح ملاحظہ کیا جاسکتا ہے!

(۱) تخلیق آدم اور منصب رسالت، (۲) نظام نبوت و رسالت، (۳) مرکز توحید کی تعمیر اور دعائے ابراہیم، (۴) بنی اسرائیل میں ایک عظیم رسول کی آمد کی خبر (۵) بنی اسماعیل کی تولیت بیت اللہ، (۶) بنی اسماعیل کو یہود پر ترجیح دینے کے اسباب، (۷) نبی موعود کی آمد، (۸) کار رسالت کے لئے تربیت، (۹) بعثت اور دعوت دین کا آغاز، (۱۰) قریش کی پریشانی اور مسلمانوں پر سختی، (۱۱) قرآن پر قریش کے اعتراضات، (۱۲) رسول اللہ کی شخصیت پر اعتراض، (۱۳) ہجرت حبشہ، (۱۴) اسلام سے قریش کی وحشت کے اسباب، (۱۵) طلب مدد کے لئے قریش کا یہود سے رابطہ، (۱۶) اہل کتاب پر تنقید، (۱۷) بنو ہاشم کا مقاطعہ اور دعوت مصالحت، (۱۸) قریش کے عذاب الٰہی کا انذار، (۱۹) غموں کا سال، (۲۰) رسول اللہ کے لئے بشارتوں کا دور، (۲۱) آخری انذار اور اعلان برأت، (۲۲) بیت عقبہ ثانیہ، (۲۳) ہجرت مدینہ، (۲۴) مدینہ میں ابتدائی مصروفیات، (۲۵) یہود سے خطاب اور مباحثہ، (۲۶) امت مسلمہ کا قیام، (۲۷) مدینہ کی حفاظت کی تدابیر، (۲۸) غزوۂ بدر کے اسباب و واقعات پر ایک نظر، (۲۹) حق و باطل کے درمیان پہلا معرکہ، (۳۰) دشمنان اسلام کی محاذ آرائیاں، (۳۱) اصلاحات کا دور اور یہود کا طرز عمل، (۳۲) قریش کی نئی مہم جوئی۔ غزوۂ احد، (۳۳) یہود بنی نضیر کی سرکوبی، (۳۴) غزوۂ احزاب، (۳۵) اہل ایمان کی کردار کشی، (۳۶) فتح مبین، (۳۷) معاہدۂ صلح کے ثمرات، (۳۸) رسول اللہ کی بعثت عام، (۳۹) معاہدۂ حدیبیہ کی منسوخی، (۴۰) فتح مکہ، (۴۱) غزوۂ حنین، (۴۲) غزوۂ تبوک، (۴۳) حج ۹ھ اور عام الوفود، (۴۴) ختم نبوت اور جمع و تدوین قرآن، (۴۵) حجۃ الوداع، (۴۶) بلند و برتر رفاقت کی جانب سفر، (۴۷) امہات المؤمنین، (۴۸) رسول اللہ کے فرائض اور ذمہ داریاں، (۴۹) رسول اللہ کے حقوق، (۵۰) اسوۂ حسنہ۔

مذکورہ تمام موضوعات کی توضیح و تبیین قرآن کریم، احادیث نبویہ اور دیگر سیرتی مآخذ کی مدد سے کی گئی ہے۔ ان موضوعات سے واضح ہے کہ سیرت پاک کے تمام پہلوؤں کا استقصاء کیا گیا ہے اور یہ تمام مباحث اور کرنیں سورۂ طلاق کی مذکورہ دو آیتوں اور حضرت عائشہؓ کے قول سے پھوٹتی ہیں، آیت میں جو "ذکرا رسولا" آیا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں دو رائیں پائی جاتی ہیں، ۵۔ کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ "ذکر" سے قرآن مراد ہے اور رسول اس کا بدل ہے، ۶، اور ایک طبقہ کا خیال ہے کہ "ذکر" سے رسول اللہ ﷺ ہی مراد ہیں۔ اس آیت کی خالد مسعود نے مناسب تفسیر کی ہے لکھتے ہیں:

"اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو ذکر یعنی قرآن مجید کے بدل کے طور پر پیش کیا ہے، گویا قرآن اور رسول حقیقت

میں ایک ہی ہیں: ایک الفاظ کی نقل میں ہے تو دوسرا انسانی جسم کی شکل میں ہے قرآن پڑھتے تو اس میں رسول اللہ ﷺ کی ذات و صفات، آپ کی بعثت کے کوائف، دعوتِ دین کے مراحل، ہجرت، جنگوں کے واقعات، مشرکین اور یہود کے ساتھ اہم بحثوں اور حضور کی زندگی سے متعلق دیگر موضوعات کا بیان ملتا ہے، ایک آدمی قرآن کا مطالعہ غور سے کرے تو وہ سیرت النبی کے تمام ضروری مباحث سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے اسی لئے یہ بات علمی حلقوں میں مانی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات پاک یا سیرت کا سب سے اہم مآخذ قرآن مجید ہے۔ اس کے بعد احادیث صحیحہ اور اولین کتب سیرت کا مطالعہ اس کے ماخذ کی حیثیت سے رہنمائی دیتا ہے۔ اس اعتراف کے باوجود عملاً یہ دیکھا گیا ہے۔ جدید سیرت نگاروں نے ماضی میں کی گئی کتب سیرت ہی پر اعتماد کیا ہے۔ جن لوگوں نے قرآن سے استفادہ کیا ہے وہ بالعموم محض آیات کو نقل کر دیتے ہیں ان سے سیرت نگاری میں مدد نہیں لیتے، اس لئے نقل کردہ آیات بے ربط سی نظر آتی ہیں۔'' ۷

یہ کتاب پچاس ابواب پر مشتمل ہے اور ان ابواب کو ۵۹۷ صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں بہت سی ایسی روایات کے سقم کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے جن کی سیرت پاک میں ایک مسلم حیثیت بن چکی ہے اس کتاب کی دو بحثیں خصوصی طور سے قابل ذکر ہیں ایک تو وہ بحث جن کا تعلق جنگوں سے ہے اور دوسرے جمع و تدوین قرآن کی بحث تو نہایت قیمتی ہے۔ یہ ایک ایسی بحث ہے جو انسانی ذہن کو مختلف شکوک و شبہات سے ہم کنار کرتی ہے۔ ترتیب قرآن کے باب میں بڑے بڑے علماء کرام الجھنوں کا شکار ہوئے، علامہ شبلی کا نقطۂ نظر بھی اس باب میں راست نہیں ہے۔ ۸ مشہور شیعی عالم سید علی تقی نقوی نے اپنی کتاب ''تحریف قرآن کی حقیقت'' میں قرآن کریم کو غیر محرف تسلیم کیا ہے لیکن ترتیب قرآن پر اس طرح سے بحث کی ہے کہ ذہنوں میں بہت سے تردد ات پیدا ہو جاتے ہیں، ۹۔ اس باب میں مولانا عبد اللطیف، رحمانی اور مولانا حمید الدین فراہی ۱۰ کے مباحث حد درجہ قابل اطمینان بخش ہیں۔ لیکن اس مسئلے کی مزید تنقیح خالد مسعود نے اس کتاب میں کر دی ہے۔

اس کتاب میں نظام نبوت و رسالت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرعون کے متعلق تحریر کیا گیا کہ ''فرعون بڑے جاہ و جلال والا تھا اور اپنے آپ کو خدا کا اوتار سمجھتا تھا، پورے ملک میں اس کے بت پوجے جاتے تھے اور عملاً اسی کو خدا سمجھا جاتا تھا۔'' ۱۱

قرآن کریم میں یہ وضاحت سے آیا ہوا ہے کہ خود کو فرعون رب اعلیٰ تصور کرتا تھا، لیکن اس نے خود کو اوتار قرار دیا ہو قرآن اس باب میں خاموش ہے۔

"فقال أنا ربكم الأعلىٰ" پھر کہنے لگا: میں ہی تمہارا رب اعلیٰ ہوں۔ (النازعات: ۲۴/۷۹)

اسی باب میں ایک اہم تاریخی نکتہ کی جانب اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تاریخ انسانی میں پہلی بار احکام الٰہی لکھے ہوئے عطا ہوئے'' ۱۲

اس میں مصنف نے اکثر یہ اہتمام کیا ہے کہ بہت سے تاریخی اور لغوی پہلوؤں کو واشگاف کرنے کی قابل قدر کاوش کی ہے۔ مثلاً ''بیت اللہ'' کے نام کے متعلق ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

''بیت ایل کے معنیٰ بیت اللہ کے ہیں۔ آثار و قرائن اس بات کے حق میں کہ ابراہیم علیہ السلام جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے وادئ بطحا میں پہنچے جہاں اس وقت مکہ مکرمہ واقع ہے۔ اس میں بیت اللہ بھی موجود ہے اور قربان گاہ حروہ بھی مکہ کا ابتدائی نام بکہ تھا جو بابلی زبان میں آبادی یا شہر کے معنی میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وادی میں حضرت ابراہیم کی آمد کے بعد

جو گھر آباد ہوئے ہوں گے ان کے لئے انھوں نے اپنے پہلے وطن اور وہاں کی زبان کے لحاظ سے نام 'بکہ' تجویز کیا گیا ہوگا جو امتداد زمانہ کے ساتھ مکہ میں بدل گیا، قرآن میں مکہ کے لئے یہی قدیم نام استعمال ہوا ہے۔''۱۳؎

خالد مسعود صاحب کے یہ خیالات دراصل مولانا حمید الدین فراہی کی معرکۃ الآرا تصنیف "الرأي الصحيح فيمن هو الذبيح" سے ماخوذ ہیں۔ مولانا فراہی چونکہ عبرانی زبان سے واقف تھے، توریت، زبور، اور انجیل کے مضامین پر گہری نظر تھی۔ اسی لئے ''سیرۃ النبی'' کی ترتیب کے وقت ''بکہ'' اور قربان گاہ ''حروہ'' کے باب میں علامہ شبلی نے مولانا فراہی سے بارہا استفسار کیا۔۱۵؎

اس کتاب میں بہت سے ایسے مسائل کا حل بھی پیش کیا گیا ہے جو طالبین قرآن کے لئے نہایت مفید ہے مثلاً قرآن کریم میں بنی اسرائیل سے لئے گئے عہد کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے!

"وإذ أخذنا ميثاقكم ورفعنا فوقكم الطور، خذوا ما آتيناكم بقوة واذكروا مافيه لعلكم تتقون" (البقرة:۲/٦٤)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے اوپر کوہ طور کو بلند کیا۔ (اور تمہیں حکم دیا کہ) جو چیز (کتاب) ہم نے تمہیں دی ہے اسے پوری قوت سے پکڑو اور جو کچھ اس میں موجود ہے اسے یاد رکھو (اس طرح) شاید تم بچ سکو۔

اس کتاب میں اس عہد کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا کہ یہ عہد کس مقام پر لیا گیا، رقم طراز ہیں:

''یاد رہے'' کہ حورب کوہ سینا کے دامن میں واقع اس کا نام ہے جہاں بنی اسرائیل عہد کے وقت جمع ہوئے تھے اور پہاڑ پر زلزلہ طاری کر دیا گیا تھا، اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل نے یہ التجا کی تھی کہ ان تک احکام پہنچانے کی یہ ہیبت ناک شکل آئندہ اختیار نہ کی جائے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام پر اعتماد کریں گے اور جو احکام دیں گے ان کو قبول کریں گے۔''۱۶؎

صاحب کتاب نے کچھ ایسے انکشافات کئے ہیں جو اہل علم کو چونکا دینے والے ہیں، یہ تو معلوم ہی ہے کہ عربوں میں بت پرستی تھی لیکن بت تراشی کے فن کا رواج نہ تھا۔ ایک صحابی ابو رجاء العطارودی کا بیان ہے کہ ہم لوگ کسی بھی پتھر کو اٹھا کر پوجنا شروع کر دیتے۔ اس کے بعد اس سے اچھا کوئی پتھر مل جاتا تو پہلے پتھر کو پھینک کر اس کی پوجا شروع کر دیتے۔۱۷؎

عربوں کے متعلق یہ مشہور ہے کہ بیٹیوں کو شئی نفرت تصور کرتے، اور اس کی پیدائش کو باعث اذیت اور باعث ذلت تصور کرتے، ارشاد ربانی ہے:

''وإذا بشر أحدهم بالأنثى ظل وجه مسودا وهو كظيم" (النحل :۱٦/٥٨)

اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو مارے غصے کے اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے۔

عربوں کے متعلق یہ بھی عام ہو چکا ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ اس کو قرآن کریم نے یوں ذکر کیا ہے۔

''وإذا الموءودة سئلت بأي ذنب قتلت" (التكوير: ۸۱/ ۸-۹)

(اور جب زندہ درگور لڑکیوں سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ میں ماری گئیں)

لیکن لڑکیوں کو باعث ننگ سمجھنے، اور انھیں زندہ درگور کرنے کا عمل تمام عربوں میں عام نہ تھا۔ بلکہ چند قبائل میں یہ مذموم فعل موجود تھا جس کی طرف اس کتاب میں اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اس موضوع پر عقاد نے سیر حاصل بحث کی ہے۔۱۸؎

بالعموم یہی مشہور ہے کہ حضرت ابو طالب نے آپ کی کفالت کی اور مختلف مواقع وعوارض میں رسول اللہ کی مساعدت کے لئے آپ تیار رہے۔ جبکہ آپ سے قبل کتب سیرت میں یہ صراحت ہے کہ عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے زبیر کو وصیت کی جنھیں اللہ کے رسول کی ذات سے بہت انس تھا۔ ۲۲/۲۳ سال کی عمر تک آپ نے آنحضورﷺ کی کفالت کی، حرب فجار میں آپ نے قائدانہ رول ادا کیا۔ معاہدہ حلف الفضول میں آپ کو امتیازی حیثیت حاصل تھی، ۱۹۔ ایک طویل عرصہ تک زبیر نے آپ کو ہر طرح کی سہولیات فراہم کیں لیکن انھیں عام سیرت کی کتابوں میں جو مقام پانا تھا وہ نہ مل سکا۔ بالخصوص مکاتب و مدارس میں سیرت پاک سے متعلق جو کتاب نصاب میں موجود ہے اس میں زبیر کا نام نہیں ملتا ہے۔

آنحضورﷺ کی بعثت سے قبل ''حنفاء'' کا ایک گروپ تھا جسے شرک اور دیگر فواحش ومنکرات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ خود آنحضورﷺ فطرت سلیمہ پر تھے اور آپ کو حقائق کی تلاش تھی ہر وقت صراط مستقیم کی تلاش وجستجو میں مضطرب رہتے اسی کو قرآنی کریم نے یوں ادا کیا ہے: "ماکنت تدری ماالکتاب ولا الإیمان (الشوریٰ:۴۲، ۲۵)

تم نہ کتاب کی حقیقت سے واقف تھے اور نہ ایمان کے بارے میں جانتے تھے۔

اسی مفہوم کو قرآن کریم نے دوسری جگہ یوں ادا کیا ہے:

"ووجدك ضالا فهدیٰ" (الضحیٰ:۹۳/۷) اس نے تم کو جویائے راہ پایا تو راستہ دکھایا۔

اس کتاب میں خالد مسعود نے تحریف توریت کا بھی مسئلہ اٹھایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''یہود کے علماء اپنی حسب منشا اس میں تحریف کرتے اور خلق خدا کو صراط مستقیم سے محروم رکھتے، علماء یہود کی اس حرکت پر اپنے دور نبوت میں سیدنا مسیح علیہ السلام کو یہ کہنا پڑا کہ چراغ اس لئے دیا جاتا ہے کہ اس کو چراغ دان میں رکھا جائے تا کہ اس کی روشنی چاروں طرف پھیلے، نہ اس لئے کہ اس کو پیمانے سے ڈھانپ دیا جائے، یہود کی اس حرکت کے باعث توریت کے بعض حصے تلف ہو گئے، ایک وقت آیا جب تورات گم ہو گئی۔ اس کو یادداشت کی مدد سے دوبارہ مرتب کیا گیا، چنانچہ نزول قران کے وقت تورات کے نام سے جو کچھ یہود کے پاس تھا وہ متضاد و متناقص روایات کا مجموعہ تھا۔ آج بھی تورات کو پڑھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی راوی اپنے الفاظ میں کتاب کی املا کرا رہا ہے۔، کہیں کہیں بعض اقتباسات ایسے ملتے ہین جن میں آسمانی کلام کا جمال وجلال نظر آتا ہے۔ توریت کی اس ہیئت کذائی کے باجود اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے رہنمائی کا کوئی متبادل انتظام نہ کرتا تو اس میں مخلوق خدا کی حق تلفی ہوتی۔'' ۲۰

سرسید احمد خان نے ''تبیین الکلام'' میں تحریف قرآن میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس بحث سے سرسید کی عالمانہ نظر اور مبلغ علم کو سمجھا جا سکتا ہے۔ سرسید توریت میں صرف معنوی تحریف کے قائل ہیں۔ لفظی تحریف کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن سرسید نے یہ اعتراف کیا ہے کہ دنیا میں صرف قرآن کریم ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جو تمام تحریفات سے پاک ہے۔ سرسید کی تحقیق وتشریح سے مجموعی تأثر یہی ابھرتا ہے کہ توریت میں تبدیلی ہوئی ہے۔ ۲۱

یہ پہلو بار بار اجاگر کیا جا چکا ہے کہ سیرت کے موضوع پر یہ ایک عدیم المثال کتاب ہے، اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں ان مکاتیب کو نقل کیا گیا ہے جو مختلف سلاطین کو اللہ کے رسول کی جانب سے ارسال کئے گئے، ان خطوط سے منصب رسالت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ خط ہر وقت کہاں دستیاب ہے؟

دوسرے سلاطین کے تأثرات کو بھی نقل کیا گیا ہے۔ مثلاً شاہ حبشہ نے آپ (ﷺ) کا مکتوب پانے کے بعد درج ذیل تأثرات کا اظہار کیا۔

''اس نامۂ مبارک کو عمرو بن امیہ الضمریؓ لے کر گئے، نجاشی نے مضمون سنا تو بے حد متأثر ہوا اس نے نامۂ مبارک کو بوسہ دیا اور سر پر رکھ لیا۔ اس کے بعد جواب میں لکھا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ میں نے آپ کے چچازاد بھائی (جعفر بن ابی طالب کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے اور اسلام میں داخل ہو گیا ہوں) میں آپ کی خدمت میں اپنے بیٹے کو بھیج رہا ہوں، اگر حکم ہوگا تو خود بھی حاضر ہو جاؤں گا۔''۲۲

اس کے علاوہ شاہ روم، حاکم مصر، پاپائے روم، شاہ فارس، گورنر یمامہ اور شاہ شام کے نام اللہ کے رسول ﷺ نے دعوت دین کے لئے خطوط لکھے۔

یہ بات بھی آچکی ہے کہ بہت سی ایسی احادیث جو کتب سیرت میں جڑ پکڑ چکی ہیں۔ مثلاً حضرت ابوسفیانؓ کے قبول اسلام کے باب میں جو حدیث نقل کی جارہی ہے اس سے حضرت ابوسفیانؓ کا وقار مجروح ہوتا ہے اور اکثر سنی اور تمام تر شیعی مصنفین نے حضرت ابوسفیانؓ کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ اس حدیث پر خالد مسعود صاحب نے گفتگو کی ہے۔ جب حضرت ابوسفیانؓ کے سامنے اسلام پیش کیا گیا تو انھوں نے فرمایا:

''ابوسفیان نے کہا کہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، آپ کتنے حلیم و کریم اور درگزر کرنے والے ہیں بخدا میں ابھی تک اس معاملے میں پورے مطمئن نہیں ہوں،۔ اس جواب پر حضرت عباسؓ نے ابوسفیان سے کہا تمہارا ناس ہو اس سے پہلے کہ تمہیں قتل کر دیا جائے گواہی دیدو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''۲۳

حضرت عباسؓ کے مذکورہ کلمات پر صاحب کتاب نے یوں تبصرہ کیا ہے۔

''اس روایت میں ابوسفیان کو قتل کی دھمکی دے کر اسلام قبول کروانا دین سے ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے۔ ایسا کلام آنحضرت کی موجودگی میں نہیں ہوسکتا۔ مشرکین کے اسلام کے لئے جو ضابطہ تھا وہ سورہ برأت کی ابتدائی آیت میں بیان ہو چکا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ مشرکین کو چار ماہ کا نوٹس دیا جائے۔ اس کے باجود اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو وہ قتل کئے جاسکتے ہیں۔''۲۴

قبولیت اسلام کے سلسلے میں مصنف نے ایک دوسری روایت نقل کی ہے:

''اس کے برعکس حافظ ذہبی نے دوسری روایت نقل کی ہے، اس کی رو سے نبی ﷺ کے استفسار کے جواب میں ابوسفیانؓ کا جواب یہ تھا کہ میں نے اس جدو جہد میں اپنے معبودوں سے مدد طلب کی اور آپؐ نے اپنے خداوند سے۔ بخدا ایک بار بھی تو ایسا نہیں ہوا کہ ہمارا مقابلہ ہوا ہو اور آپؐ غالب نہ رہے ہوں۔ اگر میرے معبود برحق اور آپ کا خدا باطل ہوتا تو کبھی میں بھی آپ پر غلبہ پاتا۔ لہذا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ یہ روایت موقع ومحل کے مطابق صحیح معلوم ہوتی ہے۔''۲۵

پہلی روایت میں حضرت عباس سے جو کلمات نقل ہوئے ہیں وہ روح اسلام کے برعکس اور نقیض دعوت اسلام ہیں۔ دوسری روایت حقیقت اسلام سے لبریز ہے اور حضرت ابوسفیان کے کلمات صداقت سے مملو ہیں۔

اسی طرح حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے باب میں یہ روایت مشہور ہو چکی ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ ایک بار رسول اللہ کو قتل کے ارادے سے نکلے تو دوران راہ انھیں بتایا گیا کہ پہلے

اپنے گھر کی خبر لو کہ تمہاری بہن اور بہنوئی دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں.....اس پر دونوں کی اس قدر پٹائی کہ لہولہان ہو گئے، جب حالات کچھ سرد پڑے تو بہن نے سورہ طٰہٰ کے صفحات ان کے سامنے رکھ دیئے پڑھتے ہی ان کے دل کی کیفیت دل بدل گئی.....اس کے بعد تلوار لٹکائے ہوئے آنحضور ﷺ کے پاس گئے اور اسلام قبول کرلیا۔م

مذکورہ روایت پر مصنف نے کئی سوالات اٹھائے ہیں۔ ایک یہ کہ عرب کی قبائلی زندگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی شخص کا کسی شخص کو قتل کرنا آسان نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ حضرت عمرؓ کا ایک کمزور قبیلہ سے تعلق تھا اس لئے اس نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے ایک طاقت ور قبیلہ کے کسی شخص کے قتل کا ارادہ حضرت عمر نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ حضرت عمرؓ ایک زیرک اور جہاں دیدہ انسان تھے، تیسرے حضرت عمرؓ کے بہن اور بہنوئی کو اسلام قبول کئے ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے اس لئے اس وقت تک آپ دونوں کا اسلام پوشیدہ رہا ہو یہ ممکن نہیں ہے۔ چوتھے یہ کہ سورہ حدید کی آیات تلاوت کر رہی تھیں۔ یہ سورہ مدنی ہے ۶ھ میں اس کا نزول نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اور وجوہات بھی پیش کی گئی ہیں جن سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔ دوسری روایت جس کو مصنف نے قابل اعتبار قرار دیا ہے وہ درج ذیل ہے۔ ۲۷

''عامر بن ربیعہ حضرت عمرؓ کے خاندان کے حلیف تھے۔ ان کا کنبہ حبشہ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ عمر آ گئے اور کھڑے ہو کر تیاری کا سامان دیکھنے لگے، اب تک ان کا رویہ سخت رہا تھا اور انھوں نے اس کنبہ کو بہت تکلیفیں دی تھیں عمر پوچھنے لگے۔ اے ام عبداللہ! روانہ ہو رہی ہو؟ انھوں نے کہا ہاں: تم لوگوں نے سخت اذیتیں دی تھیں اور ہم پر ظلم ڈھایا۔ اب ہم اللہ کی زمین میں نکل جائیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ کوئی راہ کھولے۔ عمرؓ نے کہا اچھا اللہ تمہارا ساتھی ہو یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔ دل میں رقت طاری ہو گئی اور وہ اسی کیفیت میں وہاں سے چلے گئے صاف معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اس قبیلہ کی روانگی سے دلی صدمہ پہنچا ہے۔ ام عبداللہ نے اپنے شوہر کو بتایا کہ اگر آج تم عمر کو دیکھتے تو ان پر رقت اور غم کے اثرات دیکھتے۔ مجھے تو ان کے اسلام لانے کی امید پیدا ہو گئی ہے۔'' ۲۸

یہ سب منظر دیکھنے کے بعد حضرت عمرؓ رات میں کسی وقت مسجد حرام پہنچے، جہاں اللہ کے رسول نماز میں قرآن پڑھ رہے تھے۔ نماز کے ختم ہونے کے بعد آپؐ کے پیچھے پیچھے حضرت عمرؓ گئے اور اسلام قبول کرلیا۔'' ۲۹

مذکورہ روایت کو صاحب کتاب نے معتبر قرار دیا ہے کیونکہ اس میں فطرت انسانی کا حقیقی عکس موجود ہے، انسانی زندگی میں ایسے موڑ اکثر آتے ہیں جو انسان کی کایا پلٹ دیتے ہیں۔ ۳۰

اس کتاب میں کچھ مقامات ایسے ہیں جہاں پر تصوف کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مثلاً ''تحنث'' پر گفتگو کرتے ہوئے تصوف کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ تحنث دراصل دین ابراہیمی کا ایک طریقہ تھا کہ انسان جب ذہنی فکری، مسائل میں گھرتا تو کچھ دنوں کا کھانا پانی لے کر آبادی سے دور چلا جاتا، چنانچہ جب اللہ کے رسول ﷺ رسالت سے قبل مختلف الجھنوں کا شکار ہوئے تو سکون قلب کے لئے خورد و نوش کا سامان لے کر پہاڑ پر چلے گئے، غار حرا میں بسیرا کرتے اور جب سامان ختم ہو جاتا تو واپس آ جاتے اور پھر سامان لے کر واپس چلے جاتے، یہ عادت جو اللہ کے رسول کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھی بلکہ دین ابراہیمی کی روایات سے وابستہ دیگر حضرات بھی اس جادہ پر گامزن تھے۔ لیکن اس روایت کو تصوف سے جوڑنا بے معنی ہے۔ صاحب کتاب رقم طراز ہیں:

''تخت کے بارے میں یہ تصور درست نہیں ہے کہ یہ ریاضت، مجاہدہ اور مراقبہ قسم کی کوئی چیز ہے جو کاہنوں، جادوگروں اور نجومیوں کیتربیت کا حصہ ہوتی ہے اور جس کی تعلیم انھیں ان کے استاذ اور گرو دیتے ہیں۔ یہ لوگ ایک منتخب پیشہ میں مہارت حاصل کرنے کے لئے ایک عمر کھپا دیتے ہیں۔ ان کے شوق وتمنا سے ایک عالم آگاہ ہوتا ہے۔ ان سے ملنے جلنے والے انھیں تربیت حاصل کرتے۔ مجاہدہ کرنے اور ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ نبوت ورسالت پانے والوں کا معاملہ مختلف ہوتا ہے، اس میں ان کے اکتساب کی کوشش نہیں ہوتی کیونکہ ثبوت کا منصب اکتسابی ہے ہی نہیں یہ فضل یزدانی ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے یہ تاج پہنادے۔''۳۱

تصوف کے موضوعات میں ''علم باطن'' کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اور صوفیاء کرام کے نزدیک یہ وہ علم ہے جو انسان کو شریعت اور رسالت سے بے نیاز کردیتا ہے۔ علم باطن کے مقابلے میں علم رسالت خفیف ہے۔۳۲ اس کے باب میں خالد مسعود صاحب نے درج ذیل الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔

''ارباب تصوف کا طبقہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے علم کو ظاہری علم اور شریعت کے چھل کو ایک چھلکے کی طرح غیر اہم چیز قرار دیتا ہے، اس کے بالمقابل انکے نزدیک اصل علم باطنی علم ہے جو سینہ بسینہ منتقل ہوتا اور پھل کے مغز کی طرح اہم ہوتا ہے۔ یہ علم طریقت کہلاتا ہے جو کسی مرشد کا دامن تھامے بغیر حاصل نہیں ہوتا، مرشد ان طریقوں، کے رازوں کا امین ہوتا ہے، صوفیہ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی کاوشیں جو قرآن کا علم پھیلانے کے لئے تھیں، وہ لوگوں کے لئے تھیں، ورنہ علم حقیقی تو آپؐ نے چند مخصوص لوگوں کو ہی دیا تھا جو نہایت رازداری سے اس کو اپنے متوسلین کو منتقل کرتے رہے، گویا جن ذمہ داری کو ادا کرنے میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کھپادی وہ صرف ایک بے معنی اور ضمنی سا کام تھا۔''۳۳

اسی طرح صوفیہ کرام کے ایک انتہا پسند طبقے کا خیال ہے کہ آنحضور ﷺ کے اندر الوہی صفات موجود تھیں، اس کا ذکر مصنف نے درج ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

''ان کا تصور یہ ہے کہ حضور کے اندر الوہی صفات تھیں وہ بشریت سے اتنے بلند مقام پر فائز تھے کہ رب کائنات ہی کے ہم پلہ تھے اور تمام امور میں ان ہی کی رضا کے مطابق فیصلے ہوتے تھے، وہ اب بھی موجود اور دنیا میں تصرف کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس طبقہ کو نبی اور رسول کی حیثیت کا کوئی شعور ہے اور نہ ان کے حقیقی فرائض سے کوئی لگاؤ، یہ طبقہ خوش فہمیوں میں سے مبتلا ہے۔''۳۴

اس کتاب میں سیرت پاک کے مختلف پہلوؤں پر محققانہ انداز اختیار کیا گیا ہے، ایسے بے شمار مقامات ہیں جہاں علم و تحقیق کی ایک ایسی دنیا بسائی گئی ہے جسے دیکھ کر رشک آئے، لیکن ان تمام مباحث میں ترتیب وتدوین قرآن کی بحث اتنی جامع اور اتنی مستحکم ہے کہ پوری اردو اور عربی دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مصنف نے بخاری کی ایک حدیث کے توسط سے یہ واضح کیا کہ:

''نبی ﷺ جو کتابت کرواتے وہ اپنے خاص مصحف میں ترتیب سے رکھواتے، ابتداء یں یہ مصحف مسجد نبوی کے ایک ستون کے پاس رکھا رہتا، اس ستون کا نام ہی "اسطوانة مصحف" پڑ گیا، صحابہ کرامؓ یہیں بیٹھ کر اپنی ضرورت کا قرآن لکھ لیا کرتے تھے۔ اس طرح اصل مصحف محفوظ رہتا۔ زید بن ثابت کا قول روایات میں نقل ہوا ہے۔۳۵

"کنا عند رسول اللّٰہ نؤلف القرآن من الرقاع" (الإتقان فی علوم القرآن)

ہم رسول اللہ کے پاس اوراق کی مدد سے قرآن مرتب

کرتے تھے۔

مذکورہ سطور میں انحضور ﷺ کے ترتیب دیئے گئے، مصحف سے متعلق روشنی ڈالی گئی ہے لیکن جب منافقین و معاندین کی ریشہ دوانیاں دن بدن بڑھتی گئیں تو آپؐ نے وہاں سے اٹھوا کر اُم المؤمنین حضرت حفصہ کے پاس رکھوادیا۔ گویا من جانب اللہ آپؐ سے یہ عظیم خدمت لی گئی، اسے ترتیب توقیفی کہا جاتا ہے، اس کی طرف عبد اللطیف رحمانی نے اپنی کتاب ''تاریخ قرآن'' میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے،۳۶ لیکن اس اہم ترین بحث کو جس سلیقے سے اس کتاب میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا گیا ہے اس کی مثال اردو اور عربی مآخذ میں ملنی دشوار ہے۔ اسی بحث کو مولانا فراہی نے اپنی تفسیر میں نہایت سلیقے سے پیش کیا ہے۔ مولانا فراہی نے کی اسی بحث سے خالد مسعود نے استفادہ کیا ہے لیکن اسے مزید آگے بڑھا کر منقح کردیا ہے۔ مولانا فراہی نے اپنی بحث کو درج ذیل دو آیتوں پر منحصر کیا ہے:''إن علينا جمعه و قرآنه فإذا اقرأناه فاتبع قرآنه"(القیامة:۷۵/۱۷-۱۸)

بلاشبہ ہماری ذمہ داری قرآن کو جمع کرنا اور اسے پڑھانا ہے اور اس کے بعد تم اسے سنایا کرو۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ تحریر کیا گیا کہ قرآن کریم جب خاص ترتیب سے جمع ہوگیا تو آپ کو اسی ترتیب سے سنایا جائے گا۔ اگر یہ وعدہ وفات کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس قرأت کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا،۳۷

"فإذ قرأناه فاتبع قرآنه" (پس جب ہم اس کو سنادیں تو اس کی پیروی کرو)

تفسیر سورہ قیامہ میں مولانا فراہی مزید رقم طراز ہیں:

''یہ باتیں قرآن مجید سے ثابت ہیں اور ان کی روایات سے تصدیق ہوتی ہے کہ یہ تمام باتیں ٹھیک پوری ہوئیں، چنانچہ محمد ﷺ قرآن مجید کی پوری پوری سورتیں سناتے تھے اور یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ آپ کو وہ اس خاص ترتیب سے سنائی گئی ہوں۔ اور صحابہ کرامؓ نبی کریم ﷺ کی اس پیش کردہ ترتیب کے مطابق قرآن مجید کو سنتے اور محفوظ کرتے تھے۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ آپؐ خاص خاص آیتوں کو خاص خاص سورتوں میں خاص خاص مقامات میں لکھواتے تھے اور صحابہ کرامؓ اس کی پابندی فرماتے تھے۔''۳۸

مذکورہ خیال کی روشنی میں یہ بات نہایت اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ قرآن کریم کی ترتیب و تدوین توقیفی یعنی من جانب اللہ ہے، اس کا حقیقی جامع اللہ تعالیٰ ہے اور اس مرتب و مدون مصحف کا محافظ بھی، تا قیامت بشری قوتیں اس کی حفاظت و حصافت کے حصار کو توڑ نہیں سکتی ہیں، اللہ کا ارشاد ہے!

"إنا نحن نزلنا الذكر و إنا له لحافظون"

بیشک یاددہانی کو ہم نے نہایت اہتمام سے اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

''الفرقان الحق کے مرتب ہوں یا کوئی اور کبھی بھی قرآن کریم میں ذرہ برابر تحریف و تبدیل نہیں کرسکتے اسی کو اللہ تعالیٰ نے یوں بتایا ہے:

''إنه لكتاب عزيز لايأتيه الباطل من بين يديه و لا من خلفه"(حم السجدہ:۴۱/۴۲)

بلاشبہہ یہ ایک محفوظ صحیفہ ہے جس کے اندر باطل نہ سامنے سے گھس سکتا ہے اور نہ اس کو پیچھے سے۔)

یہ بات آچکی کہ اللہ کے اشاروں سے اللہ کے رسول ﷺ نے اسے جمع کیا۔ اب اس کے بعد بخاری کی حدیث کے حوالہ سے حضرت ابوبکرؓ کو جامع القرآن کہنا نہایت خطرناک ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی کارکردگی پر اس کا منفی اثر پڑتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس روایت کا جائزہ لیا جائے۔ اور یہ دیکھا جائے

کہ روایت میں جو یہ آتا ہے کہ زید بن ثابتؓ نے بڑی بڑی مشکلات سے آیات اکٹھا کیں اور سورہ برائت کی آخری آیتیں خزیمہ اور ابوخزیمہ سے ملیں۔[۴۰]

اس پر خالد مسعود نے کئی سوالات اٹھائے ہیں، لکھتے ہیں:

''یہ روایت اگر درست جان لی جائے تو کئی حقائق سے دستبردار ہونا پڑے گا، اولاً: اللہ تعالیٰ کا وعدۂ جمع قرآن معاذ اللہ غیر ایفاء شدہ ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر قرآن جمع ہو چکا تھا تو پھر زید بن ثابت کو کون سی مشکل درپیش تھی، انھوں نے اس مجموعہ قرآن کو نقل نہیں کیا بلکہ آیتوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ثانیاً یہ ماننا پڑے گا کہ مہاجرین وانصار اتنا عرصہ رسول اللہ کے ساتھ وابستہ رہے لیکن مکمل قرآن حفظ کرنے کی سعادت حاصل نہ کر سکے۔ چنانچہ جب آیات کی تلاش ہوئی تو کوئی حافظ قرآن سامنے نہ آیا جو کہہ سکتا کہ میں نے حضور سے سن کر یوں حفظ کیا۔ جب قدیم صحابہ میں کوئی حافظ قرآن نہیں تھا تو جنگ یمامہ میں شہید ہونے والے حفاظ کہاں سے آ گئے تھے۔ روایت کے الفاظ سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ کامل قرآن یمامہ کے شہداء کے پاس بھی نہیں تھا بلکہ دوسرے لوگ بھی کچھ حصے ہی یاد کرتے تھے اسی لئے تو حضرت عمرؓ کو قرآن کے بعض حصوں کے ضائع ہونے کا خطرہ محسوس ہوا۔ اگر صدر اول کے مسلمان مکمل قرآن حفظ کرتے تھے تو پھر حضرت عمر کی بات کا کیا مطلب ہے؟، رابعاً: اس روایت کو تسلیم کر کے آدمی اس حقیقت کو ماننے سے بچ نہیں سکتا کہ رسول اللہ ﷺ کے حوالے جو امانت کی گئی اور جسے سارے عالم میں پھیلانے کی ذمہ داری آپؐ پر ڈالی گئی۔ معاذ اللہ آپؐ اس کا حق ادا نہ کر سکے تو قرآن کو اس کی اصل ترتیب پر جمع کیا اور نہ لوگوں کو اس ترتیب پر حفظ کریا۔ خامساً: یہ نتیجہ بھی سامنے آتا ہے اور یہی درحقیقت دشمنان دین اس روایت سے منوانا چاہتے ہیں کہ موجودہ قرآن کی حیثیت مشکوک ہے۔ معلوم نہیں یہ اصل کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ کیا معلوم اس میں بعض آیات شامل نہ ہو سکی ہوں جو بعض لوگوں کے پاس رہ گئیں اور وقت پر دستیاب نہ ہو سکیں؟ پھر اس کا الزام باسانی خلفائے راشدین کو دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایک تا تمام نسخہ مرتب کروا کر امت میں رائج کر دیا۔''[۴۱]

اس طویل گفتگو کے بعد اس روایت کے متعلق خالد مسعود نے بتایا کہ یہ صرف زید بن ثابتؓ سے مروی ہے اس کی خبر ایک ہی شخص عبید بن السباق کو دیتے ہیں، جو آگے ایک ہی شخص ابن شہاب زہری کے علم میں یہ بات لاتے ہیں، اس کے بعد زہری کے چار شاگرد یونس، شعیب، ابراہیم اور عبدالرحمٰن بن خالد کو یہ روایت سناتے ہیں جو چاروں ثقہ شیعہ راوی ہیں۔

اس کے علاوہ بھی مصنف نے اس روایت کی مزید خامیاں، بیان کی ہیں۔ مصنف کے نزدیک یہ روایت شیعہ کی خودساختہ ہے۔ عملاً ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔[۴۲]

اس کے علاوہ حضرت عثمانؓ کو بھی جامع القرآن کہا جاتا ہے اس لئے کہ انھوں نے حضرت زید بن ثابتؓ سے فرمایا کہ قریش کی زبان پر لکھا جائے کیونکہ اسی زبان میں قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ چنانچہ اسی زبان میں کئی مصحف نقل کروا کے مختلف شہروں میں سرکاری اہتمام کے ساتھ روانہ کر دیا تا کہ علاقائی زبانوں میں قرأت کا مسئلہ معدوم ہو جائے،[۴۳] اس پر بھی خالد مسعود نے سوال اٹھائے ہیں: فرماتے ہیں:

''یہ روایت بھی لاکھوں صحابہ میں سے صرف ایک حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں اور ان سے واحد شخص ابن شہاب زہری اسکو قبول کر کے آگے پھیلاتے ہیں کوئی دوسرا صحابی یا تابعی اس عظیم الشان کارروائی کو بیان نہیں کرتا، اگر یہ روایت صحیح تسلیم کی جائے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عثمان کے دور خلافت میں پہلے کسی کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ ایک آیت ''إنما

یسرناہ بلسانك"

(ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں نازل کر کے نہایت موزوں بنادیا) بھی نازل ہو چکا ہے۔ جس کے مطابق قریش کی زبان ہی قرآن کے معاملہ میں واحد قابل قبول زبان ہے۔ اور اسی پر لوگ قرآن کو سیکھتے اور سکھاتے رہے یہ زبان عربوں کے نزدیک بھی نہایت پسندیدہ اور معیاری زبان تھی۔ جس میں قرآن پڑھنے پر ان کو کوئی تکلف نہیں تھا۔ پھر حضرت عثمان کے جامع القرآن ہونے کی صورت میں آیت "إن علینا جمعه" (بلاشبہ اس کو جمع کرنے کی ذمہ داری ہم پر ہے) عدہ کی کیا حیثیت رہی جس کے مطابق جامع القرآن خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے بطور امیر المؤمنین قرآن مجید کی نقول تیار کروا کے مختلف شہروں میں ارسال کیں تو اس واقعہ کو ابن شہاب زہری نے ایک افسانے کا رنگ دیا تا کہ حضرت ابوبکر کے جمع قرآن کے موہوم واقعہ کو تقویت پہنچائی جائے اور اس طرح قرآن کی محفوظیت کو مشکوک قرار دیا جائے۔"[۴۴]

مذکورہ سطور کو غور سے پڑھا جائے، تو یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ جامع القرآن درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے اس کی ترتیب و تدوین میں نہ تو اللہ کے رسول کا کوئی دخل ہے اور نہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ اور خلیفہ سوم حضرت عثمان غنیؓ کا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کو جن روایات کی بناء پر جامع قرآن کہا جاتا ہے ان کا تجزیہ کر کے ابن شہاب زہری کا مقصد و نیت طشت از بام کر دیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ اس کے پیچھے شیعی ذہنیت کارفرما ہے۔ یہ وضاحت اور یہ تحلیل و تجزیہ دنیائے قرآنیات میں انفرادیت کا حامل ہے۔

اس مضمون میں اس گراں قدر تصنیف کے تمام محاسن کا استقصاء و احاطہ ممکن نہیں، لیکن مذکورہ مباحث سے یہ صداقت مبرہن ہو جاتی ہے کہ سیرتی لٹریچر میں اسے وہ امتیاز و افتخار حاصل ہے جس کا ثانی کوئی اور تصنیف نظر نہیں آتی۔ یہ کتاب جیسا کہ معلوم ہے کہ قرآن کریم کی روشنی میں ترتیب دی گئی ہے اس لئے حیات مقدسہ کی تمثیل و تقدیم کے ساتھ ساتھ بہت سی قرآنی آیات کریمہ کی تفسیر و تشریح بھی ہے۔

قرآن کے بعد اس کا دوسرا ماخذ حدیث ہے، حدیث سے استفادہ کرتے ہوئے بہت سی احادیث کے ضعف اور رواۃ حدیث کی عدم ثقاہت پر قابل قدر گفتگو کی ہے۔ بعض مشہور احادیث جو سیرت مقدسہ کی ترجمانی میں جڑ پکڑ چکی ہیں مصنف نے ان احادیث کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی حقیقت کو واشگاف کیا ہے، اس سے یہ اندازہ لگتا ہے کہ قرآنیات کے ساتھ صاحب کتاب کی حدیث پر بھی گہری نظر ہے۔ حدیث پر ان کی گہری نظر کی شہادت ان کی وہ ریاضت دیتی ہے جو انھوں نے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے حدیث سے متعلقہ محاضرات کی ترتیب میں صرف کی ہے،[۴۵] اسی طرح آپ کا وہ مقالہ بھی دستاویزی حیثیت کا حامل ہے جو "مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت حدیث کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور چیزیں بھی یہ پتہ دیتی ہیں کہ خالد مسعود صاحب کو معرفت حدیث میں مہارت حاصل تھی۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے کتب سیرت کی اولین تصانیف کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے مثلاً الطبقات الکبریٰ، الاستعیاب، السیرۃ النبویہ لابن ہشام، سیرۃ النبی لابن کثیر، تاریخ الیعقوبی، السیرۃ النبویۃ لابن سعد، تاریخ طبری، کتاب المغازی للواقدی وغیرہ، اسی طرح اردو مآخذ میں علامہ شبلی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، سلیمان منصور پوری اور اسحاق النبی علوی کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے، خصوصی طور سے مصنف نے علامہ فراہی اور مولانا امین احسن کی متعدد تصانیف سے

استفادہ کیا، دراصل یہ کتاب دبستان شبلی اور مکتب فراہی کی ترجمان ہے۔ بہت سے مباحث میں علامہ فراہی کے فکر کو بنیاد بنایا ہے۔ مثلاً ذبیح اور تدوین قرآن کے باب میں فکر فراہی کو اساسی حیثیت دی گئی ہے۔ اس کتاب کے مآخذ معدودے ہیں کیونکہ مصنف نے توریت، قرآن کریم اور احادیث کو سامنے رکھ کر ایک مستند خاکہ پیش کیا ہے جو سیرت پاک کے موضوع پر منفرد ہے۔ انگریزی مآخذ میں صرف ولیم میور کا نام ملتا ہے۔ ویسے استشراقی ذہنیت کا پردہ چاک کرنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں تصوف کی حقیقت واضح کرتے ہوئے بتایا گیا کہ اس کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، تصوف کی جو تصویر کشی، ''تزکیہ نفس'' میں کی گئی ہے اسی تصویر کو یہاں Enlarge کیا گیا ہے۔

یہ کتاب مباحث، تحقیق و تنقید، زبان و بیان میں اپنی مثال آپ ہے، اس کتاب کی بنیادی شناخت یہ ہے کہ اور تجینل (Original) ہے۔ اس کی فکری اساس میں خود مصنف کا خون جگر شامل ہے اس کی بنیاد ماضی کی آواز بازگشت پر نہیں ہے۔ بلکہ غور و خوض اور تفکر و تدبر پر ہے۔ یہ تعصب اور تحزب کے مسموم عناصر سے پاک ہے۔ ضرورت ہے کہ دنیا کی دیگر زبانوں میں منتقل کیا جائے۔ صاحب کتاب کی خوش بختی دیکھئے کہ علامہ شبلی کی طرح آپ کا بھی ''یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا۔''

☆☆☆

حواشی

۱۔ اس سلسلے میں لاہور کے رسول نمبر کو دیکھا جاسکتا، جو تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی پہلی جلد ۸۱۶ صفحات پر مشتمل ہے، دیکھئے نقوش (رسول نمبر) مدیر محمد طفیل، شمارہ نمبر ۱۳۰، دسمبر ۱۹۸۲ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور، پاکستان)

۲۔ حیاتِ شبلی، مولانا سید سلیمان ندویؒ، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء ص، ۶۹۰)

۳۔ حیات رسول امی، خالد مسعود (تلمیذ امین احسن اصلاحی) طبع اول رحمان مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔

۴۔ اس مفہوم کو ''مسلم'' میں یوں بیان کیا گیا ہے ''إن خلق نبي الله ﷺ كان القرآن'' ص، ۹۔

۵۔ تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دہلی، اپریل ۲۰۰۳ء، ۵۸۰/۵۔

۶۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، تاج کمپنی، دہلی، بار اول، ۱۹۸۹ء، ۴۴۶/۸۔

۷۔ حیات رسول امی: ص، ۱۱۱۔

۸۔ وضاحت کے لئے دیکھئے، ترتیب قرآنی از علامہ شبلی نعمانی، ابوسفیان اصلاحی، شبلی کالج میگزین، ۲۰۰۸، ۲۰۰۷ء (مدیر فخر الاسلم اعظمی) اعظم گڑھ: ص، ۱۱۴-۱۲۲۔

۹۔ ''تحریف قرآن کی حقیقت'' میں مولانا سید علی تقی النقوی نے تدوین قرآن اور تربیت قرآن کے باب میں کچھ اسی طرح کی بات کی ہے۔ اس کا تیسرا ایڈیشن سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۱۰۔ وضاحت کے لئے دیکھئے، تفسیر نظام القرآن، علامہ حمید الدین فراہی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۰ء، ص: ۲۱۲-۲۱۳۔

۱۱۔ حیات رسول امی: ص، ۲۸۔

۱۲۔ ایضاً: ص، ۲۹۔

۱۳۔ ایضاً: ص، ۳۳۔

۱۴۔ الرأي الصحيح فيمن هو الذبيح الإمام عبد

الحمید الفراهی، دار القلم، دمشق، الطبعة الأولیٰ، ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء، ص، ۹۹۔

۱۵۔ مکاتیب شبلی (مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندوی) مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء: ص، ۴۰-۴۱، خط نمبر ۴۰ اور ۶۲)

۱۶۔ حیات رسول امی: ص، ۴۳۔

۱۷۔ ایضاً: ص، ۷۰۔

۱۸۔ وضاحت کے لئے دیکھئے المرأة العربية عباس محمود العقاد (الصديقة بنت الصديق دار المعارف ،مصر، ۱۹۴۹ء ص، ۵-۱۸۔

۱۹۔ حیات رسول امی: ص، ۸۲-۸۳۔

۲۰۔ ایضاً: ص، ۱۷۸۔

۲۱۔ وضاحت کے لئے دیکھئے خاکسار کا مضمون! تبیین الکلام ایک اختصاری جائزہ، تہذیب الأخلاق، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۰۷ء ۱۰/۲۶، ص، ۲۹-۳۶۔

۲۲۔ حیات رسول امی: ص، ۴۵۶۔

۲۳۔ ایضاً: ص، ۴۸۶۔

۲۴۔ ایضاً: ص، ۴۸۶۔

۲۵۔ ایضاً: ص، ۴۸۷۔

۲۶۔ السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام: ص ۳۴۳-۳۴۶۔

۲۷۔ وضات کے لئے دیکھئے حیات رسول امی: ص، ۱۵۷-۱۵۶۔

۲۸۔ السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام: ص ۳۴۲۔

۲۹۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: ایضا، ۳۴۸۔

۳۰۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: حیات رسول امی: ص، ۱۵۸۔

۳۱۔ حیات رسول الٰہی: ص، ۹۸۔

۳۲۔ وضاحت کے لئے دیکھئے، تصوف کا ایک تجزیاتی مطالعہ ،ڈاکٹر عبید اللہ فراہی، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ، بار اول ۱۹۸۷ء، ص: ۱۲۸-۱۵۵۔

۳۳۔ حیات رسول امی۔ ص، ۵۷۔

۳۴۔ ایضا، ص، ۵۷-۵۶۹۔

۳۵۔ ایضا: ص،

۳۶۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: تاریخ القرآن، علامہ عبد اللطیف رحمانیؒ شاہ ابوالخیر اکیڈمی، دہلی، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء ص، ۷۹-۸۰۔

۳۷۔ تفسیر نظام القرآن: ص، ۲۱۲۔

۳۸۔ ایضا: ص، ۲۱۳۔

۳۹۔ 'الفرقان الحق'' دراصل قرآن کریم کے خلاف ایک سازش ہے، کتاب الٰہی کی مقبولیت اور اس کی تعلیمات عالیہ کے خلاف ایک کوشش ہے لیکن اللہ چونکہ خود اس کا محافظ ہے اس لئے اس طرح کی تمام ریشہ دوانیاں خاک میں مل کر خاک ہو جائیں گی۔ دیکھئے شیطانی آیات کا مجموعہ ''الفرقان الحق'' (ترجمہ از محمد صلاح الدین عمری) علوم القرآن، ادارہ علوم القرآن علی گڑھ، ۱/۲۱، جنوری-جون ۲۰۰۶ء: ص، ۹۵-۱۱۴۔

۴۰۔ حیات رسول امی

۴۱۔ حیات رسول امی: ص ۵۳۶-۵۳۷۔

۴۲۔ ایضا: ص، ۵۳۷

۴۳۔ ایضا: ص، ۵۳۸۔

۴۴۔ حیات رسول امی، ۵۳۸۔

۴۵۔ ۱۹۸۰ء میں ''تدبر قرآن'' کی تکمیل کے بعد ''ادارہ قرآن و حدیث'' صرف حدیث پر کام کرنے کے لئے تشکیل دیا، چنانچہ اصول حدیث پر لکچرز دیئے جو ''مبادئ تدبر حدیث'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد مؤطا امام مالک اور صحیح بخاری کے دروس کا آغاز کیا قرآن کریم کی طرح حدیث سے بھی مولانا کو خاصا شغف تھا اور اس ذوق کے مہمیز میں مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری کا کلی دخل تھا۔ ہندوستان کے جن علماء کرام نے حدیث میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان میں آپ کا نام نامی طغرائی حیثیت کا حامل ہے۔

۴۶۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت حدیث، خالد مسعود (علوم القرآن، علی گڑھ، جنوری ۱۹۹۸ء، دسمبر ۲۰۰۰ء، ۱۳-۱۵۔ :ص، ۲۵۶-۲۷۰۔

☆☆☆

عقاد کی ''عبقریۃ محمدؐ''

ایک ادبی جائزہ

.....ڈاکٹر محمد سمیع اختر

عباس محمود عقاد کا شمار بیسویں صدی عیسوی کی ان نامور ادبی و مذہبی شخصیات میں ہوتا ہے جو بجا طور پر دنیائے عربی زبان وادب اور عالم عرب کے لئے باعث افتخار و اعزاز ہیں۔ عقاد جیسی نابغۂ روزگار اور تاریخ ساز علمی و ادبی ہستیاں شاذ و نادر ہی اس دنیا میں پیدا ہوتی ہیں اور اپنی بے مثال علمی، دینی و تحقیقی کاوشوں سے دامن انسانیت کو پر کر کے اس دنیا سے اچانک ہی روپوش ہو جاتی ہیں۔ آج عقاد کا نام نہ صرف عربی زبان وادب بلکہ اردو زبان کے علمی، ادبی اور مذہبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ عربی شعر و شاعری، تاریخ نویسی، سیرت نگاری، تنقید نگاری، تحقیق، فکر و فلسفہ، سیاست و صحافت، مذہبیات و اجتماعیات غرضیکہ کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر ان کی گرانقدر علمی، تحقیقی، اور معیاری تصانیف موجود نہ ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عقاد نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا، مختلف موضوعات پر عقاد کی اسی (۸۰) سے زائد علمی و تحقیقی تصانیف کو دیکھتے ہوئے شیخ خلیفہ تونسی نے عقاد کو مشہور ہندوستانی دیوتا وشنو سے تشبیہ دیا ہے جس کے متعدد ہاتھ ہیں اور وہ ہر ہاتھ سے الگ الگ کام انجام دیتا ہے۔ (۱)

انہوں نے شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو اسے انگریزی، فرانسیسی، جرمنی جیسی جدید ترقی یافتہ مغربی زبانوں کے صف میں لا کھڑا کیا، عربی صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی اور عربی صحافت کو شہرت و مقبولیت کی ایسی بلندی عطا کی کہ عوام و خواص ہر ایک کو ان کے خاص اخبار ''البلاغ'' کے شماروں کا بے صبری سے انتظار رہتا اور اشاعت کے چند گھنٹوں بعد ہی اس کے شمارے مارکیٹ سے ختم ہو جاتے اور ان کے شائقین اس شمارے کو بلیک میں اس کی اصل قیمت سے پانچ گنا زیادہ قیمت میں خریدنے کے لئے تیار رہتے۔ (۲) اور بہت جلد ہی کسی اخبار سے ان کا منسلک ہو جانا اس اخبار کی کامیابی کی ضمانت تصور کیا جانے لگا۔ ادبی تنقید نگاری کے میدان میں قدم رکھا تو دو جلدوں میں ''کتاب الدیوان'' کے عنوان سے عربی شعر و شاعری اور نثر نگاری سے متعلق ایسے بنیادی تنقیدی اصول و ضوابط کو مرتب کر دیا جو آج بھی شعراء و انشاء پردازوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں! اسی طرح ترجمہ نگاری اور تاریخ نویسی کے میدان میں بھی انہوں نے اپنے لئے ایک الگ راستہ منتخب کیا

جس کی واضح مثال ان کی ''عبقریات'' کی سیریز ہے۔

عقاد اپنے معاصر ادباء، شعراء، ناقدین، مفکرین، مؤرخین، فلاسفہ اور صحافیوں سے اس اعتبار سے ممتاز نظر آتے ہیں کہ انہوں نے عام روش سے ہٹ کر ہر میدان میں اپنی خاص فکر کو پیش کیا جو ان کے وسیع مطالعہ، محکم دلائل اور طویل تجربات پر مبنی تھی۔ انہوں نے کبھی کسی خاص فرد یا مخصوص مکتبہ فکر کی تقلید نہیں کی۔ انہوں نے قدیم موضوعات پر صرف اس صورت میں قلم اٹھایا جب انہیں محسوس ہوا کہ اس کے اندر کوئی ابہام یا غموض کا پہلو موجود ہے۔

عقاد نے ۱۸۸۹ء میں اسوان شہر کے ایک متوسط اور دیندار خانوادے میں آنکھیں کھولیں۔ ان کی والدہ کا تعلق کردی نسل سے تھا لیکن وہ ایک نہایت بردبار، پروقار، دیندار اور سمجھدار خاتون تھیں۔ عقاد نے بارہا اپنی تحریروں اور تقریروں میں ان کا ذکر بڑے احترام وعقیدت کے ساتھ کیا ہے، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کی تعلیم وتربیت میں ان کی والدہ محترمہ کا بڑا دخل ہے۔ ان کے والد کا شمار اسوان شہر کے بڑے تاجروں اور بااثر افراد میں ہوتا تھا۔ ابتدائی تعلیم عام بچوں کی طرح اسوان شہر کے مدرسہ امیریہ سے حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے دوران وہ علماء وادباء کی مجلسوں میں اور خاص طور پر ازہری شیخ احمد جداوی کی مجلس میں اپنے والد کے ساتھ پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ شیخ جداوی جمال الدین افغانی کے شاگردوں میں تھے۔ ان کی مجلس میں عقاد کو متقدمین عرب شعراء کے اشعار کو سننے کا اتفاق ہوا جس سے ان کے اندر عربی زبان وادب کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ شروع میں انہوں نے شہباز ہیر'' کے دیوان اور ''الف لیلہ ولیلہ'' کا مطالعہ کیا۔ مدرسہ امیریہ سے فراغت کے بعد انہوں نے باقاعدہ طور پر کسی کالج یا یونیورسٹی کا رخ نہیں کیا بلکہ اپنے ذاتی شوق اور غیر معمولی، فطری ذہانت، ذکاوت پر اعتماد کرتے ہوئے مختلف علوم وفنون کی اہم کتابوں اور مشہور عرب شعراء کے دواوین کا مطالعہ شروع کیا اور جلد ہی زبان وادب، شعر وشاعری، تنقید وتحقیق اور فلسفہ، عمرانیات کے میدان میں اس قدر مہارت پیدا کرلی کہ کالجز اور جامعات کی ڈگریاں ان کے سامنے بے معنی تھیں، اتنا ہی نہیں بلکہ جامعات کے اساتذہ حضرات ان کی علمی مجلسوں میں استفادے کی غرض سے باقاعدہ شریک ہوتے، عقاد نے اپنے شوق اور اپنے عزم و حوصلہ کو ہی اپنا استاد بنایا۔ مختلف موضوعات پر مطالعے کا غیر معمولی شوق تھا، روزانہ آٹھ سے دس گھنٹے مطالعہ میں ضرور صرف کرتے۔ عربی زبان وادب کے علاوہ انہوں نے انگریزی اور فرانسیسی زبان وادب میں بھی اس قدر مہارت پیدا کرلی کہ ان زبانوں کے نثری وشعری ذخائر کا براہ راست مطالعہ کیا اور ان کے محاسن ومعائب کی نشاندہی کی اور پھر عربی شاعری سے ان کا تقابلی مطالعہ کیا۔ انہوں نے ادبیات، شعریات، تاریخ وفلسفہ کے علاوہ کیمیا، ریاضیات، فلکیات، نباتات جیسے سائنسی علوم کا بھی مطالعہ کیا۔ ان تمام میں ادبی وسائنسی موضوعات پر ان کی لائبریری میں بے شمار کتابیں موجود تھیں اور کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جس پر ان کی تعلیقات موجود نہ ہوں۔ ایک مرتبہ اپنی علمی مجلس کے دوران فلکیات سے متعلق کسی مسئلے پر یونیورسٹی کے پروفیسر سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے اس کے نظریہ کی تردید میں اس موضوع پر ایسی کتابوں کا حوالہ دیا جو پروفیسر کی نظر سے بھی نہیں گذری تھیں۔ (۳) شعر وشاعری، ادب وتنقید اور دیگر علوم وفنون کے میدان میں مسلسل اپنی شعاؤں کو بکھیرتا ہوا یہ آفتاب آخر کار ۱۹۶۴ء کو غروب ہوگیا (۴)

عقاد کی تالیف تین نوعیت کی ہیں۔ سب سے پہلے تو ان کے شعری دواوین جن کی تعداد دس ہے، یقظۃ الصباح، وہج الظہیرۃ، أستجان اللیل، وحی الأربعین، ہدیۃ الکروان، عابر سبیل،

اعاصرِ مغرب وغیرہ اہم ہیں۔ دوسری نوعیت کی تالیفات ان کے مقالات، محاضرات اور ریڈیائی تقاریر کے مجموعات پر مشتمل ہیں جن میں ''مطالعات فی الکتب والحیاۃ'' ساعات بین الکتب، بین الکتب والناس وغیرہ اہم ہیں، تیسری نوعیت میں ان کی وہ تصانیف ہیں جن کو انہوں نے مستقل کتاب کی شکل میں تالیف کیا جو ستر (۷۰) سے زائد ہیں اور جو نقد، فلسفہ، تاریخ، سیرت، سیاست، اجتماعیات، مذہبیات وغیرہ پر محیط ہیں۔

عقاد نے اپنی تحریروں میں عام طور پر اعلیٰ انسانی وروحانی قدروں کی پاسداری اور انسان کی فطری آزادی کی بحالی کو یقینی بنانے کی طرف بنیادی توجہ دی ہے، انہوں نے ظلم واستبداد، جور واستحصال اور استعماریت و مادیت کی تمام شکلوں کی مذمت کرتے ہوئے اپنے سلسلہ 'عبقریات' کے تحت بلا اختلاف مذہب وملت اور زمان ومکان تاریخ انسانی کی ان نمایاں ترین ہستیوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جنہوں نے انسانیت کی عظمت اور انسانوں کی حریت، کرامت کو محال کرنے کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں عبقریات کو ایک خاص مقام حاصل ہے اس سیریز کے تحت انہوں نے مذہبی شخصیات کے علاوہ تاریخ ساز عظیم ہستیوں کا بھی انسانی، نفسیاتی اور تاریخی حیثیت سے مطالعہ کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، برناڈ شاہ، شیکسپیر، سعد زغلول وغیرہ کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ اس سلسلے کی اہم ترین کتاب عبقریۃ محمد ﷺ اسی طرح انہوں نے ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عمرو بن العاص، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم جیسی عظیم عبقری ہستیوں پر بھی مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

تاریخ کے ہر دور میں محبان رسول اللہ ﷺ کی ایک ایسی جماعت موجود رہی ہے جس نے محمد ﷺ کی سیرت نگاری کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے ہر خطے اور ہر زبان میں محمد ﷺ کی سیرت طیبہ کے موضوع پر اتنی بڑی تعداد میں مطبوعات ومخطوطات کی شکل میں کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے کہ شاید اس کا عشر عشیر بھی کسی اور موضوع پر موجود نہیں۔ آج بھی دنیا کی مشہور لائبریریوں میں سیرت طیبہ کے موضوع پر بے شمار مخطوطات موجود ہیں (۵)۔ قدماء نے عام طور پر سیرت سے متعلق اپنی ضخیم کتابوں میں آپ ﷺ کی حیات طیبہ سے جڑے ہوئے احوال اور واقعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، جبکہ جدید دور کے سیرت نگاروں نے سیرت سے متعلق واقعات حکایات کی محض جمع وتدوین کے بجائے اس کے اندر معروضیت اور موضوعیت کے رجحان کو فروغ دیا۔ سیرت کی قدیم کتابوں میں کسی ایک کا مطالعہ بڑی حد تک قاری کو اس جیسی دیگر کتابوں کے مطالعے سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ معاصر سیرت نگاروں نے سیرت سے متعلق تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے بجائے کسی ایک پہلو سے متعلق مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ بعض نے ہجرت سے متعلق آپ ﷺ کے موقف کی وضاحت کی تو بعض نے صلح حدیبیہ کو اپنا موضوع بنایا، بعض نے غزوات رسول ﷺ پر گفتگو کی تو بعض نے فتح مکہ کے اسباب ونتائج کا تجزیہ کیا۔

عقاد ایک راسخ العقیدہ اور باعمل مسلمان تھے، ''عبقریۃ محمد'' ان کے آخری دور کی تصانیف میں سے ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کی تیسری وچوتھی دہائی کا وہ دور تھا جب کہ عالم عرب کے بیشتر علاقوں میں سامراجیت کا قبضہ ہو چکا تھا۔ انگریزی وفرانسیسی سامراجیت عرب ملکوں میں مغربی علوم وفنون اور مغربی تہذیب و تمدن کو نئی نسل کے درمیان مقبول بنانے اور دین اسلام کی واقعیت اور رسول اللہ ﷺ کی عظمت سے متعلق ان کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی منظم سازشوں کا تانا بانا بن

رہی تھیں۔ عقاد نے عام طور پر اپنی تحریروں میں اشتراکیت، مادیت، صہیونیت، استعماریت، الحاد پرستی کی زبردست مخالفت کی ہے اور اسے عقلی و منطقی اعتبار سے انسان اور انسانیت کے حق میں مضر ثابت کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اسلامی نظام حکومت، جمہوریت کی بنیاد پر قائم ہے اور صرف یہی نظام حکومت انسانوں کی فطری آزادی کو تحفظ فراہم کرا سکتا ہے۔

انہوں نے ''عبقریۃ محمد'' میں آپ ﷺ کی سیرت کو نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری نوع انسانی کے لئے باعث رحمت قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت کے بعض پہلوؤں سے تعلق مستشرقین اور مخالفین اسلام کے بے جا اعتراضات نے مدلل جواب دیا ہے۔ انہوں نے کسی ماہر نفسیات اور ماہر عمرانیات کی طرح رسالت کی خاصیت سے ہٹ کر بھی بحیثیت انسان آپ ﷺ کو دنیا کا کامل ترین اور عظیم ترین انسان ثابت کیا ہے۔ آپ ﷺ کی شخصیت کو اعلی انسانی روحانی قدروں کا مرقع قرار دیا ہے۔ اور آپ ﷺ کی شخصیت کو عقلی و منطقی دلائل کی روشنی میں نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ پوری بنی نوع انسانی کے لئے باعث خیر و برکت اور سرچشمۂ نور و ہدایت ثابت کیا ہے۔ ان کے نزدیک عبقریت کا مفہوم نہایت وسیع ہے یعنی عبقری صفت انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنے خاندان، اپنی قوم سے اوپر اٹھ کر تمام بنی نوع انسانی کی فلاح و کامیابی کے لئے متفکر ہو۔

''عبقریۃ محمدؐ'' ان کے آخری دور کی تصانیف میں سے ہے جبکہ عقاد کی عمر پچاس سے متجاوز ہو چکی تھی۔ انہوں نے اس کتاب کا خاکہ تو جوانی میں تیار کر لیا تھا مگر مسلسل تیس سالوں تک اس کتاب سے متعلق مباحث و موضوعات پر غور و فکر کرتے رہے اور جب ہر پہلو سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اس کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ عوام و خواص کے درمیان اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف دس مہینوں کے اندر ہی اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔

عقاد نے محسوس کیا کہ محمد ﷺ کی سیرت، آپ کی دعوت، آپ کی رسالت، آپ کی اکرام انسانیت سے متعلق بعض ایسے تشنہ پہلو ہنوز باقی ہیں جن کی مزید وضاحت و صراحت کی ضرورت ہے تاکہ آپ ﷺ کی رسالت پر عقلی و منطقی اعتبار سے بھی لوگوں کا یقین مستحکم ہو جائے۔

انہوں نے عام طور پر مختلف مباحث کے تحت سیرت سے متعلق واقعات و روایات کو مکمل نقل کرنے کے بجائے ان کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کیا ہے، لیکن جہاں ضرورت محسوس کی وہاں واقعات کو تفصیل سے بھی نقل کیا ہے، خاص طور پر غزوات، واقعہ افک، اور تعدد ازدواج سے متعلق مستشرقین اور مغربی مصنفین کے اعتراضات کے جواب میں تاریخی واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اس کتاب میں عقاد نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے لے کر وفات تک مختلف معاملات زندگی میں آپؐ کے ہر عمل اور ہر اقدام کو تمام انسانوں کے لئے اسوہ ثابت کیا جائے۔ انہوں نے تاریخی، منطقی و نفسیاتی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اس دنیا میں آپ ﷺ سے بہتر کوئی داعی، مدبر، حکمراں، مصلح، منتظم، فوجی کمانڈر، شوہر اور والد ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ ﷺ کی سیرت زندگی کے ہر میدان میں پوری انسانیت کے لئے ایک رول، ماڈل ہے۔

انہوں نے عام سیرت نگاروں کی طرح سیرت سے متعلق واقعات و حکایات کی جمع و تدوین پر اکتفا نہ کرتے ہوئے ان حکایات سے نکلنے والے عبرت و موعظت، حکمت و بصیرت اور عظمت و عبقریت کے پہلوؤں کی طرف نشاندہی کی ہے۔

''عبقریۃ محمدؐ'' بڑے سائز کے تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل

ہے اور نہ صرف مصر بلکہ مختلف عرب ممالک سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے، مختلف زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے بھی کافی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں، عقاد نے قاری کے ذہن میں اٹھنے والے اس سوال کا خود ہی جواب دیا یہ کہ آخر سیرت کے موضوع پر ہزاروں کی تعداد میں کتاب کے ہوتے ہوئے اس کتاب کی کیا ضرورت تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں یہ کہنا چاہوں گا کہ قارئین نے شاید سیرت کے موضوع پر شائع ہونے والی کتابوں کی سن تالیف پر نظر نہیں ڈالی۔ حال کے برسوں میں مستند و معتبر علماء کی جانب سے اس موضوع پر زیادہ کچھ نہیں لکھا گیا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد پوری دنیا کی طرح عالم عرب کے اجتماعی و فکری حالات میں بھی نمایاں تبدیلی آئی، جدید تقاضوں کے مطابق سیرت پاک ﷺ کے موضوع پر ایک علمی و تحقیقی نوعیت کی جامع کتاب لکھنے کی ضرورت تھی، بازجی، زیدان اور شدیاق جیسے مسیحی مصنفین و مستشرقین نے اسلامی تاریخ و سیرت کے موضوع پر تو ضرور لکھا لیکن کسی مستند عالم نے تحقیقی و منطقی انداز میں کوئی کتاب نہیں لکھی اور یہ میرے لئے بڑی سعادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بات کی توفیق دی''۔(۶)

پہلی عالمی جنگ کے بعد عالم عرب پر ایک ایسا دور آیا جب کہ زندگی کے ہر میدان میں مغرب اور مغربی تہذیب و تمدن کو رہنما تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مسلمان عام طور پر مرعوبیت اور شکست خوردگی کے احساس سے دوچار تھے۔ اسلام اور سیرت رسول ﷺ پر مغرب کی جانب سے ہونے والے اعتراضات کا ان سے علمی، منطقی، و تحقیقی انداز میں جواب دینا نہیں بن پڑ رہا تھا۔ مغربی مصنفین عام طور پر تلوار اور خون خرابے کو ہی آپ ﷺ کی اسلامی دعوت کی کامیابی کا کرشمہ قرار دے رہے تھے۔ عقاد لکھتے ہیں:

''اس کتاب کو لکھتے وقت یہ بات میرے ذہن میں مستحضر تھی کہ نبی کریم ﷺ کی جامع اور عبقری شخصیت کو شرارت پسند مغربی مصنفین کے گمراہ کن اعتراضات اور بے بنیاد پروپیگنڈوں کے شر سے محفوظ رکھا جائے، اس کتاب کا مقصد اسلام یا اسلامی احکام کی تشریح نہیں کیونکہ ان موضوعات پر ہمارے علماء کرام کی بے شمار تصانیف موجود ہیں۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے انسانی عظمت کے ایسے پہلوؤں کو نمایا کرنا ہے جو غیر مسلموں کے نزدیک بھی معتبر ہیں کیونکہ آپ ﷺ تو پوری بنی نوع انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ ''عبقریۃ محمدؐ'' کی تالیف سے میرا بنیادی مقصد یہی ہے کہ دینی، فکری عقلی، وجدانی، اجتماعی، سیاسی، انتظامی ہر اعتبار سے محمد ﷺ کی عظمت کو ثابت کروں! اور دنیا کو یہ باور کرادوں کہ اس دنیا میں محمد ﷺ کے علاوہ کسی اور مذہب، دعوت یا تحریک کے بانی نے ایسا حیرت انگیز کارنامہ انجام نہیں دیا۔''(۷)

فاضل مصنف نے پہلے باب میں ''علامات مولد'' کے عنوان سے محمد ﷺ کی پیدائش کے وقت نہ صرف خطہ عرب بلکہ پوری دنیا کے اجتماعی و معاشرتی حالات کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ چاروں طرف لادینیت و گمراہی، انتشار و بدامنی، ظلم و زیادتی اور خوف و ہراس کا ماحول تھا۔ دین مسیحیت بھی توحید سے زیادہ بت پرستی کے قریب پہنچ چکی تھی اور دنیا کو کسی ہادی اور مصلح کی ضرورت تھی۔ مکہ کی مرکزیت، خاندان قریش کی عظمت اور عبد المطلب کی حکمت و فراست کا بعض مثالوں کے ذریعہ وضاحت کرتے ہوئے ان کے لائق فرزند

عبداللہ کی حکمت و دانشمندی، متانت وسنجیدگی کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کا خاندان بعثت سے قبل بھی حسب ونسب، مقام ومرتبہ، اخلاق وکردار کے اعتبار سے سب سے بہتر تھا۔ آپ ﷺ کے متعلق لکھتے ہیں:

"أصلح رجل من أصلح بيت في أصلح زمان لرسالة النجاة المرقوبة"

(صالح ترین شخص اعلیٰ ترین خاندان میں اور رسالت کے لئے موزوں ترین زمانے میں پیدا ہوا جب کہ نجات کے لئے رسول کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔)

دوسرا باب ''عبقریۃ الداعی'' کے عنوان سے ہے۔ عقاد نے ثابت کیا ہے کہ اس دور میں محمد ﷺ کی رسالت کسی معجزے سے کم نہیں تھی کیونکہ رسالت کی کامیابی کے لئے حالات، مکان اور شخصیت تینوں کے درمیان مطابقت ضروری ہے۔ آپ ﷺ کی فصاحت وبلاغت، صداقت وامانت، اخوت ومحبت، شفقت ورأفت اور عدالت وطہارت جیسے بنیادی اخلاقی وانسانی صفات کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ کی ذات کو ان اوصاف حسنہ کا بہترین مظہر قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسالت سے قبل بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم آپ کو اپنا رہنماء تسلیم کرتی تھی۔ لوگ آپؐ کے خوف سے اسلام میں داخل نہیں ہوتے کیونکہ آپؐ تو خود اپنی قوم کے مظالم کے شکار تھے بلکہ وہ آپؐ کے اعلیٰ اخلاق وکردار سے متاثر ہوکر دائرہ اسلام میں داخل ہوتے۔ عقاد نے حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کا واقعہ تفصیل سے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ انکا قبول اسلام میں کسی ترغیب یا ترہیب کا دخل نہیں تھا بلکہ یہ ان کے دل کی آواز تھی۔(۹)

عقاد نے تیسرے باب میں ''عبقریۃ محمد العسکریۃ'' کے عنوان سے آپ ﷺ کی بے مثال عسکری صلاحیت اور جنگ و صلح سے متعلق حکمت وبصیرت پر مبنی آپؐ کے عادلانہ موقف کی وضاحت کرتے ہوئے اسلامی جنگوں سے متعلق مستشرقین کے اعتراضات کو انسانی، منطقی اور تاریخی نقطہ سے غلط قرار دیا ہے۔ فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ آپؐ کی قیادت میں لڑی گئی بیشتر جنگیں دفاعی نوعیت کی تھیں۔ عقاد نے جنگ سے متعلق قرآن میں موجود تمام آیات اور آپ ﷺ کے اقوال واعمال کو اس باب میں جمع کردیا ہے۔ بین الاقوامی قوانین کے تحت بھی جان کی حفاظت، ریاست کے تحفظ، ملک میں امن وامان کے قیام اور حکومت کے خلاف بغاوت کو فرو کرنے کے لئے جنگ کی اجازت ہے۔(۱۰)

یہودیت ومسیحیت سے موازنہ کرتے ہوئے اسلام کی آفاقیت، عالمگیریت، جامعیت اور ابدیت کو نمایاں کیا ہے۔ آپؐ کی ذات میں ایک کامیاب ترین سپہ سالار کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ مختلف غزوات کے دوران آپ ﷺ کی فوجی قیادت اور جنگی حکمت عملی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ فاضل مصنف نے دور جدید کے کامیاب ترین فوجی جنرل نپولین جونا پارٹ کی جنگی تدابیر کا موازنہ کرتے ہوئے مثالوں کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ اس نے بیشتر جنگی تدبیروں کو آپ ﷺ کی سیرت سے اخذ کیا ہے۔ یہ بحث قدرے طویل لیکن مفید اور معلومات افزا ہے۔(۱۱)

عقاد نے "خصائص العظمة" کے باب میں بحیثیت انسان آپ ﷺ کی اخلاقی، انسانی وروحانی قدروں پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ عدل واعتدال کو آپ ﷺ کی شخصیت کی نمایاں ترین خصوصیت قرار دیا ہے۔ آپؐ اپنی اعلیٰ انسانی قدروں کی بدولت اپنے احباب واصحاب کے علاوہ دشمنوں کے درمیان بھی معزز اور مقبول تھے۔ فاضل مصنف نے کعب بن اشرف، جنگ بدر کے بعض قیدیوں سے متعلق آپ ﷺ کے قتل کے حکم پر بحث کرتے ہوئے موجود

بین الاقوامی قوانین کے تحت بھی جائز قرار دیا ہے، اس ضمن میں مستشرقین کے اعتراضات کو اسلام دشمنی، تعصب و جانبداری، اور حقائق سے انحراف کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ جدید بین الاقوامی قوانین میں تو ایسے مجرمین کے لئے تو اس سے بھی زیادہ سخت سزائیں موجود ہیں۔ (۱۲)

"عبقرية محمد السياسة" کے عنوان سے عقاد نے آپ ﷺ کی سیاسی حکمت و بصیرت اور امور حکومت سے متعلق آپ کی غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ آپؐ کی سیاسی بصیرت کی سب سے بڑی دلیل صلح حدیبیہ کو قرار دیا ہے جس کے نتیجے میں معمولی جنگ و جدال کے بغیر ہی اسلامی فوجوں نے مکہ مکرمہ کو فتح کر لیا۔ عقاد نے اس باب میں تحریک آزاد ہند کے مشہور لیڈر مہاتما گاندھی کی تحریک عدم تشدد کا ذکر کیا ہے جس کے بارے میں مؤرخین کا عام خیال ہے کہ گاندھی جی کی یہ تحریک روسی مصلح لیون ٹالسٹائی، براہمز م اور بدھوازم کے نظریات سے متاثر تھی جب کہ گاندھی جی کا یہ نظریہ آپؐ کی سیرت سے ماخوذ ہے۔ (۱۳) انتظامی امور میں آپؐ کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جب کبھی آپؐ تین افراد پر مشتمل کسی وفد کو روانہ فرماتے تو ان میں سے ایک کو اس وفد کا امیر مقرر فرماتے۔ آپؐ افراد کی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق ہی ان کے ذمے کوئی خدمت تفویض فرماتے۔ آپؐ نے فرمایا "جس کسی نے ایسے شخص کو دس آدمیوں کی جماعت کا امیر مقرر کیا اور وہ یہ جانتا کہ اس جماعت میں اس سے زیادہ اہل اور قابل شخص بھی موجود ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیا" اپنے رسول سے فریب کیا اور پوری امت مسلمہ کے ساتھ غداری کی" فاضل مصنف نے ایسی متعدد احادیث کو نقل کیا ہے جن کے اندر امور مملکت سے متعلق آپؐ کی واضح ہدایات موجود ہیں (۱۴)

"البـــلیـــغ" کے عنوان سے قائم باب میں عقاد نے خطابت کے میدان میں آپؐ کی غیر معمولی فصاحت و بلاغت اور ایجاز و جامعیت کے پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ آپؐ نے مختلف موقعوں پر قصوں کی شکل میں بھی امت کو اعمال صالحہ کی طرف رغبت دلائی ہے۔ آپؐ نے غار میں پھنسے ہوئے تین افراد کی حکایت کے ذریعہ والدین کی اطاعت، مجبور کے ساتھ ہمدردی اور امانت کا پاس و لحاظ جیسے اعمال صالحہ کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ بعض قصوں کے ذریعہ آپؐ نے بے زبان جانوروں کے ساتھ بھی خیر و بھلائی کا حکم دیا ہے۔ آپؐ کے بعض ارشادات سے متعلق فاضل مصنف کا یہ ماننا ہے کہ ان کی تشریح کے لئے صفحات تو کیا جلدیں بھی ناکافی ہوں گی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"اجرت لدنياك كأنك تعيش أبدا، و اعمل لآخرتك كأنك تموت غداً" (دنیا کو اس طرح حاصل کرنے کی کوشش کرو جیسے کہ تم ہمیشہ زندہ رہو گے اور آخرت کے لئے اس طرح عمل کرو جیسے کہ کل تمہارا آخری دن ہوگا۔)

آپ ﷺ کا ارشاد ہے "كماتكونوا يول عليكم" یعنی تمہارے جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی حکمراں تم پر مسلط کئے جائیں گے (۱۵)

"محمد الصديق" کے عنوان سے قائم باب میں عقاد نے مسلمانوں اور عام انسانوں کے تئیں محمد رسول اللہ ﷺ کی رافت و رحمت، صداقت و الفت اور اخوت و محبت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ واقعات اور حقائق کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ ہر عمر، ہر نسل اور ہر قوم سے تعلق رکھنے والے شریف النفس اور سلیم الفطرت انسان آپؐ پر جان چھڑکتے تھے۔ تاریخ انسانی میں کوئی ایسا قائد، رہنما یا پیشوا نظر نہیں آتا جس کے متبعین اپنے امیر سے اس درجہ محبت کرتے ہوں کہ اس کی خاطر اپنی خوشی، اپنی جان

تک قربان کرنے کے لئے تیار ہوں! صحابہ کرام کی رسول اللہ ﷺ سے والہانہ عقیدت و محبت سے متعلق عقاد نے مختلف واقعات کونقل کیا ہے۔ آپ ؐ کی قرابت داری اور صلہ رحمی کا معاملہ یہ تھا کہ جب کبھی حضرت حلیمہ سعدیہ آپ ؐ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ ؐ ان کے لئے اپنی رداء مبارک فرش پر بچھا دیا کرتے، ان کے فضل واحسان کو یاد کرتے اور اپنی جانب سے ان کو بہت سارے تحائف دے کر روانہ کرتے۔ عبداللہ بن ابی جیسے رأس المنافقین کے ساتھ بھی آپ ؐ نے عفو درگذر کا معاملہ فرمایا اور اس کی ہر ممکن دلجوئی کرنے کی کوشش کی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے صراحۃً حکم دے کر اس کی دعائے مغفرت فرمانے سے منع نہ کردیا ہوتا تو آپ ؐ اس کی مغفرت کی دعا بھی فرما دیتے (۱۶)

"محمد الرئیس" کے عنوان سے عقاد نے حکومت وجہانبانی کے میدان میں محمد ﷺ کی عبقری خصوصیات کا جائزہ لیا ہے اور مختلف واقعات سے ثابت کیا ہے کہ آپ ؐ کے اندر ایک مثالی امیر یا حکمراں کی تمام خصوصایت بدرجہ اتم موجود تھیں۔ آپ ؐ ایک مثالی قائد تھے۔ آپ ؐ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناپسند ہے کہ اس کا کوئی بندہ اپنے آپ کو اپنے دوستوں کے درمیان خود کو ممتاز رکھنے کی کوشش کرے۔ دوران سفر آپ ؐ بھی اپنے صحابہ کرام کے ساتھ مل کر کوئی نہ کوئی کام اپنے ذمے بھی لے لیا کرتے تھے۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ قائد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو شک کے مقامات سے دور رکھے حتی الامکان باہمی مشورے سے کوئی فیصلہ لے! اپنے مخالفین، موافقین دونوں کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرے!(۱۷)۔

"الزوج" کے عنوان سے قائم باب میں عقاد نے بحیثیت شوہر ازواج مطہرات کے ساتھ آپ ؐ کے معاملات اور ازدواجی زندگی سے متعلق آپ ؐ کے ارشادات کو نقل کیا ہے۔ آپ ؐ خود بھی اپنی بیویوں کے ساتھ بڑی شفقت ونرمی کے ساتھ پیش آتے اور امت مسلمہ کو بھی اس بات کی تاکید کی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ خیر کا معاملہ کریں!۔ مختلف قدیم تہذیبوں اور جدید مغربی تہذیب کا جائزہ لیتے ہوئے ثابت کیا ہے یہاں عورتوں کو ازادی اور حقوق کے نام پر استحصال اور بے عزتی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ یہ اسلامی ہی ہے جس نے عورتوں کو حقیقی آزادی، عزت و احترام اور حقوق و مراعات سے نوازا اور بیشتر معاملات میں مردوں کے برابر ہی حقوق عطا کئے۔ اس ضمن میں مصنف نے تمام قرآنی آیات کو نقل کیا ہے۔ آپ ؐ کا ارشاد یہ ''مؤمنین میں اس شخص کا ایمان سب سے زیادہ کامل اور اخلاق کے اعتبار سے سب سے زیادہ بہتر ہے جو اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کرے''، ''واقعہ افک'' کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے بظاہر علیحدگی کی صورت میں آپ ؐ برابر حضرت عائشہؓ کی خبر گیری اور دلجوئی فرماتے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عائشہؓ کی برأت سے متعلق آیت نازل ہوگئی۔ اسی طرح عقاد نے ازواج مطہرات کے ساتھ آپ ؐ کے رشتہ ازدواج کے تاریخی، انسانی، سماجی اور نفسیاتی پس منظر کو پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ آپ ؐ نے یہ شادیاں مخصوص حالات میں سماجی تقاضوں کے تحت کیں جن کا مقصد نعوذ باللہ خواہشات انسانی کی تکمیل نہیں تھیں جیسا کہ مستشرقین اور مغربی مصنفین کا کہنا ہے۔ پچاس سال کی عمر تک حضرت خدیجہؓ آپ کی واحد شریک حیات تھیں۔ فاضل مصنف نے فرداً فرداً ہر بیوی کے ساتھ عقد کے پس منظر کو بیان کیا ہے، جس میں دور دور تک نفسانی خواہش کی تکمیل کا داعیہ سامنے نہیں آتا۔ (۱۸)

"الأب" کے تحت عقاد نے آپ ؐ کی پدرانہ شفقت ومحبت کا ذکر کیا ہے جو صرف اپنی اولاد کے لئے خاص نہیں تھی بلکہ روحانی رشتے کے ناطے پوری امت مسلمہ کی ایک مشفق والد کی طرح تربیت وسرپرستی فرمائی، آپ ؐ نے بھی عام انسانوں کی طرح

اولاد کی پیدائش پر خوشی اور ان کے انتقال پر رنج وافسوس کا اظہار کیا ہے۔ فاضل مصنف نے مختلف تاریخی واقعات کی روشنی میں ایک مثالی مومن باپ کی حیثیت سے آپ کے کردار کو نمایاں کیا ہے۔ (۱۹)

عقاد نے "السید" کے عنوان سے قائم باب میں ایک آقا کی حیثیت سے محمد ﷺ کی صفات کو نمایاں کیا ہے۔ ایک غلام کے لئے اس دنیا میں آقا کی محبت اور عنایت کے سوا اور کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ آپؐ اپنے غلاموں اور نوکروں کے حق میں بہت زیادہ شفیق اور رحمدل تھے۔ اسلام کے علاوہ کسی اور تہذیب یا مذہب میں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم نہیں دی گئی۔ آپؐ نے امت کو غلاموں کی آزادی کی طرف رغبت دلائی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم یونانی اور رومی تہذیبوں میں غلاموں کی تعداد تقریباً آزاد لوگوں کے برابر تھی (۲۰) آپؐ اپنے غلام زید بن حارث کے ساتھ اس قدر شفقت ومحبت سے پیش آتے کہ انہوں نے اپنے والدین کی محبت اور اپنی آزادی کو آپؐ کی غلامی پر ترجیح دی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''تم اپنے درمیان دو کمزور مخلوق یعنی غلاموں اور عورتوں کے حقوق کے متعلق اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔'' (۲۱)

"العابد" کے عنوان کے تحت عقاد نے آپؐ کی عبادت وریاضت کے طریقوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عہد طفولت سے ہی کارِ نبوت کی عظیم ذمے داریوں کو اٹھانے کے لئے خاص انداز پر پرورش اور تربیت کا اہتمام کیا تھا۔ فاضل مصنف کے نزول وحی کے وقت آپؐ کی کیفیت اور فرائض ونوافل میں آپؐ کے طریقہ عبادت پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ قیام لیل کی نمازوں، آپ کے انہماک اور مناجاۃ کی کیفیت بالکل مختلف ہوتی اور انہیں عبادات سے آپؐ کے ایمان میں ہر آن قوت، جدت پیدا ہوتی، آپؐ نے دیگر امور زندگی کی طرح عبادات میں بھی اعتدال اختیار کرنے کی دعوت دی عبادات میں تشدد یا غلو اختیار کرنے کو ناپسند فرمایا حقوق اللہ کے ساتھ آپؐ نے بندوں اور جسم کے حقوق ادا کرنے کی بھی تلقین فرمائی۔ (۲۲)

آخری بات عقاد نے ''الرجل'' کے عنوان سے قائم کیا ہے۔ اس باب میں آپؐ کی ظاہری شکل وصورت اور جسمانی ہیئت کو مستند احادیث وآثار کی روشنی میں اجاگر کیا ہے۔ مستند احادیث کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ ظاہری اعتبار سے آپؐ دنیا کے کامل ترین اور خوبصورت ترین انسان تھے۔ ظاہری طور پر آپؐ کی ذات میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جہاں تک انسان تصور کرسکتا ہے۔ آپؐ ہمیشہ سنجیدہ نہیں رہتے بلکہ مزاح وظرافت کو بھی پسند فرماتے تھے۔ فاضل مصنف نے ایسے متعدد واقعات نقل کئے ہیں۔ صحابہ کرام کے درمیان حضرت نعمان بن عمرؓ اپنی ظرافت کے لئے مشہور تھے، ان پر نظر پڑتے ہی آپؐ کے چہرۂ مبارک پر مسکراہٹ دوڑ جاتی تھی۔ (۲۳)

اپنی دیگر کتابوں کی طرح عقاد نے ''عبقریۃ محمد'' کے اندر بھی ایک نئی فکر اور مخصوص سوچ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ قاری کو سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر علمی ومنطقی انداز سے غور وفکر کرنے کی دعوت دی۔ مصنف نے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے قبل اس کے تمام قدیم وجدید مصادر نیز مستشرقین اور مخالفین اسلام کی تالیفات کو پوری طرح ہضم کرلیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود عقاد کو اس کے اندر کسی ترمیم واضافہ کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

عقاد اپنی تحریروں میں معلومات جمع کردینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ معلومات کے ذریعے نتائج تک پہنچتے ہیں۔ ان کی تحریر غایت درجہ منظم ومربوط ہوتی ہے ان کا اسلوب علمی ومنطقی

ضرور ہے لیکن الفاظ، معانی کے درمیان مطابقت کے ذریعہ ان کو اپنی عبارتوں میں ادبی موسیقیت پیدا کرنے کا ہنر آتا ہے۔ الفاظ تو بظاہر سادہ اور عام فہم ہوتے ہیں لیکن موقعہ ومحل کے اعتبار سے نہایت موزوں اور بلیغ ہوتے ہیں۔ تحریر میں ایسی سلاست اور روانی ہے کہ قاری کو ذرا بھی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ عام طور پر معانی وافکار کو الفاظ پر ترجیح دیتے ہیں!

جامعیت ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے، وہ بے جا تمہید اور غیر ضروری تفصیل سے احتراز کرتے ہیں۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ دینا ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ کہتے ہیں "اسلام شرع العنق ولم یشر الرق" (یعنی اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لئے قوانین بنائے ہیں لیکن غلامی کے لئے کوئی ضابطہ نہیں بنایا)۔''

ان کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت مقصدیت ہے۔ عقاد نے کسی واضح مقصد کے بغیر کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی یہاں تک کہ ان کے ہر مقالے کا بھی ایک مقصد ہوا کرتا تھا۔ قدیم موضوعات پر اسی وقت قلم اٹھاتے جب ان کو اس بات کا یقین ہوجاتا کہ اس موضوع کا کوئی گوشہ تشنہ ہے کوئی فکر ناقص ہے تو اس ابہام کو دور کرنے کے لئے قلم اٹھاتے۔ ''عبقریۃ محمد'' کے پیش نظر بھی ان کا یہی مقصد تھا مقصد کی طرف پورے اعتماد و یقین اور پوری تیاری کے ساتھ بڑھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ عقاد نے ''عبقریۃ محمد'' کے اندر مختصر الفاظ اور مؤثر اسلوب میں آپؐ کی شخصیت اور سیرت سے متعلق تمام ہی اہم پہلوؤں کا علمی، منطق، تاریخی، نفسیاتی اور ادبی انداز میں احاطہ کرلیا ہے اور سیرت سے متعلق واقعات و حکایات پر زور دیتے ہوئے ان سے مستنبط افکار ونظریات نیز نتائج کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ عقاد نے بحیثیت انسان اور بحیثیت رسول دونوں ہی اعتبار سے آپؐ کی شخصیت میں پوشیدہ عبقریت اور عظمت کے پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ اسی طرح سیرت رسولؐ سے متعلق مستشرقین کے اعتراضات کا بھی مدلل جواب دیا ہے۔ تحقیقی اور دعوتی نقطۂ نظر سے یہ نہایت مفید کتاب ہے، عقاد کے پچاس سالہ تجربات کا نمونہ ہے جس نے نئی نسل کے ذہنوں سے مغربی تہذیب کی مرعوبیت کو ختم کرنے اور اسلامی تہذیب وتمدن کی عظمت کو راسخ کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

انہوں نے محمد ﷺ کو ارشاد و دعوت، فصاحت و بلاغت، عبادت وریاضت، سیاست وحکومت، سیادت وقیادت، امانت و دیانت، حکمت وبصیرت، رأفت ورحمت، اخوت ومحبت، فنون حرب میں مہارت، نظم وانتظام کی غیر معمولی صلاحیت وغیرہ تمام ہی اعلیٰ انسانی، اجتماعی، انتظامی اور عسکری اوصاف میں پوری بنی نوع انسانی کے لئے اسوہ قرار دیا ہے۔ یہ وہ اعلیٰ اوصاف ہیں جن کا کسی ایک انسان کے اندر بیک وقت جمع ہونا ناممکن ہے۔ اور یہ خاصیت نبی کریم ﷺ کی رسالت کے ساتھ ساتھ بحیثیت انسان آپ کی عبقریت اور عظمت کی بھی دلیل ہے۔ انسانی تہذیب وتمدن صدیوں کا سفر طے کرنے اور ہر میدان میں محیر العقول ترقیات حاصل کرنے کے باجود دنیا کے سامنے کسی ایسے قائد، حکمراں، مدبر، مصلح یا مذہبی پیشوا کو پیش کرنے سے قاصر ہے اور قاصر رہے گی جس کے اندر ان اعلیٰ اخلاقی، انسانی اور اجتماعی صفات کا عشر عشیر بھی موجود ہو۔

☆☆☆

مراجع

١- العقاد دراسة و تحية، محمد خليفة التونسي: ص ٢٣- ١٩٦٠، مكتبة الانجلو المصرية، القاهر ه ،مصر

٢- العقاد دراسة و تحية: ص،٧٣

٣- حالات زندگی سے متعلق تفصیلات کے لئے ملاحظہ کریں!

الأدب العربي المعاصر في مصر، الدكتور شوقي ضيف : ص، ١٤٤، ١٧٦، دار المعارف ، ١٩٨١ء مصر

مع العقاد، الدكتورشوقي ضيف، دار المعارف، القاهرة مصر ١٩٧٤ء

العقاد دراسة و تحية، محمد خليفة التونسي

الفنون الأدبية و أعلامها، انيس مقدسي ، دار الكتاب العري ، بيروت ١٩٦٨ء

٤- عباس محمود العقاد، الأستاذ محمد راشد، ثقافة الهند، يوليو ١٩٦٤ء دهلى، الهند،

٥- بين الأدب و النقد، دكتور محمد رجب البيوى :٧٩ - ٢٧٧، الدار المصرية اللبنائية، لبنان ١٩٩٧ء بيروت.

٦- عبقرية محمدؐ، عباس محمود العقاد:ص،٧، نهضة مصر، القاهرة، مصر

٧- عبقرية محمدؐ العقاد:ص،١٢

٨- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،٢٣

٩- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،٣٣-٢٥

١٠- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،٤٠

١١- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،٤٢-٤٥

١٢- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،٦٣

١٣- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،٦٧

١٤- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،٧٣

١٥- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،٨٥-٧٦

١٦- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،٩٤-٨٦

١٧- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،٩٨-٩٥

١٨- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،١٢٦-١٠٠

١٩- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،١٣٤-١٢٧

٢٠- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،٣٥

٢١- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،١٣٦

٢٢- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،١٥٠-١٤٤

٢٢- عبقرية محمدؐ العقاد: ص،١٥٦-١٥١

☆☆☆

اردو زبان میں چند کتب سیرت کا ادبی جائزہ

محمد شعیب کوٹی

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تاریخ نگاری کی ابتدا دراصل سیرت نگاری سے شروع ہوئی ہے۔ کتب سیرت اور مغازی سے پہلے بھی تاریخ نویسی کی روایات تو ملتی ہیں جن میں عموماً بادشاہ یا قومیں اپنی تاریخ ادیبوں یا دانشوروں سے لکھواتے رہے ہیں جو اپنی خوبصورت تحریروں سے اپنے ممدوح کی شان میں رطب اللسان ہوتے تھے اور بعض مرتبہ انہیں مافوق البشر بنادیتے تھے۔ اکثر ان سیاحوں کی خودنوشت، سفرنامے تاریخ کا حصہ بن گئے جو مختلف ممالک میں گھومتے پھرے اور وہاں کے حالات قلمبند کرتے رہتے اگرچہ جن میں مختلف اقوام، وہاں کے رسم ورواج، زبان کی اجنبیت اور ثقافت کے فرق کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک اجنبی کسی بات کو بالکل صحیح تناظر میں پیش کرسکے۔ دوسری طرف وہ مورخین بھی ہیں جو کسی حسد اور عناد کی بنا پر کسی دشمن قوم کی تاریخ محض اس لئے لکھتے رہے ہیں کہ اپنے اس دشمن کی تاریخ مسخ کرسکیں، کبھی خود اپنی قوم کی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے بھی واقعات کو توڑ مروڑ کے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی قوم، ملک، تہذیب اور تمدن پر قدیم انداز کے برخلاف ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon)، ولیم میور (William Mure)، ایچ بی ویلز، (H.B. Wales) آرنلڈ جے ٹائن بی (Arnold J Toynee) اور ول ڈیورنٹ (Will Durant) جیسے مورخین کی تاریخ نویسی کو سراہا گیا ان کی تحریروں میں واقعات کا معروضی مطالعہ ملتا ہے۔ گو ادبی اعتبار سے ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

اس اعتبار سے حقیقی تاریخ نویسی کا کام سیرت نگاری کے بعد ہی شروع ہوا اور یہ بھی مسلمانوں ہی کا طرہ امتیاز ہے کہ انہوں نے اس فن کو ایک معیار عطا کیا اور حقائق کو تحقیق، شہادت اور سند کے ساتھ بعینہ اسی طرح پیش کرنا ضروری قرار دیا جس طرح وہ وقوع پذیر ہوئے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا وہ قول بنیادی اصول بن گیا جس میں کسی خودساختہ بات کو آپؐ سے منسوب کرنے سے منع فرمادیا۔ اسی سبب مسلمان مورخین نے دوسروں کی تاریخ لکھتے ہوئے بھی رطب ویابس سے پرہیز کیا۔

سیرت کا مآخذ دراصل وہ واقعات ہیں جنہیں صحابہ کرامؓ نے قلمبند کرلیا یا انہیں دوسروں تک پہنچادیا، رسول اللہ ﷺ کے درج بالا قول کی روشنی میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہر وہ بات جو آپ کی ذات سے منسوب کی جارہی ہے اس کی تحقیق وتصدیق کے ساتھ ساتھ راوی کی صداقت کے بارے میں تحقیق کی جائے تاکہ کوئی غلط بات آپؐ کے نام سے منسوب نہ ہوجائے۔ اس احتیاط سے اسماء الرجال جیسے وقیع علم کی بنیاد

پڑی جس کی مثال کوئی اور قوم پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اس کے برخلاف جب ہم ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ادب میں حسن ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس میں ممدوح کو بشر سے مافوق البشر بنادیا جائے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شعرانے محبوب کی شان میں اور اپنی محبت کے اظہار میں جو کچھ بھی کہا ہے اس میں اس وقت تک حسن ہی نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ اس میں جھوٹ کی آمیزش نہ ہو اور محبوب کے اوصاف میں وہ چیزیں بھی شامل نہ کردی جائیں جو اس میں نہیں ہیں۔ انگریزی کا ایک مقولہ ہے ''کہ حسن دراصل دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔'' یہی سبب ہے کہ محبوب کی برائی میں بھی عاشق کو ایک حسن نظر آجاتا ہے۔ کسی شعر میں جب تک شاعر اپنی تعریف میں تعلّی کا اظہار نہ کرے یا محبوب کی شان میں وہ باتیں بھی نہ کہے جو جھوٹ پر مبنی ہیں اس وقت تک شعر مزہ نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ محبوب کو خدا اور مسجود تک بنادیا گیا۔

جناب رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس ہر مسلمان کے لئے محبوب کا درجہ رکھتی ہے اور پھر وہ کون سی انسانی خوبی ہے جو آپ کی ذات میں موجود نہیں، دیکھا جائے تو وہ غیر معمولی محبت جو ایک مسلمان آپ کی ذات اقدس سے رکھتا ہے اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ آپ کی تعریف ایک خیالی محبوب سے کہیں زیادہ کرتا۔ لیکن یہاں اس کے سامنے دو باتیں ہمیشہ پیش نظر رہیں۔ ایک یہ کہ آپ کی تعریف میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس میں شرک کا شائبہ نہ ہو جائے اور دوسرے آپ کا یہ قول کہ آپ سے کوئی ایسی بات نہ منسوب کی جائے جو حقیقت پر مبنی نہ ہو۔ اس میں ایک مشکل اس وقت بھی پیش آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسرائیلی روایات کی وہ کثرت ہے جو دشمنان اسلام کی ناپاک کوششوں کے سبب سیرت اور مغازی کی کتابوں میں در آئی ہیں۔ مشہور تابعی ابن مہدی کا قول مشہور ہے کہ جب ہم آنحضرت ﷺ سے حلال وحرام کے احکامات کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو سند کی جانچ سختی سے کرتے ہیں اور راویوں کے متعلق بھی چھان پھٹک کی جاتی ہے لیکن جب فضائل یا ثواب وعذاب سے متعلق احادیث آتی ہیں تو ہم سند کے بارے میں شدت نہیں اختیار کرتے اس لئے سیرت نگاری اور نعت نگاری دونوں میں اس کا التزام رکھنا کہ تحریر میں حقیقت کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کی ادبی حیثیت بھی مجروح نہ ہو ایک بڑا مشکل کام ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سیرت نگار اپنی تحریر میں ادبی پہلو سے پہلوتہی کرنے ہی میں عافیت محسوس کرتے ہیں کہ مبادا جوش محبت میں کوئی بات خلاف واقعہ نہ آجائے یا کسی جگہ تحریر پر کذب کا داغ نہ لگ جائے۔

سیرت نگاری کی ابتدا محمد بن اسحٰق بن یسار سے ہوئی جن کتاب سیرت کے موضوع پر پہلی باضابطہ تصنیف ہے، جو بدقسمتی سے مرور زمانہ کے سبب ضائع ہوگئی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے تحقیق اور تعلیق کے بعد اس کی باقیات کو جمع کیا جو آج سیرت ابن اسحٰق کے نام سے موجود ہے۔ یوں مشہور تابعی امام بن شہاب کی کتاب المغازی کو بھی سیرت کی پہلی کتاب کہا جاسکتا ہے لیکن یہ کتاب ہم تک نہیں پہنچ سکی اس لئے اس کا تذکرہ ہی نہیں کیا جاتا۔ ابن اسحٰق کی کتاب ایک اعتبار سے متنازعہ بھی رہی کیونکہ اس میں کچھ واقعات کی صحت پر علماء کو اعتراض تھا اس لئے ان کے شاگرد ابن ہشام نے اس کے قابل اعتراض حصے نکال کر ایک نئے انداز میں اسی کتاب کو مرتب کیا جسے آج بھی ہم سیرت ابن ہشام کے نام سے جانتے ہیں اور یہی کتاب اب سیرت کی اولین کتاب مانی جاتی ہے جس کا اردو ترجمہ بھی عام طور پر دستیاب ہے۔

سیرت پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں جن کے لکھنے والوں میں اہل ایمان بھی ہیں اور غیر مسلم مستشرقین بھی جن میں بعض

کتابیں محض رسول ﷺ کی سیرت کو داغدار کرنے کی ناکام کوشش ہے لیکن مستشرقین میں ایک ایسا گروہ بھی رہا ہے جنہوں نے سیرت کا معروضی مطالعہ کیا اور ایمانداری کے ساتھ تمام واقعات کو پیش کیا۔ انگریزی میں کیرن آرم اسٹرانگ (Karen Armstrong) کی سیرت محمد (Life of Mohammed) بہت مشہور ہوئی ور آج بھی کثرت سے پڑھی جاتی ہے۔ اسی طرح رومانیہ کے ایک پادری کونسٹنٹین ویرژیل جیورجیو (Constantain Vergel Georgeo) کی سیرت پر کتاب یقینی طور پر ایک بڑا معروضی مطالعہ ہے جو صرف رومانی، فرانسیسی اور فارسی زبانوں میں دستیاب تھی اور حال ہی میں اس کا اردو ترجمہ 'عکسِ سیرت' کے نام سے کلکتہ سے شائع ہوا ہے۔ میرے علم کے مطابق پبلشرس اس کتاب کو بہت جلد ہندی میں بھی پیش کررہے ہیں اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی بمبئی کی اقرا فاؤنڈیشن کروارہی ہے۔ لیکن اہل علم میں اکثر اس بات پر متفق ہیں کہ سیرت پر سب سے زیادہ مفصل، مستند تصنیف مصری عالم دین علامہ علی ابن برہان الدین حلبی کی کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ سیرت حلبیہ کے نام سے آج بھی مل جاتا ہے۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر اسے بجا طور پر 'ام السیر' کا خطاب دیا گیا۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں مولانا محمد اسلم قاسمی نے بچوں کے لئے اردو میں سیرت پر ایک مفصل اور مکمل کتاب لکھی جو ''سیرت پاک'' کے نام سے کئی مرتبہ شائع ہوچکی ہے۔ اس میں آسان و سہل زبان میں انہی کی سطح پر آکر بچوں کو سیرت سے روشناس کروایا گیا ہے۔

مصر کے علامہ محمد غزالی کی ''سیرت پیغمبر اسلام'' بھی ایک خوبصورت کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ ابواظہر مسعود ندوی صاحب کی محنت کا نتیجہ ہے۔ خود علامہ غزالی اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں سیرت کے موضوع پر ایک غیر جانبدار اور بے تعلق مورخ کے بجائے اس انداز میں لکھتا ہوں جیسے کوئی فوجی اپنے کمانڈر کے بارے میں یا کوئی پیروکار اپنے آقا کے بارے میں یا کوئی شاگرد اپنے استاد کے بارے میں لکھے۔ لکھتے وقت میرے سامنے مسلمانوں کی روحانی وفکری پسماندگی کے مناظر بھی رہتے ہیں اس لئے دور ونزدیک سے افسوسناک حال کی جھلکیاں بھی سامنے آجاتی ہیں۔'' (ص:۱۱)

اس کتاب میں کلام اللہ سے جگہ جگہ حوالے مل جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے سیرت نگاری کے لئے کلام اللہ کو ہی اولین مآخذ کے طور پر چنا ہے۔

بعض سیرت نگاروں نے سیرت کو کسی مخصوص زاوئے سے دیکھا اور اس میں ایک حسن کا پہلو تلاش کیا۔ جس کی مثال شام کے مشہور عالم دین ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی کی لکھی سیرت ''فقہ السیر'' ہے جس کا اردو ترجمہ اب ''سیرت رسول دروس اور نصائح'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سیرت کے واقعات کو مختصراً بیان کرکے اس سے دروس واحکام کا استنباط کیا ہے۔ گویا اس میں صرف تاریخ نویسی نہیں ہے بلکہ اس تاریخ کو پڑھنے کا مقصد بھی سامنے رکھا ہے جس سے اس کتاب کی ایک ادبی حیثیت بھی متعین ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے فاضل شاہ مصباح الدین شکیل صاحب کی ''سیرت احمد مجتبیٰ'' ایک اہم نام ہے جس کی ایک خصوصیت اس کے عناوین ہیں جو خالص ادبی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ کو بچپن میں حلیمہ لے جاتی ہیں تو اس واقعے کا عنوان ''حمد باری کو اٹھے دست دعا آخرِ شب'' ہے یا اپنی رضاعی بہن کے کندھے پر بچپن میں آپؐ نے کاٹا تھا جس کا

نشان نصف صدی بعد جب انہوں نے مدینے میں رسول اللہ کو دکھایا تو آپ نے ان کی بڑی تکریم فرمائی۔ اس واقعہ پر عنوان ''روش روش پہ تھے روشن چراغ ادوں کے'' دیا ہے۔ اسی طرح بہت سے عناوین مصرعوں کی شکل میں یا کسی خوبصورت ترکیب کی شکل میں جیسے: ماورائے سخن بھی ہے اک بات، ازل کے مصنف کے اوراق فطرت، نہال تمنا، انا کا خول، نمود نبوت اور داغ، شکست وغیرہ، یہ کتابیں تین جلدوں میں ہے، اس میں تفصیلات ادبی رنگ میں بھی پیش کی گئی ہیں جو طوالت چاہتی ہیں۔ جیسے ابوجہل نے جب رسول اللہ کو پتھر مار کر زخمی کیا تھا تو حضرت حمزہؓ نے حالت کفر میں خاندانی محبت اور غیرت کے سبب ابوجہل کو اپنی کمان سے مارا اور زخمی کر دیا اور رسول اللہ ﷺ سے جا کر کہا کہ: برادر زادے! خوش ہو جاؤ کہ میں نے ابوجہل سے تمہارا بدلہ لے لیا تو آپؐ نے فرمایا کہ: چچا میں تو اس وقت خوش ہوتا جب آپ دین اسلام کے ستون بن جاتے۔ اس پر حضرت حمزہؓ نے اسلام قبول کر لیا تھا جس پر مصنف لکھتے ہیں کہ: ''حمایت ہاشمیت، تائید حق میں بدل گئی''

سیرت نگاری کے سلسلہ میں ایک یہ شکایت بھی رہی ہے کہ سیرت کی بعض روایت قرآنی تصریحات کے خلاف جاتی ہیں اور عقلاً بھی ان کی توجیہات پیش کرنا ممکن نہیں اور بہت سی روایات جو قرآنی تصریحات کے عین مطابق ہیں ان سے سیرت نگار اجتناب کرتے نظر آتے ہیں۔ پاکستان کے خالد مسعود نے اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے ''حیات رسول امیؐ'' تصنیف کی۔ خالد مسعود نے اولاً سیرت نبوی میں سے صرف غزوات کو اپنا موضوع بنایا اور ان پر تحقیقی مقالے لکھے لیکن پھر آپؐ کی شخصیت اور دعوت کے بھرپور تعارف کا اضافہ کر کے سیرت پر اپنی کتاب پیش کی۔ اس اعتبار سے یہ کتاب غزوات کا مکمل پس منظر پیش کرتی ہے جس میں اس بات کی رعایت ملتی ہے کہ سیرت کا سب سے اہم مآخذ خود کلام اللہ کو چنا گیا ہے۔ چونکہ رسول اللہ کی سیرت پر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا: ''کان خلقہ القرآن'' اس لئے خالد مسعود کتاب کے مقدمے میں یہ شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ:

> ''حضورؐ کے جدید سیرت نگاروں نے ماضی میں لکھی گئی کتب سیرت پر ہی اعتماد کیا ہے۔ جن لوگوں نے قرآن سے استفادہ کیا ہے وہ بالعموم محض قرآنی آیات کو نقل کر دیتے ہیں، ان سے سیرت نگاری میں مدد نہیں لیتے۔ اس لئے نقل کردہ آیات بے ربط سی نظر آتی ہیں۔'' (ص، ۱۱)

حالانکہ اردو میں علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی اور وہ آج بھی اردو میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور مستند کتاب مانی جاتی ہے لیکن بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ علامہ شبلی نعمانی نے فارسی میں بھی ''بدء الاسلام'' کے نام سے سیرت پر ایک مختصر کتاب تحریر کی تھی جس کا اردو ترجمہ مولانا حمید فراحی صاحب نے ''آغاز اسلام'' کے نام سے کیا تھا۔

سیرت نگاری میں بعض حضرات نے بالکل مختلف انداز اختیار کیا جس کی سب سے اہم مثال ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی ''محمد رسول اللہؐ'' ہے جو فرانسیسی زبان میں دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ پھر ڈاکٹر حمید اللہ نے انگریزی میں بھی سیرت پر ایک کتاب لکھی جس کا اردو ترجمہ بھی اب آسانی سے دستیاب ہے۔ یہ کوئی بہت ضخیم کتاب نہیں اور مختصر انداز میں جناب رسول اللہؐ کے حالات پیش کئے گئے ہیں لیکن اس میں انداز تحقیقی اختیار کیا گیا ہے جس انداز میں یورپ اور امریکہ میں کام ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس انداز کی کتاب مغرب میں زیادہ قابل قبول ہوگی کیونکہ آپؐ کی زندگی کو پوری ایمانداری کے ساتھ انتہائی جدید انداز

میں پیش کرنا جو جدید بھی ہو اور مغرب میں پسندیدہ بھی ایک فرض کفایت تھا جو ڈاکٹر صاحب نے امت کی طرف سے ادا کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن اور سیرت پر اپنی تحقیقات کے لئے انہوں نے ان تمام مقامات کا دورہ کیا جہاں رسول اللہ ﷺ نے اپنے نقوش پا چھوڑے ہیں اور اس سفر میں بعض مرتبہ اونٹ گھوڑے بھی استعمال کئے اور پا پیادہ بھی سفر کیا۔ سیرت پر ان کی یہ کتاب ایک طریقے سے مختلف ادیان کا تقابلی مطالعہ بھی ہے کیونکہ انہوں نے اس زمانے میں موجود تمام مذاہب پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ان سے متعلق معلومات جمع کی ہیں۔ ساتھ ہی عرب قبائل کی تفصیلات ان کا طرز معاشرت، آپؐ کے نکاح ان کا پس منظر اور اور آپؐ کے قائم کردہ اقتصادی نظام، قوانین، داخلی اور خارجی مسائل اور خارجہ پالیسی پر بھی مباحث پیش کئے ہیں۔

ایک مسلمان جب سیرت نگاری کرتا ہے تو اس میں جناب رسول اللہ ﷺ کے اس عشق اور محبت کا پرتو نظر آنا لازمی ہے جو ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے۔ اسی لئے سیرت نگاری اپنے میں بہت سے پہلو لئے ہوئے ہے اور ہر پہلو دوسرے سے جداگانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کی ہر کتاب کو پڑھنے میں قاری کو وہی لطف اور حظ حاصل ہوتا ہے جو کسی نئی کتاب کے پڑھنے میں ہوسکتا ہے اور یہی چیز ہے جسے ہم سیرت کا ادبی پہلو کہہ سکتے ہیں۔ یوں تو سیرت نگاری دراصل تاریخ نگاری ہی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سیرت پر ہر کتاب اپنے میں ایک ادبی چاشنی بھی لئے ہوئے ہے جو اس ذات اقدسؐ سے انتہائی محبت کے سبب سے ہے جس کی تاریخ لکھی جارہی ہے۔ لیکن مختلف سیرنگاروں میں اس محبت کے اظہار کے انداز ہمیں مختلف ملیں گے۔ جیسے کچھ شعراء نے منظوم سیرت لکھ کر اپنی محبت کا اظہار کیا، فوقؔ جامی کی ''رحمت عالمؐ'' اور قیصر الجعفری مرحوم کی ''چراغ حرم'' تو ہمارے زمانے کی چیزیں ہیں جن میں پوری سیرت کو نظم کیا گیا ہے۔ لیکن منظوم سیرت میں ابوالاثر حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور اس کے ذریعہ انہوں نے بے شمار گھروں میں عام مسلمانوں، خصوصاً عورتوں اور بچوں کو سیرت سے روشناس کروایا۔ شاہنامہ کی سب سے بڑی خوبی اس کا انداز بیان ہے جس میں سادگی کے ساتھ آسان زبان میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ سیرت کے واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کا حال کتنی خوبصورتی سے شروع کرتے ہیں:

ہوا چاروں طرف اقصائے عالم میں پکار آئی
بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی

یا جیسے حق و باطل کی معرکہ آرائی کے لئے حفیظؔ نے جو الفاظ انتخاب کئے ان کے سبب شاہنامہ کے وہ اشعار ایمان کو تازہ کردیتے ہیں چند اشعار نمونے کے پیش ہیں جیسے:

ادھر محو دعا سجدے میں تھا اسلام کا ہادی
ادھر نقارۂ جنگی سے گونجی بدر کی وادی
شجاعت اور جوانمردی عیاں کرنے کا وقت آیا
مقدر آزمانے، مارنے مرنے کا وقت آیا
صدائے شیرِ حق سے چھائی ہیبت قلب دشمن پر
سپر اٹھنے نہ پائی تھی کہ آئی تیغ گردن پر
ادھر بڑھتے چلے آتے تھے پیدل بھی رسالے بھی
صفیں باندھے کھڑے تھے دھوپ میں اللہ والے بھی

اسی طرح نثر میں بھی مصنفین نے مختلف پیرائے اختیار کئے ہیں۔ جیسے ۱۹۸۲ء میں پاکستان کے محمد ولی رازی نے ''ہادیٔ عالمؐ'' کے نام سے ایک غیر منقوط کتاب سیرت پر لکھی۔ چار سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تحریر کو معرا بنانے کی کوشش میں واقعات کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ

چھاڑ نہیں کی گئی یہ ایک مشکل کام تھا لیکن یہ ولی رازی صاحب کی قادرالکلامی کا کمال ہے کہ تحریر میں کہیں جھول محسوس نہیں ہوتا اور کتاب علمی طور پر بھی محکم رہی۔

اسی طرح نعیم صدیقی صاحب کی ''محسن انسانیت'' بھی چھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل کتاب ہے جس کی ادبی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سیرت نگاری کا ذوق اور عقیدت کا جوش رسول اللہ کو مافوق الفطرت ہستی بنا سکتا ہے ایسی سیرت نگاری میں خرق عادت اور معجزات کی غیر معمولی اہمیت ہو جاتی ہے جو عوامی ذوق کی چیزیں ہیں لیکن اس غلو سے بچتے ہوئے واقعات کا انتخاب کرنا اور پوری دیانت داری کے ساتھ انہیں پیش کر دینا مشکل کام ہے۔ بقول ماہر القادری ''سچے موتیوں کے ساتھ خزف ریزے نہ آنے پائیں اور جو واقعہ بھی کتاب میں درج ہو وہ درایت اور روایت کی کسوٹی پر پورا اترتا ہو''۔ حالانکہ یہ ایک تاریخی کتاب ہے لیکن اس میں انداز بیان بے پناہ ادبی حسن رکھتا ہے۔ جیسے آپؐ کی معقولیت اور حق گوئی کے جواب میں کفار کی شرانگیزی کا خاکہ اس طرح کھینچتے ہیں:

> ''دیکھا آپ نے۔ ایک دعوت جو معقول اور پرسکون انداز میں دی جارہی تھی اس پر غور کر کے رائے قائم کرنے اور استدلال کا جواب دلائل سے دینے کے بجائے اندھے جذباتی اشتعال سے دیا جاتا ہے۔ سیدنا محمدؐ کا کلمۂ حق آہنی تلوار سے منوانے نہیں اٹھے لیکن مخالف طاقت معاً تلوار سونت کے آجاتی ہے۔ یہی ایک فاسد نظام کے مفاد پرست مخالفین کی علامت ہے کہ معقولیت کے جواب میں اشتعال اور دلیل کے جواب میں تلوار لئے میدان میں اترتے ہیں۔''

یا حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے قبل کی تاریخ اس طرح لکھتے ہیں:

> ''تشدد کی اس داستان کا وہ باب سب سے ممتاز ہے جو حضرت عمرؓ کے غیض و غضب سے مرتب ہوا تھا۔ عمرؓ ستائیسویں سال میں تھے جبکہ نبوت محمدی کا علم بلند ہوا۔ اسلام جلد ہی آپ کے گھرانے میں نفوذ کر گیا آپ کے بہنوئی سعید پہلے پہل اسلام لائے، ان کے اثر سے ان کی بہن فاطمہ بھی مسلمان ہوگئیں، خاندان کی ایک اور بااثر شخصیت نعیم عبداللہ نے بھی دعوت حق پر لبیک کہی۔''

ایک جگہ مدنی دور میں سیاست نبوی کی تدابیر کے نتیجہ میں جو معاشرہ تشکیل پا رہا تھا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ عقابی شان کے گنے چنے افراد جہاں اپنے نظریات صداقت کے سرگرم داعی تھے وہاں یہ اس نظریہ پر قائم ہونے والی ریاست کا دفاع کرنے کے لئے بہترین جانباز سپاہی بھی ثابت ہوئے۔''

سیرت نویسی میں ادبی پہلو کے اس سلسلے میں ایک بالکل نئے نہج پر ماہر القادری صاحب نے ''درِ یتیم'' لکھی جس میں سیرت کو عوام میں مقبول اور نافع بنانے کے لئے افسانوی پیرایہ اختیار کیا۔ اردو میں تاریخی ناول کوئی نئی چیز نہیں ہیں مائل خیرآبادی، نسیم حجازی، عبدالحلیم شرر اور صادق سردھنوی جیسے ناول نگاروں نے مسلمانوں کے تاریخی واقعات پر کثرت سے ناول لکھے جو اپنے زمانے میں مقبول بھی ہوئے۔ دراصل عوام کی اکثریت قصے کہانیوں کو پسند کرتی ہے اس لئے انہیں نصیحت کرنے کے لئے کلام اللہ نے بھی اکثر یہ پیرایہ اختیار کیا ہے۔ اسی سے متاثر ہو کر بعض حضرات نے مکمل تاریخ کو بیان کرنے کے لئے بھی افسانوی انداز اختیار کیا۔ ایسی تاریخی کتب میں منظر نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے جس سے قاری ذہنی آسودگی بھی حاصل کرتا ہے۔ ساتھ ہی اس میں واقعہ نگاری کے بجائے گفتگو کے ذریعہ کسی واقعے کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ قاری کی

دلچسپی قائم رہے۔ عموماً یہ گفتگو مصنف کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوتی ہے جس سے تاریخ کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ مثلاً رسول اللہ کے والد عبداللہ کی جان بچانے کے لئے عبدالمطلب کاہنہ کے پاس گئے اور کہا کہ ہم چاہتے ہی کہ عبداللہ کی جان بچ جائے تو اس واقعے کو ماہرالقادری ''درِ یتیم'' میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

''اس پر کاہنہ نے قہقہہ لگایا، بڑے بڑے دانتوں کی پیلاہٹ نے اس تلطف آمیز قہقہے کو ڈراؤنا بنادیا۔ وہ اپنے خاص انداز میں بولی: ''منت دوسری طرح بھی پوری ہوسکتی ہے! عبداللہ کے نام کے ساتھ اونٹوں کا بھی قرعہ ڈالو، یہاں تک کہ عبداللہ کی جگہ اونٹوں کا نام نکل آئے، تب اونٹ قربان کردئے جائیں، منت پوری ہوجائے گی۔'' (ص۔۱۳)

ظاہر ہے تاریخ میں نہ کاہنہ کا حلیہ موجود ہے اور نہ ہی اس کی گفتگو کی تفصیل۔ یہ سب تحریر کو دلچسپ بنانے کے لئے اور اس میں افسانوی رنگ بھرنے کے لئے ہے۔ یا ایک جگہ کفار مکہ کی گفتگو پیش کرتے ہیں:

''مگر میں کہتا ہوں محمد ابن عبداللہ ہمیشہ سے ہمارے بتوں کے مخالف رہے ہیں۔'' ایک قریشی نے کہا ''نہیں یہ بات نہیں ہے۔'' دوسرے شخص نے جواب دیا:

''ارے صاحب آپ تو خوش فہمیوں کے شبستانوں میں رہنے والے ہیں اور معاف فرمایئے کم نظر بھی۔'' (ص:۸۹)

ظاہر ہے اس گفتگو کا تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس وقت کفار نے اس سلسلے میں کیا گفتگو کی ہوگی۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ کسی شخصیت یا کردار کی صحیح تصویر کشی کے لئے اچھی اور مرصع زبان ایسی ضروری ہے جیسے ''درِ یتیم'' میں ماہرالقادری لکھتے ہیں:

''ان تمام مخالفتوں، بیزاریوں اور مشکلوں کے باجود خدا کا سچا نبی حق کا اعلان کررہا ہے۔ کوئی مخالفت اس کے عزم محکم میں ذرہ برابر ڈھیل نہ پیدا کرسکتی تھی۔ صبرو استقامت اور حق وصداقت میں اس کی ذات کوہ گراں تھی۔ یہ تمام طوفان بے اثر ثابت ہوئے، اس کی رسالت کا چراغ آندھیوں کی گود میں بھی جلتا رہا اور تیزاب کے دھارے میں بھی اس کی صداقت کا پودا نشو نما پاتا رہا۔ فتح و نصرت اس کا مقدرر ہو چکی تھی۔'' (ص،۹۱)

ماہرالقادری ایک قادرالکلام شاعر ہیں اور یہ کتاب انہوں نے عشق میں ڈوب کے لکھی ہے۔ تاریخ اور افسانے میں بہت فرق ہوتا ہے لیکن ماہرالقادری صاحب کے عشق یا ادبی ذوق نے کتاب پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کی جو اس کتاب کا سب سے بڑا کمال ہے۔ سیرت پر اس کتاب کے ادبی محاسن پر ایک مستقل مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اشہب قلم کی باگ اپنے ہاتھ ہی میں رکھی اور اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ واقعات کی تاریخی حیثیت مجروح نہ ہونے پائے، ادبی پیرایہ صرف اپنی محبت کے اظہار کے لئے ہی استعمال کیا جیسے رسول اللہ ﷺ جب ہجرت کے لئے مکہ چھوڑ کر جارہے ہیں وہاں وہ لکھتے ہیں:

''حب وطن محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں سے لپٹ گئی کہ ام القریٰ کو چھوڑ کر کہاں جاتے ہو، اپنی برکتوں سے مکہ کو محتوم نہ کرو، گلیاں کوچے اور بازار کہہ رہے تھے کہ محمد! تمہارے نقشِ قدم ہمارے سینوں میں محفوظ ہیں، جارہے ہو تم ہمیں بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ مبارک قدم اب ہمیں کہاں میسر آئیں گے۔ اے امن وسلامتی کے پیغمبر! دیس چھوڑ کر پردیس نہ جا، غربت میں نہ جانے کوئی غمخواری کرے نہ کرے۔ کعبہ کے در وبام پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے کوئی غمخوار اور محسن بچھڑ رہا

ہے۔ میزاب رحمت سے حطیم تک سب سوگوار تھے۔''
(ص،۱۴۱)

حضرت خبیبؓ کی پھانسی کا دردناک منظر بھی وہ عجیب انداز میں پیش کرتے ہیں:

''ظلم کے تیور پھر خشم آلودہ ہو گئے ،شقاوت نے جھرجھری لی، دل کی سیاہی اور زیادہ پھیل گئی، دلیلوں کا کام سولی کی نوک سے لیا گیا، خبیبؓ شہید کردئے گئے مگر جان دیتے وقت ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے وہ موت کا خوشی کے ساتھ استقبال کررہے ہیں۔'' (ص،۱۸۸)

مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی ایک مختصر کتابچہ میں جو سو صفحات پر مشتمل ہے سیرت نبوی پیش کی تھی جس کے لکھنے کا مقصد بقول خود ان کے یہ تھا کہ سیرت پر ایک اتنی مختصر کتاب ہو کہ جسے ایک یا دو مجلسوں میں ختم کیا جاسکے تا کہ رسول اللہؐ کا ایک اجمالی خاکہ سامنے آجائے اور جامعیت بھی باقی رہے ساتھ ہی بعض مسائل پر فقہی انداز میں گفتگو بھی پیش کی جاسکے۔ یہ کتاب ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) میں شائع ہوئی تھی اور شائد ہی کسی کے پاس مل سکے۔

تاریخ میں یقیناً بعض شخصیتوں کی گفتگو اور آپسی باتیں ہوتی ہیں لیکن افسانوی رنگ اختیار کرنے میں کچھ فرضی کردار اور ان کی باتیں بھی پیش کرنی پڑتی ہیں تا کہ وہ واقعہ مکمل طور پر قادری کے ذہن میں منعکس ہو جائے۔ اس سے واقعہ دلچسپ ضرور ہو جاتا ہے مگر اس کی تاریخی حیثیت مجروح ہوتی ہے۔

سیرت نگاری کے مقاصد بھی مختلف رہے ہیں مثلاً کسی نے آپؐ کے صرف حالات پیش کردیئے جو صرف واقعات نگاری ہے، کسی نے آپ کی اخلاقیات کا احاطہ کیا اور اخلاقی اصولوں کا سیرت سے استنباط کیا، کسی میں آپؐ کی ذات ایک ہادی کی شکل میں ابھرتی ہے جس میں سیرت نگار نے آپ کے نور ہدایت سے شمعیں جلانے کی کوشش کی ہے، تو کہیں آپ مصلح نظر آتے ہیں اور معاشرتی اصولوں اور ضابطوں کی حد بندی فرماتے نظر آتے ہیں۔ کہیں آپ ایک جنگ کے کمانڈر ہیں اور جنگ کے سلسلے میں اخلاقی ضابطے متعین فرمارہے ہیں۔ غرض آپ کی ذات کے اتنے پہلو ہیں کہ قیامت تک سیرت نگاری ہوتی رہے گی لیکن سیرت نگار نہ تو موضوعات کی تنگی محسوس کرے گا اور نہ ہی قاری کی تشنگی ختم ہوگی۔

☆☆☆

اس مقالے کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

محمد رسول اللہؐ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، فرید بک ڈپو، دہلی
سیرت حلبیہ، علامہ علی ابن برہان الدین حلبی (ترجمہ مولانا محمد اسلم قاسمی، زکریا بک ڈپو، دیوبند
سیرت ابن اسحٰق، محمد بن اسحٰق یسار (ترجمہ نور الٰہی)، ملی پبلیکیشز، دہلی
دُرِّ یتیم، ماہر القادری، مرکزی مکتبۂ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی
سیرت ابن ہشام، عبد الملک بن محمد بن ہشام (مرتب محمد احسان الحق اسلیمانی)، اسلامک بک فائنڈیشن، نئی دہلی
سیرت احمد مجتبیٰؐ، شاہ مصباح الدین شکیل، الرحمٰن پرنٹرس، وپبلشرس، کلکتہ
سیرت النبیؐ، حافظ عماد الدین ابن کثیر، حافظی بک ڈپو، دیوبند
سیرت رسولؐ دروس وصائح، ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی، (ترجمہ ڈاکٹر رضی الاسلام) مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز دہلی
ہادیٔ عالم محمد ولی رازی، دار العلم، کراچی
حیات رسول امیؐ، خالد مسعود، قرآن وسنت اکیڈمی، نئی دہلی
سیرت پاکؐ، مولانا محمد اسلم قاسمی،
سیرت خاتم الانبیاءؐ، مفتی محمد شفیع، کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند
بدء الاسلام، شبلی نعمانیؒ، (ترجمہ حمید الدین فراہی)

☆☆☆

پدماوت اور ذکر رسولؐ

.....سید ضیاء الحسن

ہندی زبان وادب کے مشہور صوفی شاعر ملک محمد جائسی کو ہندی والے ''دردمحبت کا رازدان'' کہتے ہیں ان کی پیدائش خود جائسی کے قول کے مطابق ''جائس نگر'' میں ہوئی۔ یہ علاقہ ضلع رائے بریلی یوپی کا ایک قصبہ ہے۔ بعض محققین نے ان کی جائے پیدائش غازی پور بتلائی ہے لیکن زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ وہ ۱۴۹۲ء میں قصبہ جائس، ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ ہندی ادب کی تاریخی کتب میں ان کے والد کا نام شیخ ممریز ملتا ہے البتہ والدہ کا نام ابھی تک پردۂ خفا میں ہے۔ تاریخ ادبیات ہندی میں تحریر ہے کہ بچپن ہی میں ان کے والدین کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا تھا اور قریبی اعزہ میں کوئی ایسا نہ تھا جو ان کی داخت و پرداخت کی ذمہ داری قبول کرتا چنانچہ یہ یتیم بچہ سادھوؤں اور سنتوں کے حلقوں میں پرورش پاتا رہا اور ان ہی کی تربیت میں راہ تصوف پر گامزن ہوگیا۔ لیکن جلد ہی جائسی اپنے وقت کے بزرگ اور مشہور صوفی شیخ محی الدین عرف شیخ محدی کو اپنا گرومان کر ان کی تربیت میں آگئے۔

جائسی کی تعلیم کے بارے میں زیادہ معلومات نہ ہوسکیں تاہم یہ امر مسلم ہے کہ وہ بڑے دانشمند تھے، انھیں ویدانت یعنی ویدوں کا علم، جیوتش یعنی علوم نجوم اور علم فلکیات سے واقفیت، درشن یعنی فلسفہ، رسائن یعنی علم کیمیا اور ہٹ یوگ یعنی علم ورزشِ خصوصی میں غیر معمولی دخل تھا۔

جائسی کا خاصہ وقت غازی پور اور بھوجپور کے راجہ کے آشرم میں بھی گذرا ہے۔ بعد میں وہ امیٹھی کے راجہ مان سنگھ کی خواہش پر ان کے دربار سے وابستہ ہوگئے تھے۔ ۱۵۴۲ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

ملک محمد جائسی عشق مجازی کے بجائے عشق حقیقی میں یقین رکھتے تھے اور وصال کے بجائے ہجر کی شدت کو معرفت الٰہی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''ہجر کی شدت ہی انسان میں معرفت الٰہی کو پروان چڑھاتی ہے۔'' الغرض جائسی کی پوری شاعری میں ہجر کا بیان بڑے لطیف پیرائے میں نظر آتا ہے۔ اسی لئے انھیں عشق حقیقی کا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔ جائسی ایک صوفی شاعر اور صوفیانہ شاعری کے رمزشناس تھے۔ ان کی شاعری دل کے تاروں کو جھنجھوڑنے والی ہے۔

جائسی کی تخلیقات میں سب سے زیادہ مشہور کتاب ''پدماوت'' ہے۔ دوسرے نمبر پر ''اخراوٹ'' اور تیسرے نمبر پر ''آخری کلام'' ہے۔ جائسی مذہباً سنی مسلمان تھے وہ اللہ کو اپنا خالق، اور مالک مانتے تھے نیز رسول اللہ ﷺ کو خاتم النبین اور دنیا کو سیدھا راستہ بتانے والا جانتے تھے وہ اپنی کتاب ''پدماوت'' میں ایک چوپائی اور دوہے کے ذریعہ رسول اکرمؐ کا ذکر اپنے یقین واعتماد کے ساتھ یوں کرتے ہیں۔

اردو رسم الخط	ہندی رسم الخط
کین ھسی پُرشن ایک نرمرا	कीन्हेसि पुरूष एक निरमरा
نام محمد پونوں کرا	नाम मुहम्मद पूनौ- करा
پرتھم جیوتی وِدھی تا کر ساجھی	प्रथम जोति विधि ताकर साझी
اوتے ہی پریتی سیہٹ اُپراجی	औतेहि प्रीति सिहिट उपराजी
دیپک لیسی جگ کہیں دینہا	दीपक लेसि जगत कहें•दीन्हा
بھا نرمل جگ مارگ چینہا	भा निमल जग, मारग चीन्हा
جونہ ہوت ایس پُر اُجیارا	जौ न होत अस पुरूष उजयारा
سوجھی نہ پرت پنتھ اندھیارا	सूझि न परत पंथ अंधियारा
دوسرے ٹھاویں دیو لے لکھے	दूसरे ठांवे दैव वै लिखे
بھے دھرمی جے پاڑھت سکھے	भए धरमी जो पाढ़त सिखे
جے ہی نہیں لینھ جنم بھر ناؤں	जेहि नहि लीन्ह जनम भरि नाऊं
تا کہیں کینھ نرکھ میں ٹھاؤں	जगत कहें कीन्ह नरक में ठाऊं
جگت بسیٹھ دئی اُو ہیں کینھا	जगत बसीठ दई ओहिं कीन्हा
دُوؤ جگ تراناؤں جے ہی لینھا	दुऊ जग तरा नावें जेहि लीन्हा
گن اوگن بدھی پُوچھپ	गुन अवगुन बिधि पूछब
ہوانھی لیکھ اوُ جوکھ	होइहि लेखा औ जोखा
وہ دِن اَب آگے ہوئی	वह बिनउब आगे होइ
کرَبَ جگت کر موکھ	करब जगत कर मोखा

جائسی کے اس قطعہ (دوہے) کی تشریح یہ ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی پاک اور متبرک شخصیت کی تخلیق فرمائی جو چودھویں کے چاند کی طرح منور تھی نیز یہ کہ ان کا اسم گرامی محمد (ﷺ) ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ان کے نور کو پیدا کیا اور صرف انھیں کی محبت میں اس دنیا کو وجود بخشا۔ (بالفاظ دیگر۔ محمد نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا)۔ (یا خود حدیث قدسی کہ: لولاك لما خلقت الأفلاك)

الغرض پھر اسی نور سے اس دنیا کو روشن کیا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا عالم جگمگا اٹھا۔ مزید یہ کہ اسی ذات گرامی کے صدقہ میں ساری دنیا کو ایک مالک حقیقی کو پہچاننے اور سیدھا راستہ دکھانے کا بھی انتظام فرمایا۔ اس کے بعد جائسی کہتے ہیں کہ اگر اس نور محمدی کی یہ تابناک روشنی اور ان کی نظر کرم نہ ہوتی تو یہ ساری دنیا ظلمت و تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہوتی اور کسی کو بھی اس اندھیرے میں صراط مستقیم نہ سوجھتا۔ یہی نہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بعد دوسرے نمبر پر آپ ﷺ کے نام نامی اور اسم گرامی کو متعین فرمایا، انھیں رسول بنایا اور اس عہدہ جلیلہ کے ساتھ انھیں دنیا میں مبعوث فرمایا تا کہ اشاعت دین اور کلمہ توحید یعنی لا إله إلا الله محمد رسول الله کی تبلیغ فرمائیں۔ واضح رہے کہ یہ کلمہ آپؐ نے خود باری تعالیٰ سے سیکھا۔ جائسی یہ بھی کہتے ہیں کہ اس دنیا میں جس شخص نے اپنی ساری زندگی میں ان کا نام نہیں لیا (یعنی ان پر ایمان نہیں لایا) اس کا مقام جہنم ہوگا۔ (جبکہ) اللہ کے اس برگزیدہ نبی آخر الزماں پر جو شخص ایمان لایا اور جس نے اس کلمہ کا ورد رکھا وہ دونوں دنیاؤں میں کامیاب اور سرخرو ہوا۔

اس قطعہ کے اختتام پر جائسی اس کلمہ مقدسہ پر اپنے ایمان و یقین کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مالک الملک قیامت کے دن جب اپنے بندوں کے نیک و بد اعمال یعنی اچھے اور برے کرموں کا حساب لے گا اور جب اس مصیبت کی گھڑی میں نفسی نفسی کا عالم ہوگا تو اس آڑے وقت میں ''یہی نور'' یعنی یہ ذات گرامی اللہ جل جلالہ سے اپنے امتیوں کی سفارش کر کے مصیبت سے چھٹکارا اور نجات دلانے میں معاون و مددگار ہوگا۔ اور اس طرح ہمیں ہمیشہ رہنے والی جنت حاصل ہو سکے گی۔

کہتے ہیں کہ اس حساب کتاب کی گھڑی میں ہر نبی اپنے اپنے امتیوں کی سفارش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ بہتوں کی سن لیں گے۔ اور بہت سے ایسے بھی ہوں گے جن کی سنوائی نہ ہوگی۔

بقول شاعر:

کسی سے نہ کچھ ہو گا جب میرے حضرت
وہی بخشوائیں گے سب اپنی امت

حضرات! یہاں تک تو ''پدماوت'' میں ذکر رسولؐ ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ذکر رسول اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک آپ کے چہیتے رفقاء کار یعنی خلفاء ذی وقار ''ابوبکرؓ وعمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ کا تذکرہ شامل نہ کیا جائے۔ کیونکہ یہی تو ان کا عکس اور ان کا نمونہ ہیں اور انھیں چاروں نے انؐ کے مشن کو آگے بڑھایا ہے۔ حدیث میں ہے "اصحابی کا النجوم بایھم اقتدیتم اھدیتم" یعنی میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جنھوں نے ان کی اتباع کی وہ راہ ہدایت پا گئے۔

الغرض جائسی اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھے اس لئے انھوں نے جو دو قطعات تحریر کئے ہیں ان میں ان اصحاب کا ذکر خیر بھی موجود ہے۔ پہلا قطعہ تو آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰؐ کی اہمیت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی برکت، کلمہ توحید کی اہمیت وافادیت اور اس کلمہ سے انحراف کی صورت میں دونوں جہان کی ناکامی کے لئے مختص کر دیا ہے۔ جبکہ دوسرے قطعہ میں مذکورہ چاروں خلفاء کا بالترتیب تذکرہ بڑی عقیدت اور خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔

اس دوسرے قطعہ میں جائسی خلفاء رضی اللہ عنہم کو یوں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں:

اردو رسم الخط	ہندی رسم الخط
چارمیت جو محمد ٹھاؤں	चारि मीत जो मुहम्मद ठाऊं
جن ہیں دین جگ نرمل ناؤں	जिन्हीहं दीन्ह जगनिरमल नाऊं
ابو بکر صدیقؓ سیانے	अबू बकर सिद्दीक़ सयाने
پہلے صِدکِ دین بیعانے	पहिले सिदिक दीन बइ आने
پُنِ سو عمر خطاب سہائے	पुनि सो उमर खिताब सुहाए
بھا جگ عد دین جو آئے	भा जग अदल दीन जो आए
پومی عثمان پنڈت بڑگی	पुमि उसमान पंडित बड़ गुनी
لکھا پُران جو آیت سنی	लिखापुरान जो आयत सुनी
چوتھے علی سنگھ بَریارو	चौथे अली सिंह बरियारू
سوئیں نہ کوؤ رہا جوجھارو	सोइं न कोऊ रहा जुझारू
چارِو ایک متے اک بانا	चारिउएक मतै, एक बाना
ایک پنتھ او اک سندھانا	एक पंथ और एक संधाना
بچنا یک جو سنائی سانچا	बचन एक जो सूना बइ सांचा
بھا پروان.....	भा परवान.....
جو پُران ودھی پٹھوا، سوئی پڑھت گرنتھ	जो पुरान विधि पठवा सोई पढ़त गरंथ
اور جو بھولے آوت سوئی سن لاگے پنتھ	और जो भूले आवत, सोई सुनि लागे पंथ

ان اشعار کی بھی تشریح ملاحظہ فرمائیں:

جائسی کہتے ہیں: رسول اکرم نور مجسم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بعد ان کے قریب ترین چار دوست یکے بعد دیگرے ان کے خلیفہ ہوئے یہ چاروں اپنے شاندار کارناموں کی بدولت دنیا میں مشہور ہوئے ان چاروں کے نام دونوں جہاں میں بے مثال ہیں۔ ان میں پہلے خلیفہ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جو بہت دیانتدار، ذہین، سچے اور دانشمند تھے، انھوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور نبی اکرم ﷺ کے نبی ہونے کی شہادت دی آپ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے۔ اسلام کی تاریخ میں انھوں نے عدل وانصاف کے وہ شاندار نمونے پیش کئے جو رہتی دنیا تک ان کے نام کو زندہ رکھیں گے۔ حضرت عمرؓ بھی بہت ذہین، ہوشیار، عقلمند اور دور اندیش تھے۔ آپ کے بعد حضرت عثمان غنیؓ تیسرے خلیفہ بنے۔ انھیں جامع القرآن کہا جاتا ہے یہ بڑے ذہین اور فطین تھے۔ اپنی اسی ذہانت اور

فطانت کی بدولت وہ رسول اللہ ﷺ سے آیات قرآنی سن کر اپنے حافظے میں محفوظ کرلیا کرتے تھے۔ جنھیں بعد میں تحریری شکل عطا کی۔ یعنی موجودہ دور میں جو قرآن ہم لوگ پڑھتے ہیں یہ ان ہی کی بدولت اس شکل میں ہمیں ملا ہے۔ حضرت عثمانؓ کے بعد خلافت کی ذمہ داری حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے سنبھالی۔ یہ چوتھے اور آخری خلیفہ رسولؐ تھے۔ آپ بڑی خوبیوں کے مالک (اور داماد رسولؐ) تھے۔ معاملہ فہمی، حاضر جوابی، دور اندیشی، ہوشیاری اور عقلمندی کے علاوہ ان میں ایک صفت بہادری کی بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ انھیں شیر خدا بھی کہتے ہیں۔ عام طور سے ان کے مقابل بڑے بڑے بہادر بھی آتے ہوئے کتراتے تھے۔ الغرض ان چاروں خلفاء کا ایک مسلک تھا اور یہ سب ایک ہی راستہ پر گامزن تھے۔ ان کا واحد مقصد اسلام کو فروغ دینا اور کلمہ توحید کی اشاعت تھا۔ ان حضرات نے جن لوگوں کے سامنے اس مثالی کلمہ کو پیش کیا ان میں سے اکثر صحیح الدماغ افراد نے اسے بسروچشم قبول کیا اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب یعنی قرآن پر ایمان لائے۔ ہاں! کچھ منکرین رسالت اور منکرین کلام الٰہی ایسے بھی تھے جو اس کلام مقدس کو سننا ہی نہیں چاہتے تھے پھر اگر کسی طرح آیات قرآنی سن لیتے تو اس کا اثر قبول کئے بغیر نہ رہتے۔ جس کا نتیجہ بس یہی نکلتا کہ وہ مسلمان ہوجاتے۔

مذکورہ دونوں قطعات سے ایک تو ملک محمد جائسی کا رسول اکرام صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق، ان سے محبت اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندی میں بھی سیرت رسولؐ پر مواد موجود ہے۔ اگر مزید تحقیق کی جائے تو یقیناً اور بھی بہت سے گوشے انشاء اللہ سامنے آئیں گے۔ بس طلب اور جستجو شرط ہے۔

☆☆☆

غزل

منور رانا

جب بھی دیکھا مرے کردار پہ دھبّہ کوئی
دیر تک بیٹھ کے تنہائی میں رویا کوئی

لوگ ماضی کا بھی انداز لگا لیتے ہیں
مجھ کو تو یاد نہیں کل کا بھی قصہ کوئی

بے سبب آنکھ میں آنسو نہیں آیا کرے
آپ سے ہوگا یقیناً مرا رشتہ کوئی

یاد آنے لگا اک دوست کا برتاؤ مجھے
ٹوٹ کر گر پڑا جب شاخ سے پتہ کوئی

بعد میں ساتھ نبھانے کی قسم کھالینا
دیکھ لو جلتا ہوا پہلے پتنگا کوئی

اس کو کچھ دیر سنا لیتا ہوں روداد سفر
راہ میں جب کبھی مل جاتا ہے اپنا کوئی

کیسے سمجھے گا بچھڑنا وہ کسی کا رانا
ٹوٹتے دیکھا نہیں جس نے ستارا کوئی

☆☆☆

سیرتِ نبویؐ اور مراٹھی ہندو مؤلفین:

ایک مطالعہ

.....انیس چشتی

مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم کوئی کام دیرپا، دوررس اور غیر اردو زبان میں نہیں کرتے، مراٹھی زبان سے ہماری ناواقفیت اپنے آپ میں خود ایک منفی رجحان ہے۔ بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جن لوگوں کو اسلام آتا ہے انہیں مراٹھی نہیں آتی اور جنھیں مراٹھی آتی ہے انہیں اسلام نہیں آتا۔ مہاراشٹر کے مسلمانوں نے ٹھوس بنیادوں پر مراٹھی میں اسلام لکھنے والوں کی کوئی پود تیار نہیں کی اور نہ ہی اس جانب وہ آج بھی متوجہ ہوئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک مراٹھی اسلامی اکیڈمی قائم کی جائے اور اس میں غیر جانبدار غیر مسلموں سے بھی خالص علمی کام لیا جائے۔

جس طرح انگریزی مستشرقین کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے، بالکل اسی طرح مراٹھی زبان میں اسلام پر لکھنے والوں کی تاریخ بھی زیادہ پرانی نہیں ہے۔ جس طرح یورپ میں اسلام پر اور اسلام کی خلاف لکھنے کا عمل صلیبی جنگوں اور بطور خاص سقوط قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) کے بعد شروع ہوا، اسی طرح اسلام اور بطورِ خاص سیرت نبویؐ کے حوالے سے مراٹھی زبان میں کچھ لکھنے کا عمل انگریزی حکمرانی کے جلو میں وجود میں آیا۔ پچھلی صدی کے مراٹھی مصنفین نے اسلام پر جو کچھ لکھا اس کا تعلق زیادہ تر افہام و تفہیم، اسلام کی تاریخ اور اس کے باطنی حقائق کو منظر عام پر لانا تھا، لیکن آزادی کے بعد اور بطورِ خاص بابری مسجد کی شہادت کے بعد جو مراٹھی لٹریچر سامنے آیا ہے وہ ہندوؤں کا خون کھولانے اور مسلمانوں کی نیندیں حرام کرنے کے لئے کافی ہے۔

اس لٹریچر کی تیاری میں فرقہ پرستوں نے جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے وہ بالکل انگریزوں کی طرز کا ہے، یعنی ہر کتاب کو وہ

ریفرنس بک (حوالہ کتب) کا درجہ دینا چاہتے ہیں، تاکہ یہ زہریلے اثرات آنے والی نسلوں تک محفوظ رہ جائیں اور ان کتابوں میں زیادہ تر انگریز اور نام نہاد مسلم مصنفین کے ہی حوالے دئے جائیں اور ممکنہ طور پر انھیں کے شذرات نقل کئے جاتے رہیں۔

انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں مسلمان تنخواہ یافتہ مصنفین، ملازمین اور منشیوں سے فارسی زبان میں تاریخیں لکھوائیں اور پھر ان کی اصلاح اور درستی کے نام پر ان میں وہ تمام ترمیمات اور اضافے کردیئے جو اس ملک میں ہندو مسلم منافرت پھیلانے کے لئے سودمند ثابت ہوسکتے تھے۔ ان کتابوں کی تیاری کے فوراً بعد ڈاؤسن اور ایلیٹ جیسے نام نہاد مؤرخوں نے ان ہی فارسی کتابوں کے حوالے سے انگریزی زبان میں

"History of India as told by its own Historians"

جیسی فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والی کتابیں لکھ ڈالیں۔ آج تک یہ کتابیں بھارتی دانشوروں کے لئے حوالہ جاتی کتب بنی ہوئی ہیں اور پرائمری اسکولوں سے لے کر تو یونیورسٹی سطح تک یہی کتابیں تاریخ کے نام پر فرقہ پرستی کو جنم دینے کی آماجگاہ بنی ہوئی ہیں۔

جن غیر مسلموں نے اسلام پر لکھا ان میں آچاریہ ونوبا بھاوے، یدوناتھ تھتے، سانے گروجی، وہی جی گورے، ڈاکٹر راجی ڈھیرے، ستیو مادھو پاگڑی، شری پاد جوشی، نارائن کرونکر، ایم وہی پردھان اور شیش راؤ مورے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آچاریہ ونوبا بھاوے نے قرآن کا مطالعہ کیا اور اس میں موجود ان آیات کو اکٹھا کیا جن میں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے دعائیہ کلمات ہیں۔ یہ کتاب ''قرآن سار'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔

ڈاکٹر راجی ڈھیرے نے صوفی ازم پر ایک مبسوط کتاب لکھی جو اِن دنوں ''راشٹریہ ایکاتمتے چے پرتیک'' کے نام سے بازار میں موجود ہے، اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ صوفی حضرات اس ملک میں قومی یکجہتی کی سب سے بڑی علامت ہیں۔

اسلام اور سیرتِ نبویؐ پر جن مراٹھی مؤلفین نے قلم اٹھایا ہے، ان میں ایک اہم نام سانے گروجی (1899ء تا 1950ء) کا ہے یہ ایک سماجی کارکن، شاعر، ناول نگار اور بچوں کے ادب کے تخلیق کار تھے۔ گاندھی جی کے نظریات سے متاثر ہوکر انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں، ''شیام جی آئی'' (شیام کی ماں) ان کا مشہور ناول ہے جس پر فلم بھی بن چکی ہے۔ سانے گروجی نے اسلامی تعلیمات پر مبنی ''اسلامی سنسکرتی'' نامی مراٹھی زبان میں ایک مبسوط کتاب لکھی۔ گو کہ یہ کتاب خالصتاً سیرت نبویؐ پر مشتمل نہیں ہے لیکن اس میں سیرتؐ کے متعدد پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اسلام پر مراٹھی زبان میں یہ سب سے مقبول کتاب تسلیم کی گئی ہے اور اس کے اب تک متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

ستیو مادھو پگڑی (1910ء تا 1994ء) مراٹھی زبان کا دوسرا سب سے بڑا نام ہے، جنہوں نے نہ صرف اسلام بلکہ مراٹھی قارئین کو اردو، غالب اور اقبال سے متعارف کروایا۔ اسلام پر ان کی دو تصانیف ''صوفی سمپردائے، اور ''ہندوستانی مسلمان: شودھ آنی بودھ'' (ہندوستانی مسلمان: تفہیم و تعارف) قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں میں بھی سیرت نبویؐ کی بعض جھلکیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

یدوناتھ تھتے مسلمانوں میں ایک غیر مقبول مراٹھی نام ہے۔ گو کہ اس مصنف کا تعلق سانے گروجی اور سوشلسٹ تحریک

سے تھا، لیکن مسلمانوں کی پسماندگی اور خداپرستی کو بہانہ بنا کر انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ کھول دیا۔ حمید دلوائی اسی نام نہاد اصلاح پسند تحریک، ''مسلم ستیہ شودھک منڈل'' کی پیداوار ہے۔ مہاراشٹر کے کثیر الاشاعت روزنامے ''سکال'' میں ہر جمعہ کو ان کا ایک مضمون شائع ہوتا تھا جو وہ ''ملک پرست'' کے عنوان اور قلمی نام سے لکھتے تھے بعد میں یہی مضامین ''ملک پرست'' اور تواریخ کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیئے گئے۔ ان کتابوں کے مشمولات سے مسلم پرسنل لاء مخالف اور اکثر چیزیں تسلیمہ نسرین اور سلمان رشدی کے کام کی ہیں۔

شری پادجوشی (23 جنوری 1920ء تا 24 ستمبر 2002ء) اردو مراٹھی کے مسلمہ ادیب تھے۔ ان کی تعلیم حیدرآباد میں اردو میڈیم سے ہوئی۔ ابتداء گاندھیائی خیالات سے متاثر تھے لیکن بعد میں مسلم مخالف تحریکوں اور تنظیموں میں عملی حصہ لینے لگے۔ ۱۰۰/ سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ اردو ادب کو مراٹھی زبان میں پیش کرنے کو بھی انہوں نے اپنی روٹی روزی کا ذریعہ بنایا۔ اس دوران اسلام اور مسلمانوں پر بہت لکھا۔ مسلمانوں پر لکھی گئی ان کی سب سے مشہور کتاب ''بھارتیہ مسلمان: کال آج آنی اُدیا'' (بھارتیہ مسلمان: کل آج اور کل) ہے۔ سیرت نبویؐ حالانکہ ان کا موضوع نہیں تھا۔ تاہم قرآن اور احادیث کے ترجموں کا اپنی بات کو درست ثابت کرنے کے لئے انہوں نے استعمال کیا ہے۔

مراٹھی زبان میں سیرتِ نبویؐ پر کسی ہندو کی لکھی ہوئی سب سے مکمل کتاب مادھو ونایک پردھان کی لکھی ''محمد پیگمبر'' (محمد پیغمبرؐ) ہے۔ ایم وہی پردھان کے نام سے مشہور اس مصنف کا جنم ۱۸۶۶ء کے لگ بھگ کوکن کے ایک قریب دیوالی میں ہوا۔ ابتدا میں اسکول کی مدرسی کو بطور پیشہ اختیار کیا اور بعد میں مروڑ جنجیرہ کے نواب کے ہاں دیوان کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ان کی زندگی کے حالات بہت کم دستیاب ہیں۔ ہم نے بڑی تحقیق وجستجو کے بعد ان کی زندگی کے بعض حالات ان کے بچے کھچے اہل خانہ اور ان کی ضعیف العمر بیوہ سے حاصل کئے ہیں۔ تقریباً ۳۵۰/ صفحات پر مشتمل یہ کتاب یکم جنوری ۱۹۲۹ء میں سپاری باغ روڈ، پریل، ممبئی سے شائع کی گئی۔ مصنف نے ہندو عقیدے کے مطابق اپنی اس تصنیف کو نہایت عقیدت سے ''حضرت محمد پیغمبرؐ کے چرنوں میں پیش کیا ہے۔ ایم وہی پردھان نے ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔

اس کتاب کے مطالعے کے بعد بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیرتؐ پر مراٹھی زبان میں یہ ایک بھرپور کتاب ہے۔ مصنف کوتاہ بینی، تعصب ذہنی، بہتان تراشی اور افتراء پردازی کے مرض سے پاک اور بڑی حد تک اسلامی افکار و انقلابات کا معترف اور نسلاً برہمن ہونے کے باجود سیرتِ نبویؐ کے تابناک پہلوؤں کا نقیب نظر آتا ہے۔ سیرتؐ کے وہ پہلو جو ہمیشہ مستشرقین اور ناقدین کا ہدف بنے رہے جیسے تعدد ازدواج، ہجرت، اسلام کا تلوار کے زور پر پھیلنا، اسلام میں عورت کا مقام، واقعۂ افک اور بت شکنی وغیرہ کا مصنف نے نہایت بے باکی سے تجزیہ کیا ہے اور حقائق کی بھرپور وکالت کرنے کے بعد مدافعت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اُسوۂ حسنہ کے تجزیہ کے دوران مصنف نے مغرب کے نامور مؤرخین اور مستشرقین مثلاً آرنلڈ، بوس ورتھ اِسمتھ، اسٹینلی لین پول، لیونارڈ، جے کے کورے، ڈاکٹر گستاؤ وِیل اور تھامس کارلائل وغیرہ کی اسلام اور حضور پاکؐ سے متعلق آراء اور انسائیکلوپیڈیا برٹانکا کے مقالے کے مندرجات نقل کئے ہیں۔ حوالہ جات خود مصنف کی وسیع النظری اور گہرے مطالعے کا پتہ دیتے ہیں، بعض کوتاہیوں سے صرفِ نظر، فاضل مصنف کی تحریر میں ایک طرح کا جوش اور اُبال ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ وہ کعبے کی پاسبانی کے لئے صنم خانے سے

اٹھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''اسلام پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ قوتِ بازو اور تلوار کے زور پر پھیلا ہے۔ اور اس کی بنیاد کسی مضبوط فلسفے یا اصول پر قائم نہیں ہے۔''

مصنف نے اس الزام کے دفاع میں ایک پورا باب سپرد قلم کیا ہے۔ اہل ہنود کو مخاطب کر کے وہ لکھتا ہے کہ:

''ہم یہ الزام محض لاعلمی اور اسلام سے عدمِ واقفیت کی بنا پر دہراتے رہتے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں اسلام کا اور حضور کے مشن نیز آپ کے صبر و رضا اور عام معافی کے اعلان نامے کا گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ ہم صرف محمد پیغمبرؐ اسلام کا علمبردار، سے زیادہ آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ آپؐ کی سیرت سے متعلق ہمیں ذرہ برابر معلومات نہیں ہے۔ ہماری درسی کتابیں اس تعلق سے خاموش ہیں۔ تاریخ کی درسی کتاب میں ایک آدھ صفحہ اڑس کر، اسی میں مذہب اسلام اور پیغمبر صاحبؐ کی ادھوری سیرت تحریر کر کے اُس صفحے کو پورا کر دیا جاتا ہے۔ اتنے مختصر وسائل کے ساتھ کسی مذہب کے جملہ اصول و نظریات اور اس کے اسرار جاننا بے حد مشکل ہے۔''

یہ کتاب ناپید تھی۔ راقم الحروف نے اس کے بوسیدہ اور پارینہ اوراق مہاراشٹر بھر کی لائبریریوں سے اکٹھا کئے اور تقریباً ڈھائی برسوں کی شبانہ روز محنتوں کے بعد اس کتاب کے قدیم املاء کو جدید مراٹھی روپ دے کر مرکز المعارف، بمبئی کے توسط سے شائع کروایا۔ صاحب نظراں کے لئے یہ کتاب نعمت غیر مرتقبہ سے کم نہیں۔ داعیانہ سرگرمیاں رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کو مخالف ترین غیر مسلم کے ہاتھ تک پہنچا دینا ہی آج کے دور کا ایک بڑا کارنامہ ہوگا۔

اسلام اور مسلمانوں پر حملے کی چوطرفہ یلغار میں ایک اور بڑا نام شیش راؤ مورے (ناندیڑ) کا بھی شامل ہو گیا ہے۔ بے بدل محقق، زبان و بیان پر زبردست قوت رکھنے والے اس مؤلف کا فکری تعلق و نایک دامودر ساورکر (۱۸۸۳ء تا ۱۹۶۶ء) کی جاری کردہ ہندو احیاء پرست تحریک ہندو مہاسبھا سے ہے۔ ۵۰ سالہ اس بنیاد پرست ہندو مصنف کی یکے بعد دیگرے دو تصانیف ''مسلم منا چا شودھ'' (مسلم ذہنیت کی تلاش) اور ''چار آدرش خلیفہ'' (چار خلفائے راشدین) منظر عام پر آئی ہیں۔ ہر کتاب ۶۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور حوالہ جاتی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں مصنف نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے اور بالکل انگریزوں کی طرز پر اس نے مقامی مذہبی مسلم تعلیم یافتہ طبقے کا تعاون حاصل کیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں ان سے سرٹیفکٹ بھی حاصل کر لیا ہے۔ ان دونوں کتابوں کی تالیف کے دوران اس نے جن علمی خزانوں کو کھنگالا ہے اور کتابوں میں جو کچھ ہاتھ لگا ہے سب بھر دیا ہے، یہ کام صدیوں تک مراٹھی زبان و ادب میں اسلام مخالف اور اسلام موافق مصنفوں کے کام میں آتا رہے گا۔

شیش راؤ مورے کے لکھنے کا انداز دھیما، معزز، گہرا اور قاری کے ذہن و قلب پر اثر کرنے والا ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ دونوں تصانیف نہ اگلے بنے، نہ نگلے بنے، والی ثابت ہوں گی۔ مسلم منا چا شودھ کا نصف اول پورے طور پر سیرت نبویؐ پر مشتمل ہے۔ مصنف نے بڑی فراخدلی سے سیرت کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جن کا تعلق رحمۃ للعالمین سے ہے۔ لیکن پوری کتاب پڑھ لینے کے بعد جو تاثر ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ نبی آخر الزماں بت شکنی، مشرکین اور کفار کے خاتمے کے صرف اس عمل کو پورا کرنے آئے تھے جو بعض وجوہ کی بناء پر ان سے پہلے آنے والے پیغمبروں سے چھوٹ گیا تھا، قرآن کی

بعض آیتوں کا ترجمہ اور نتیجہ مصنف نے اپنے من مانے طریقے سے نکالا ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۲۳ میں مسلمانوں کو منافقین سے فیصلہ کن جنگ کے لئے للکارا جارہا ہے لیکن فاضل مصنف نے ''اے ایمان والو! لڑتے جاؤ اپنے نزدیک کے کافروں سے'' کا مطلب سیدھا سیدھا ملک روم کے عیسائیوں سے لے لیا ہے اور اس کو مزید پکا کرنے کے لئے اس پر ایک فٹ نوٹ بھی لکھ مارا ہے۔ حالانکہ قرآنی سیاق وسباق اس کا اشارہ نہیں دیتے۔

وصال پیغمبرؐ کے واقعے کو شیش راؤ مورے نے محض اپنی لاعلمی کی وجہ سے مدینہ منورہ کو رزم گاہ میں تبدیل کردیا ہے۔ کتاب کے اولین ایڈیشن میں وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ سوائے حضرت علیؓ کے تمام جلیل القدر صحابہ خلافت اور حکمرانی کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے نبرد آزما رہے اور دودنوں تک نعوذ باللہ آپؐ کا جسدِ مبارک حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت ابوعبیدہؓ کی نظروں سے اوجھل رہا اور انھیں اس بات کی خبر تک نہیں ہوئی کہ غسل اور تدفین کا عمل کب انجام پایا۔ مستشرقین کے حوالوں سے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھی اور اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی اور حضرت علیؓ نے اس لئے بیعت نہیں کی کہ آپؓ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ حضرت ابوبکر سے سخت ناراض تھیں۔ متذکرہ بالا تینوں صحابہ جلوس جنازہ اور نمازِ جنازہ میں بھی شریک نہیں ہوئے، یہ سب مصنف کی عدم واقفیت اور اسلامی شعائر سے مغائرت کا نتیجہ ہے۔ اسے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی، سقیفہ بنوساعدہ اور مرقدِ رسولؐ کے درمیانی فاصلوں کا بھی علم نہیں ہے۔

مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم کوئی کام دیرپا، دوررس اور غیر اردو زبان میں نہیں کرتے، مراٹھی زبان سے ہماری ناواقفیت اپنے آپ میں خود ایک منفی رجحان ہے۔ بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جن لوگوں کو اسلام آتا ہے انہیں مراٹھی نہیں آتی اور جنھیں مراٹھی آتی ہے انہیں اسلام نہیں آتا۔ مہاراشٹر کے مسلمانوں نے ٹھوس بنیادوں پر مراٹھی میں اسلام لکھنے والوں کی کوئی پود تیار نہیں کی اور نہ ہی اس جانب وہ آج بھی متوجہ ہوئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک مراٹھی اسلامی اکیڈمی قائم کی جائے اور اس میں غیر جانبدار غیر مسلموں سے بھی خالص علمی کام لیا جائے۔

شیش راؤ مورے کی کتابوں میں اپنی تمام تر کمیوں اور کمزوریوں کے باوجود سیرتؐ پر بڑا اچھا مثبت مواد بھی اکٹھا ہوگیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کتابوں کی تطہیر کی جائے اور انہیں طالب علموں کے لئے بڑے پیمانے پر شائع کیا جائے۔ شیش راؤ مورے نے دستور ہند، سیکولرزم اور یونیفارم سول کوڈ کے تعلق سے ہندوؤں کو بھی بڑے اچھے مشورے دیئے ہیں۔ ان خیالات کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی ضرورت ہے۔

کوئی بھی ملک علاقہ زمین، قانون اور افراد سے مل کر بنتا ہے۔ ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں مختلف عقائد، مذہب، رسوم و رواج اور زبانوں کو برتنے والے لوگ رہتے ہیں۔ رہتے آئے ہیں اور رہتے رہیں گے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ذہن اور عقیدے کو سمجھیں تاکہ ان میں یگانگت پیدا ہو۔ اگر کسی کتاب کو پڑھ کر یہ تاثر پیدا ہوتا ہو کہ اسلام اس لئے آیا کہ دنیا سے امن وامان غارت ہو جائے اور کفار ومشرکین کے خلاف صرف اور صرف جہاد ہی ہوتا رہے اور اس کے نبی کے بعد آنے والے خلفاء نے اسی روایت کو آگے بڑھایا تو اس میں یہ تاثر دینے والے کا قصور نہیں بلکہ اس تاثر کو قائم رکھنے والوں کا قصور ہے کہ انہوں نے اس کے جواب میں کوئی علمی کام کیوں نہیں کیا؟

☆☆☆

محمد فرمان ندوی

چند اہم کتب سیرت کا ادبی جائزہ

نبض ہستی کی تپش، قلب روحانی کی جنبش اور بنی نوع انساں کی سعی و کوشش صدقہ ہے ذات اقدس محمد عربی ﷺ کا، انہی کے پیغام سرمدی کا عملی پرتو سیرت نبوی ہے، اس کشت زار میں رنگ برنگ کے خوشنما پھول ہر صاحب ذوق دعوت نظارہ دے رہے ہیں، عشاق ومحبین نے اس دائمی شاداب اور زرخیز باغ کے مناظر کو قلمبند کرنے میں غیر معمولی محنت کی ہے، اس کے پھول سے عطر کشید کر کے مشام جاں کو معطر کیا ہے اور آبگینہ دل کو مزید صیقل کیا ہے۔

ادب اور سیرت دونوں الگ الگ موضوعات کی شہ سرخیاں ہیں، بظاہر دونوں میں تضاد ہے، کیونکہ سیرت معروضی اور خالص علمی انداز میں زینت تحریر بنتی ہے، جبکہ ادب احساس و تصور کو شائستگی کے ساتھ استعمال کرنے سے فردوس گوش ہوتا ہے، لیکن بقول ممتاز ادیب حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی:

''لکھنے والا کتنا ہی معروضی ہو، اپنے احساس وتصور سے مطلقاً خالی نہیں ہوتا'' (غبار کارواں ۱۱۵-۱۱۶)

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے ایک موقع پر ادب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ادب وہ ہے جس کی عبارت دقیق ہو، ثقیل نہ ہو، سادہ ہو، پھیکی نہ ہو، سلیس ہو، سپاٹ نہ ہو، سنجیدہ ہو، خشک نہ ہو، عام فہم ہو، عامیانہ نہ ہو، لطیف ہو، رکیک نہ ہو، ٹھوس ہو، ٹھس نہ ہو، فکر انگیز ہو، مگر بور کرنے والی نہ ہو، پرزور ہو مگر پرشور نہ ہو۔'' (انشاء ماجدی: ۲۸۷)

اس احساس وتصور کی آمیزش سیرت وتاریخ کے موضوع کو پرکشش بنا دیتی ہے، سیرت جیسے جذبہ کو اپیل کرنے والے موضوع میں احساسات کی ڈور ڈھیلی ہو جاتی ہے اور بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے:

دو چار قدم میں جو چلا جھوم جھوم کے
رعشہ وداع ہوگیا ہاتھوں کو چوم کے

''تاریخ تدوین سیرت'' کے مولف کے بقول ''سیرت کے دو پہلو ہیں، ایک جس کا ادراک ان مادی آنکھوں سے کیا جاسکتا ہے، اس کو اصطلاحی زبان میں مدرک بالأبصار کہتے ہیں، دوسرا پہلو وہ ہے جو دل کی آنکھوں سے نظر آتا ہے اور مدرک بالبصائر کے نام سے جانا جاتا ہے، پہلی قسم ولادت سے لے کر دم واپسیں تک ہے اور دوسری قسم ان صفات سے عبارت ہے جو خشوع وخضوع، توکل و ابتہال اور اخلاص وتقویٰ سے متعلق ہیں۔ (ص:۱۹)

عربی زبان میں سیرت کا سرمایہ اور اولین سیرت نگار

ان دونوں گوشوں پر تقریباً ہر مستعمل زبان میں ایک معتد

بہ ذخیرہ موجود ہے، "موسوعة نضرة النعيم في مكارم أخلاق النبي الكريم ﷺ" کی تحقیق کے مطابق: صرف عربی زبان میں اس موضوع پر اٹھارہ ہزار سے زیادہ تحریری سرمایہ ہے، أطلس السيرة النبوية کے مرتب ڈاکٹر شوقی ابوخلیل نے اولین سیرت نگاروں کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے: پہلے کے سرخیل أبان بن عثمان (ت ۱۰۵ھ) دوسرے کے ابوبکر بن حزم (ت ۱۳۵ھ) اور تیسرے کے موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق و ابن ہشام اور واقدی ہیں، اس کے بعد اکثر سیرت نگاروں نے انہی افراد کی خوشہ چینی کر کے اپنے خوان علم کو سجایا ہے۔

سیرت ابن ہشام

تدوینی دور کے اولین سیرت نگار محمد بن اسحاق ہیں، اس لئے ابن ہشام نے ان کی کتاب کی تہذیب کر کے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے، اس کو مصدر اساسی کی حیثیت حاصل ہے، یہ حقیقت ہے کہ سیرت وسوانح کا ادب بہت ہی دلنواز ہوتا ہے، حشو و زوائد سے پاک، کوثر تسنیم سے دھلی ہوئی بے لاگ زبان میں عکس محبوب کو رونق بزم کیا جاتا ہے، اس تفصیل کے تناظر میں سیرت ابن ہشام ادبی اور فنی خوبیوں سے مالا مال ہے، ایجاز بیانی، حقیقت کی ترجمانی، نکات کی گل پاشی اور تعبیرات کی تابانی اس کے نمایاں اوصاف ہیں، اس کی شہادت کتاب کی سطر سطر دے رہی ہے، مثلاً حضرت ابوطالب اپنے ہمراہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ کو شام لے گئے تھے، دوران سفر بحیری راہب سے آپ کی ملاقات ہوئی، اس نے پوچھا تھا کہ اس لڑکے سے آپ کا کیا رشتہ ہے، اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے صاحب کتاب ابن ہشام نے نہایت بلیغ مختصر ترین تعبیر استعمال کی ہے، قبل اس کے کہ ہم اس کو ذکر کریں اس جملہ کو "اس لڑکے سے آپ کا کیا رشتہ ہے" کئی انداز سے عربی قالب میں ڈھالتے ہیں:

(۱) ماهي العلاقة التى تربط بينه و بينك؟
(۲) بيّن الوشيجة التي توصلك بهذا الولد.
(۳) كيف نسب هذا الغلام منك؟
(٤) من أنت لهذا الغلام؟
(٥) ماهي الآصرة التي بينك و بينه؟
(٦) ماصلة هذا الولد بك؟

ابن ہشام نے ان تمام جملوں کے علاوہ بالکل ایک نئے اسلوب میں اپنی بات کہی ہے، فرماتے ہیں: "ماهذا الغلام منك" صرف حروف کے ہلکے سے ردوبدل نے اس کے اندر معنویت پیدا کر دی ہے۔ غبار کارواں کے مصنف نے اسی حقیقت کیطرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ادب ایک ہنر ہے، ایک امتیازی صلاحیت ہے، ہر ایک کو اس پر دسترس نہیں ہوتی، اور جس کو اس پر دسترس ہو جاتی ہے، وہ اپنا اور اپنی بات کا سکہ دوسروں پر جما لیتا ہے۔ (۳۴)

ہندوستان کے سب سے پہلے اردو سیرت نگار

میر عرب کو جس سرزمین سے ٹھنڈی فرحت بخش ہوا ملی تھی وہ غیر منقسم ہندو پاک ہے، رنگ حجاز اسکی نواؤں میں رچا بسا ہوا ہے، یہاں کے باشندوں نے اپنے خاص طرز و انداز میں سوز دروں کے ساز کو چھیڑا، سب سے پہلے اردو میں فوائد بدریہ مولفہ بدر الملۃ جناب محمد صبغت اللہ صاحب تصنیف کی گئی، یہ ۱۲۶۳ء میں مطبع کشن راج مدراس سے چھپ کر منظر عام پر آئی، اس کی زبان قدیم اردو پر مشتمل ہے، اس لئے موجودہ اردو کے معیار فصاحت پر پوری نہیں اترتی، لیکن اس میں رسول اکرم ﷺ کی صورت با جمال اور سیرت با کمال کا تذکرہ اچھے انداز میں کیا گیا ہے، بہر حال اس کوشش کی الفضل للمتقدم کے پیش نظر اہمیت ہے۔

اس جرأتمندانہ اقدام کے بعد اردو میں مختصر و مطول انداز میں سیرت رسولؐ سے متعلق کتابیں اور کتابچے لکھے گئے، ان میں دو قسم کے اسلوب نمایاں ہیں: (۱) عاقلانہ، عالمانہ اور متکلمانہ انداز (۲) خطیبانہ، عاشقانہ اور والہانہ طرز، یہ دونوں طرز تحریر اردو میں مقبول ہیں۔

پہلے انداز تحریر کی کامل جلوہ آرائی اردو کی ان کتابوں رحمۃ للعالمین، سیرۃ النبی، اُصح السیر، سیرۃ المصطفی اور نبی رحمت میں نمایاں ہے، اب آیئے ان کتابوں کی مشمولات اور مواد کی روشنی میں ادبی جائزہ لیتے ہیں:

رحمۃ للعالمین کا ادبی جائزہ

(۱) رحمۃ للعالمین بیسوی صدی کے نصف اول میں قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ کی یہ تصنیف ہے، یہ روایات کی صحت، واقعات کی زمانی ترتیب، درمیان میں اوچھے اور نامعقول اشکالات کے جوابات اور نتائج اخذ کرنے کے صحیح لائحہ عمل کی تعیین سے مزین ہے، اس کی ہر سطر محبت رسول میں ڈوب کر لکھی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

''مجھے یقین ہے کہ جب تک ہندوستان میں اسلام کا دریا لہریں لیتا رہے گا۔ رحمۃ للعالمین کے یہ کاغذی سفینے مسلمانوں کی سلامتی ایمانی کے لئے اس میں چلتے پھرتے تیرتے ابھرتے نظر آئیں گے۔'' (مقدمہ کتاب ہذا جلد سوم)۔ کتاب کی زبان بہت سادہ ہے، انداز بیان عالمانہ اور طریق استدلال منطقیانہ ہے، تین جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں الفاظ و ترکیبوں کا رچاؤ، تشبیہات واستعارات کا یہ کفیات استعمال اور محاورات کا فن کارانہ انتخاب مصنف کے پختہ ذوق کی دلیل ہے، اس دعویٰ کی دلیل یہ عبارت ہے:

''عقبہ ثانیہ کی بیعت کے بعد نبی ﷺ نے ان مسلمانوں کو جو ابھی مکہ سے باہر نہیں گئے تھے، لیکن جن پر اتنے ظلم وستم ہونے لگے تھے کہ ہمارا وطن ان کے لئے آگ کا پہاڑ بن گیا، شہر یثرب چلنے جانے کی اجازت دی۔'' (رحمۃ للعالمین ج ۱/۸۱)

ذرا اس پر ایک نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی زبان میں وقار، بیان میں ٹھہراؤ، لہجے میں سنجیدگی، پانی کی طرح وہ اپنی سطح ہموار رکھتے ہیں، ایک مورخ کی بے تعصبی، ایک عالم کا باوقار رویہ اور ایک عامی کا انکسار پایا جاتا ہے، انہی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے فرمایا تھا:

''اس کتاب نے میرے دل کو ہلا کر رکھ دیا، میرا دل خوشی سے اس طرح جھوم اٹھا جیسے باد بہاری سے کوئی شاخ جھوم اٹھے، اور پھولوں کے بوجھ سے لٹک جائے۔'' (کاروان مدینہ: ۲۰-۲۱)

سیرت النبی کا ادبی خصوصیات

(۲) سیرت النبی علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی مشترک تصنیف ہے، مشہور ناقد شیخ محمد اکرام کے الفاظ میں: حیات نبوی کی پہلی ڈیڑھ جلد جس محنت، دقت نظر، وسیع علمیت، غور وفکر، حسن استدلال اور ادبی شان کے ساتھ لکھی، اس کی مثال عالم اسلام کے ادب میں مشکل سے ملے گی، (یادگار شبلی: ۴۳۶)

اصل کتاب سے پہلے دو مقدمے ہیں، ایک سیرت نگاری سے متعلق اور دوسرا عرب کی قدیم سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ سے متعلق، علامہ شبلی نے سیرت کے دونوں پہلوؤں کے تناظر میں مواد کو اس طرح ذکر کیا ہے جسے ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے، قدیم وجدید مباحث اور اشکالات کو بہت ہی مدلل انداز میں حل کرنا اس کتاب کا امتیاز ہے، پروفیسر عین الحق صاحب لکھتے ہیں:

''یوں تو سرسید اور قاضی سلیمان کا موضوع تصنیف وہی ہے جو شبلی کا ہے اور تاریخی اعتبار سے دونوں کتابوں کا تذکرہ پہلے آتا ہے، لیکن جہاں تک جدید ذہن کو مطمئن کرنے اور ان کے قلب بیمار کو تسکین و تشفی بخشنے کا تعلق ہے، تو اس وجہ سے دونوں سے اس کا درجہ بڑھا ہوا ہے، مزید شبلی اپنے معاصر سیرت نگاروں کے بالمقابل کہیں زیادہ بہتر ادیب اور انشا پرداز ہیں، اس لئے زبان و بیان اور عبارتوں کی دلکشی و دل آویزی کے ذریعہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔''

ایک ناقد نے ادبی اعتبار سے شبلی کی کتاب سیرۃ النبی کے طویل ہونے پر اعتراض کیا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ سیرت کا موضوع وسیع اور ہشت پہل ہے، جب کلمۃ اللہ غیر مختتم ہیں تو کلمۃ اللہ کے شارح کی سیرت وصورت کا تذکرہ کیسے سمیٹا جا سکتا ہے، اسی وجہ سے امکانی حد تک اس کی طرف توجہ کی گئی ہے۔

علامہ شبلی کے اسلوب کا نمونہ دیکھنا ہو تو ظہور قدسی پر تحریر کردہ عبارت کو مزے لیکر پڑھئے، شبلی وہاں فصاحت و بلاغت کے عروج پر ہیں، انہوں نے جہاں لفظوں کے موتی رولے ہیں وہیں دوسری طرف واقعیت سے ذرہ برابر انحراف نہیں کیا ہے کیونکہ بقول مولانا دریابادی: ''مولانا علم و فضل کے پیکر، ایک ہمہ داں اور تاریخ کے بحر بیکراں، نثر کے تاجدار، تو نظم کے بھی شہسوار اور سب سے پہلے متکلم اسلام تھے۔''

(انشائے ماجدی ۲۸۲-۲۸۸)

اس کے برعکس علامہ سید سلیمان ندویؒ کا اسلوب سیرت نگاری سنجیدگی، بردباری، اعتدال پسندی، اور علمیت کے صفات سے متصف ہے، پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں: سید صاحب تاریخی دیانت وامانت کا اس درجہ لحاظ رکھتے ہیں کہ ان کو اپنی تصنیف میں شاعری کی بہت کم فرصت ملتی ہے، تصانیف میں شبلی کا انداز مشرقی اور سید صاحب کا انداز مغربی ہے

(معارف سلیمان نمبر)۔

پروفیسر رشید احمد کے اس قول کی وضاحت خطبات مدراس اور سیرت کی بقیہ جلدوں سے ہوتی ہے، سیرت میں تحقیقی شان اور متکلمانہ وقار غالب ہے لیکن خطبات مدراس میں اعلی درجہ کا حسنِ بیان اور بے پناہ داعیانہ ولولہ ہے، یہاں سید صاحب کا اسلوب بام عروج پر ہے۔

سیرت مصطفیٰ اور اُصح السیر: ایک مطالعہ

(۳-۴) مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور حکیم عبدالرؤف داناپوری نے سیرت رسول ﷺ کو اپنی تصنیفات کا موضوع بنایا، اول الذکر کی کتاب سیرۃ المصطفی اور ثانی الذکر کی اُصح السیر ہے، دونوں نے غزوات نبوی کو خاصی اہمیت دی ہے، عام الوفود کا تذکرہ بہت مفصل ہے، دونوں شبلی کے تنقید نگار ہیں، دونوں نے مغربی دنیا کی سیرت کے تعلق سے اچھالی گئی غلط فہمیوں سے تعرض نہیں کیا ہے، اصح السیر میں صرف تین معجزات کا تذکرہ ہے جبکہ سیرت المصطفی کی چوتھی جلد کا اکثر حصہ معجزات ہی سے متعلق ہے اور بقول ڈاکٹر محمد خالد محمود ''حکیم صاحب زیادہ منطقی ہیں، اور مولانا ادریس صاحب کے یہاں زیادہ وسعت، گہرائی اور کشادگی پائی جاتی ہے''، دونوں مصنفین کے یہاں ایک خاص بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ان کا رنگ عالمانہ اور انداز محققانہ ہے، اس کی وجہ سے عاشقانہ رنگ پھیکا پڑتا ہے، لیکن بقول محمد ظہیر الدین صاحب: قاری شانِ نبوت کی تحقیق سے سیراب ہوتے ہوئے ان کا فدائی بننے لگتا ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی کی تحریر کا دوسطری نمونہ پیش خدمت ہے:

''شق صدر سے حقیقۃً سینہ کا چاک کرنا مراد ہے، شق صدر سے شرح صدر کے معنی مراد لینا جو ایک خاص قسم کا علم ہے، صریح غلطی ہے، شق صدر حضور کے خاص الخاص معجزات میں سے

ہے، نیز اگر شق صدر سے شرح صدر کے معنی مراد ہوں تو اس حدیث کا کیا مطلب ہو کہ سیون کا نشان جو آپ کے سینہ مبارک پر تھا، صحابۂ کرام اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں'' (سیرت المصطفیٰ: ۶۸) مولانا حکیم دانا پوری نے صرف یہ جملہ: جب آپ پھرنے چلنے لگے تو وہیں شق صدر کا واقعہ پیش آیا، ذکر کیا ہے (اُصح السیر ص:۶)

(۵) مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن حسنی ندویؒ کو اس بات کا شدت کے ساتھ احساس تھا کہ سیرت کے موضوع پر ہر زمانے میں ایسی کتاب تصنیف کی جانی چاہئے جو عصری اسلوب میں قدیم وجدید مصادر سے استفادہ کے بعد لکھی گئی ہو، اور پوری نقد وتمحیص کے بعد واقعات کو ذکر کر کے اس سے خاطر خواہ نتائج نکالے گئے ہوں، مزید عقل کی پاسبانی میں دل کو حدود کے اندر بے لگام بھی کر دیا گیا ہو، چنانچہ آپ نے اصح السیر اور سیرت المصطفیٰ وغیرہ میں اس کی کمی بھی محسوس کی اور نئے انداز میں ایک کتاب لکھی جو ان خوبیوں کی حامل ہے، اور جو مسلم وغیر مسلم دونوں کے سامنے بلا استثناء پیش کرنے کے لائق ہے، گویا اس مہتم بالشان کام کو علمی اور دعوتی دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے مرتب کیا گیا ہے، اس میں حسن بیان، حسنِ ترتیب اور حسنِ انتخاب کی پوری جلوہ گری ہے۔

نبی رحمت کی استنادی حیثیت اور عصری معنویت

نبی رحمت اصلاً عربی زبان میں لکھی گئی، اس کا ترجمہ مولانا محمد الحسنیؒ نے اپنے قلم شگفتہ سے رقم کیا ہے، اصل ترجمہ میں زبان ادب کا ایسا بانکپن ہے کہ قاری کا دامن موتیوں سے بھر جاتا ہے، ذرا اس عبارت کو پڑھ کر اس خیال کو حقیقت کا لبادہ پہنائیے:

''رسول اکرم ﷺ نے جس وقت اپنی عمر کے چالیس سال پورے کئے، اس وقت پوری نسل انسانی تیزی کے ساتھ خودکشی کے راستہ پر گامزن تھی، یہ وہ نازک وقت تھا جب انسانیت کی صبح صادق طلوع ہوئی، محروم و بدنصیب دنیا کی قسمت جاگی، اور اللہ کی سنت بھی یہی ہے کہ جب تاریکی بہت بڑھ جاتی ہے اور قلوب سخت اور مردہ ہونے لگتے ہیں، تو اس کی رحمت کا کوئی جاں نواز جھونکا چلتا اور انسانیت کے خزاں رسیدہ چمن میں پھر بہار آجاتی ہے'' (نبی رحمت: ۱۴۸)

اس عبارت میں حضرت مولاناؒ نے صرف بعثت کا نقشہ ہی نہیں کھینچا، بلکہ ایسے مواقع پر سنت اللہ کے جاری ہونے کی طرف بھی اشارہ بڑے خوبصورت اور دلنواز اسلوب میں کیا ہے، یہی کے عصری معنویت کی دلیل ہے۔

اس کتاب کی معنوی خوبیاں ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں:

(۱) عہد جاہلیت اور جزیرۃ العرب (پر ایسی بیش قیمت معلومات جمع ہیں جو چونٹیوں کے منھ سے شکر کے دانے جمع کرنے کے مصداق ہیں، ایک معتبر ادیب کے یہاں معلومات کی فراوانی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

(۲) حضرت کے سحر طراز قلم نے حیات پاک کے گوشوں کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کی مرکزیت کا احساس ہر قاری کو تڑپانے لگتا ہے۔

(۳) محض سیرت وسوانح کی کتاب کے بجائے ایک کتاب دعوت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

(۴) یہ شذوذ تفردات سے خالی ہے۔

(۵) توازن واعتدال سے کتاب متصف ہے، حجم کے لحاظ سے، اسلوب کے سادہ سپاٹ ہونے کے لحاظ سے اور معجزات کے ذکر میں اعتدال کی راہ اپنانے کے اعتبار سے، مستشرقین کے رد وابطال میں کلامی رنگ سے احتراز کرنے کے

اعتبار سے۔

(۶) مصنف کے تاریخی شعور علم و تحقیق کے قافلے کی ہمرکابی اور عصری حسیت کے آئینہ دار ہیں، اساسی مصادر سے استفادہ کے بعد تاریخ وسیرت کی کتابوں کے علاوہ آٹھ انگریزی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(۷) سیرت کے مباحث سے متعلق بعض اہم تحقیقات پیش کی گئی ہیں مثلاً یٰسین وغیرہ۔

(۸) مصنف نے سیرت کے الگ الگ واقعات کو اپنی ترتیب اور پیشکش کے ذریعہ وحدت کی لڑی میں پرو دیا ہے۔

(۹) پوری کتاب کے مطالعہ سے آپ کا رحمت والا پہلو جھلکتا چھلکتا نظر آتا ہے۔ (مطالعہ تصنیفات: ۱۷۹-۱۹۰)

ان خصوصیات سے متصف ہونے والی کتاب کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کے اندر عصری اسلوب کی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ پرلے درجہ کی بے بصیرتی ہے۔

اردو زبان میں سیرت کی کچھ کتابیں وہ ہیں جن کے اندر جسم انسانی میں حرارت اور جذبات میں گرمی پیدا کرنے کی بدرجۂ اتم صفت موجود ہے، ان میں اعلیٰ درجہ کی صناعی اور تاریخی دیانت بھی ہے اور وہ عشق و وارفتگی کی کیفیت میں ڈوب کر لکھی گئی ہیں، ان میں خوبصورت ترکیبوں اور بہترین جملوں کو موتی کے دانوں کی طرح بکھیر دیا گیا ہے، صحف سماوی سے مستفاد انداز بیاں، خطیبوں کا جوش اور برجستگی، عشاق کی دیوانگی، اور عقل و جذب کی لطیف آمیزش بڑی پرکاری کے ساتھ زینت کتاب ہے، ان میں ذکر رسول، در یتیم، النبی الخاتم، سیرت رسول اکرم، محمد عربی، نقوش سیرت اور اسوۂ حسنہ کے آئینہ میں اور ''ذرا قرن اول کو آواز دینا'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، غالب نے انسان کو محشر خیال کہا ہے، ان کتابوں کا مطالعہ قاری کو محشر عمل بنا دیتا ہے، کیونکہ اس کے مؤلفین کا عقیدہ ہے:

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول، وہی آخر
وہی قرآن، وہی فرقان، وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

یہ چند اہم کتابوں کا نظریاتی جائزہ تھا، مثالوں سے اگر بات کی وضاحت کی جاتی تو کئی صفحات درکار ہوتے کیوں کہ:

☆☆☆

غزل

رضوانؔ فاروقی الہ آبادی

عشق آساں نہیں ہر کسی کے لئے
حوصلہ چاہئے عاشقی کے لئے

دل نہ دیتے انہیں ہم تو کرتے بھی کیا
حسن انکا ہے جب دلبری کے لئے

بہر گل ہو مبارک قرارِ چمن
بوئے گل تو ہے آوارگی کے لئے

لوگ دنیا میں گم کرکے نفس و نفس
جیتے جی مرگئے زندگی کے لئے

گل سے پوچھے تبسم کی قیمت کوئی
دل لہو ہو گیا اک ہنسی کے لئے

یوں بھی دیتے اکثر وہ ساغر کبھی
ہوش رہتا نہیں میکشی کے لئے

ڈھونڈ مت چشمۂ خضر مرجائے گا
جامِ رضوانؔ سے پی زندگی کے لئے

☆☆☆

الحاج عبدالجبار محمد غوث

☆ ادب اسلامی کی خبریں

خطبۂ استقبالیہ

بہ عنوان ''مختلف زبانوں میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ''

الحمد للہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی سید المرسلین وعلی آلہ و أصحابہ أجمعین!

محترم صدر جلسہ جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا سید رابع حسنی ندوی، حضرات مندوبین عالمی رابطہ ادب اسلامی مہمانانِ خصوصی علماء کرام معززین شہر و شرکاء اجلاس۔

ہندوستان کے عظیم تاریخی شہر اورنگ آباد میں اپنے بزرگانِ دین، علمائے امت، دانشورانِ قوم اور ہمدردانِ ملت کا استقبال کرتے ہوئے ہمارے قلوب مسرت و شادمانی سے لبریز و سرشار ہیں ہمارے پاس اپنے مندوبین گرامی و شرکاء جلسہ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ خداوند عالم بزرگ اور برتر کا ہزار ہا شکر کہ اس نے ہمیں یہاں کلمہ "لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ" کی بنیاد پر جمع ہونے کی سعادت بخشی اور ہم بے حد شکر گذار ہیں صدر محترم اور رابطہ کے ذمہ داران کے کہ انہوں نے تمام راحتوں، سہولتوں اور آسائش کی پیشکش کو نظر انداز کر کے اورنگ آباد ہی کو میزبانی کا شرف بخشا۔

اس اظہار حقیقت میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اورنگ آباد دلی کا جواب ہے۔ اسی لئے ۱۴ رویں صدی عیسوی میں شہنشاہ محمد تغلق نے اس کے نواحی علاقہ دولت آباد کو دلی کے بعد دوسرا پایہ تخت بنایا۔ یہ تاریخی شہر دولت آباد اور خلد آباد کے حصار میں ہے جس کے چپہ چپہ پر اولیاء کرام اور بزرگان دعظام کے نقش پا ابھرے ہوئے ہیں۔

بقول جوش ملیح ابادی:

ذرے الماس کے تیرے خس و خاشاک میں ہیں
ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تیری خاک میں ہیں

شاہان بے تاج کی مصنفہ نے جن کا وطن مالوف اورنگ آباد ہے اور جو پاکستان کی خاک میں اب آسودۂ خواب ہیں، کیا خوب کہا ہے:

''اجنٹہ کی نقاشی اور ایلورہ کی سنگتراشی لاکھوں لوگوں کو یہاں لاتی ہے لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جن دلفریب اور پرفضا پہاڑیوں میں غاروں کے اندر ایلورہ کا بت خانہ ہے انہیں پہاڑیوں کی پشت پر ان شاہان بے تاج کے آستانے بھی ہیں جنہوں نے تصوف کے مئے خانے کھولے تھے اور آج تک ان کا روحانی فیض دور دور تک جاری ہے ان میں امیر حسن علا سجزی جیسے صاحب تصنیف بزرگ بھی تھے۔ جنہوں

نے اپنے پیرومرشد حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے ملفوظات ''فوائد الفواد'' میں مرتب کی جو آج تک مشائخ کے لئے مشعل راہ ہیں، وہ بیک وقت ایک اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ انہیں کے قدموں میں ہندوستان کے مشہور مؤرخ اور مصنف مولانا آزاد بلگرامی آسودہ خواب ہیں۔

بقول صوبیدار رضا نواز جنگ ایک صاحب کشف بزرگؒ جو اجمیر سے خلد آباد زیارت کی غرض سے گئے جب وہاں سے اورنگ آباد لوٹے تو جوتے اتار کر چلے کیونکہ بقول ان کے خلد آباد کی پہاڑیوں سے اورنگ آباد کی بستی تک ساری زمین پر ستارے ہی ستارے بکھرے ہوئے ہیں۔ میں نے اتنی زیادہ تعداد میں کسی اور مقام پر ولیوں اور بزرگوں کی روحیں نہیں دیکھیں۔

یہاں کی خاک میں جو چندے آفتاب چندے ماہتاب بزرگ آرام فرما ہیں ان قابل ذکر ہستیوں میں: ''حضرت مومن عارف باللہ صاحب، جلال الدین گنج رواں، حضرت بہاء الدین انصاری، حضرت برہان الدین غریب، حضرت زین الدین داؤد شیرازی، حضرت راجو قتال والد بزرگوار حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودارز، حضرت نظام الدین، مقبول الٰہی اورنگ آبادی، حضرت نور حموی، حضرت مسافر شاہ و پلنگ پوش کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

مؤرخین عموماً اورنگ آباد نواح کی تاریخ سے سرسری گذرے اور ان کو صرف تین مشہور تاریخی واقعات یاد ہیں:

''اولاً علاء الدین خلجی کا دیوگری پر حملہ۔ دوم: سلطان محمد تغلق کا دہلی سے دکن پایۂ تخت منتقل کرنا۔ سوم: مغلیہ سلطنت کے دور آخر میں عالمگیر کا دکن میں طویل قیام۔ صحیح دیکھا جائے تو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے لے کر تقسیم ہند تک کے واقعات میں اولیاء کرام اور صوفیاء عظام کی تاریخ کو یہاں کی سیاست سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد سلطان محمود غزنوی کے پنجاب اور سرہند پر متعدد حملوں سے شروع ہوتی ہے۔ پہلا حملہ ۱۰۰۰ء میں ہوا۔

محمود غزنوی کی کمک تین بڑے بزرگوں کی روحانی مدد کی مرہون منت ہے جو اس کے لشکر میں شریک تھے۔ اول حضرت داتا گنج بخش علی عثمان ہجویری صاحب کشف المحجوب (مقیم لاہور) دوم سالار مسعود غازی جنہوں نے دریائے گھاگھرا کے کنارے مصلی بچھایا، سوم محمود غزنوی کے پیر و مرشد حضرت شیخ ابو الحسن خرقانی، بقول فرشتہ: تلواروں کی چھاؤں، نیزوں کی چمک، تیروں کی بوچھار میں محمود غزنوی نے انہیں کا خرقہ ہاتھوں میں اٹھایا، زمین پر جھک کر خدا کے حضور سجدہ کیا اور اپنے پیر و مرشد کے واسطے سے ان کا خرقہ پکڑ کر خدا کے حضور فتح و نصرت کی دعا کی جو قبول ہوئی۔'' (تاریخ فرشتہ)

محمود غزنوی صرف سومناتھ تک گیا تھا۔ بندھیا چل اور ست پڑا کے پار دکن کو فتح کرنے کا خیال پہلی بار علاء الدین خلجی کو آیا وہ ایک لشکر جرار لے کر دکن کی طرف بڑھا۔ اس وقت اورنگ آباد کا شہر کھڑکی کہلاتا تھا جس کے معنی اونچے نیچے ناہموار راستوں کے ہیں۔ راجہ رام دیو کا دار الخلافہ دیوگری تھا، جو بعد کو دولت آباد کہلایا اور اس کے بعد خلد آباد کی پہاڑیاں تھیں۔ ان پہاڑیوں پر ان دو بزرگوں کے مزارات آج بھی مرجع خلائق ہیں ان ہی سے ایک حضرت مؤمن عارف صاحبؒ باقی باللہ کا ہے اور دوسرا حضرت جلال الدین گنج رواں کا ہے۔ یہ دونوں بزرگ قادریہ اور سہروردیہ سلسلے کے ہیں اور غالباً انہیں کے نقش قدم پر

چلکر خلجی یہاں تک پہنچا تھا۔

۱۳۰۹ء میں دیوگری کی فتح کے بعد ایک روز حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے نوعمر اور ہونہار مرید خواجہ منتجب الدین زرزری بخش کو طلب کیا جو حضرت محمود ہانسوی کے چھوٹے بیٹے تھے اور برہان الدین غریبؒ ان کے بڑے بھائی تھے اور ان سے ارشاد فرمایا کہ 'تم سات سو پالکیاں یعنی ۱۴ سو اولیاء اور مریدوں کو لے کر دکن جاؤ اور وہاں رشد و ہدایت کی داغ بیل ڈالو۔

آپ نے ۱۷ برس تک ہدایت کی ضوء پاش کرنیں پھیلائیں اور اس کے بعد یہ آفتاب رشد و ہدایت ۱۳۲۶ء میں غروب ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محمد تغلق پایہ تخت کو دہلی سے دولت آباد منتقل کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھا۔ اس نے صوفیاء کو بھی حکم دیا کہ وہ بھی دہلی سے دکن چلے جائیں۔

دولت آباد کو جب محمد تغلق نے دارالخلافہ بنایا تو یہ عروس البلاد بن گیا۔ اس کے چپہ چپہ پر تاریخ بکھری پڑی ہے۔ اہل علم نے یہاں علم کے دریا بہادیئے اور ان کے قلم نے وہ بے بہا موتی اگلے کہ علمی دنیا محو حیرت ہوگئی۔ بہت ہی قلیل عرصے میں دولت آباد بام عزت پر جلوہ گر بلند رتبے پر فائز اور مشہور بلاد اسلامیہ کا ہمسر ہوگیا اسی لئے قدسی علیہ الرحمہ نے کیا خوب فرمایا۔

زمین دکن سرنیارد فرود
زفیروز زنگی بچرخ کبود

جن ہستیوں نے علم کی جولانگاہ میں نام کمایا، ان میں سرفہرست ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا نام نامی اسم گرامی ہے۔ آپ دولت آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی۔ ابتدائی تعلیم بھی یہیں حاصل کی۔ شوق علم میں آپ نے دہلی کا سفر کیا۔ دہلی اس وقت منتخب بلاد میں شمار ہوتی تھی اور ہر فن کے باکمال لوگ یہاں جمع تھے۔

سید شرف الدین کیتھلی، مولانا تاج الدین بہادر، مولانا خواجگی، حضرت قاضی عبد المقتدر، قاضی شہاب الدین کے ہم وطن سید گیسودراز جیسے جید علماء کا جمگھٹا تھا۔ قاضی شہاب کو علم کی سچی لگن تھی وہ دھن کے پکے تھے۔ چنانچہ دہلی پہنچے اور مولانا خواجگی اور قاضی عبد المقتدر کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے اور چند ہی دنوں میں اپنے معاصرین میں ممتاز درجہ حاصل کرلیا۔ یہ وہ دور ہے جب افواہیں گرم تھیں کہ امیر تیمور دہلی پر حملہ آور ہونے والا ہے چنانچہ قاضی شہاب الدین نے بھی اپنے استاد مولانا خواجگی کے ہمرکاب دہلی کو خیرباد کہا۔ وہ کالپی میں رہ گئے اور قاضی شہاب الدین نے جونپور کا رخ کیا۔ یہ ۱۴۲۱ء م ۸۰۱ھ کی بات ہے جونپور کے شرقی سلطان ہردلعزیز حکمراں سلطان ابراہیم نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

سلطان نے آپ کو ملک العلماء کا خطاب دیا۔ ان کی شہرت صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہی، بلکہ بلاد عرب و عجم کا ہر پڑھا لکھا شخص ان کے نام سے واقف تھا۔ اس وقت کے علماء عرب و عجم میں جو شہرت و ناموری انہوں نے حاصل کی وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی۔ قلم کا جو کچھ ورثہ وہ چھوڑ گئے نہ صرف ان کے نام کو بلند رکھنے کے لئے کافی ہے بلکہ اس سے ان کے وطن کا نام اسی طرح تابناک رہے گا۔ جس طرح کوہ وقار قلعے نے دولت آباد کے نام کو زندہ رکھا جو اورنگ آباد کا نواحی علاقہ ہے۔

ان کے قلم سے ایسی مایہ ناز تصانیف منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں ان میں سے چند ایک کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) حواشی کافیہ جو عربی علم نحو کی مشہور کتاب "کافیہ" پر حواشی ہیں۔ (۲) تیسیر احکام دین و مسائل شرعیہ۔ (۳) بحر مواج۔ فارسی میں تفسیر کلام پاک۔ (۴) قصیدہ بانت سعاد پر ایک طویل شرح۔

۱۴۵۴ء م ۸۴۴ھ میں سلطان ابراہیم کی وفات قاضی شہاب علیہ الرحمہ کے لئے ناقابل برداشت صدمہ تھا۔ بقول فرشتہ آپ نے سلطان کا حق رفاقت ادا کیا اور اسی سال جنت

سدھارے۔ جونپور میں سلطان ابراہیم شرقی کی مسجد اٹالہ کے جنوب میں آپ کا مزار ہے۔ احمد نگر جب نظام شاہی خاندان کے زیر نگیں آ گیا تو اس کے ایک فرماں روا مرتضٰی نظام شاہ کے وزیر ملک عنبر نے موجودہ شہر اورنگ آباد کو بسایا، فوجی چھاؤنیاں قائم کیں، امراء کے لئے کشادہ محلات، سڑکیں اور باغ بنائے اور پورے شہر کو عجیب وغریب نظام آبرسانی سے سیراب کیا جس پر عصر حاضر کے انجینئر آج تک حیران ہیں۔ اسکی وفات کے بعد ۱۶۲۶ء میں اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اس نے اورنگ آباد کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور اپنے نام پر اس کا نام فتح نگر رکھا۔ ۱۶۵۲ء میں اورنگ زیبؒ نے اس علاقے کو فتح کیا اور مغلیہ سلطنت میں ضم کر دیا۔ انہوں نے اس شہر کا نام اپنے نام پر اورنگ آباد نجستہ بنیاد رکھا۔ اس طرح یہاں کی درگاہیں، عمارتیں اور خواجگان چشت کے آستانے فاروقی سلاطین کے اور ملک عنبر اور اس کے بعد اورنگ زیب علیہ الرحمہ کے زیر اثر رہے۔

اورنگ زیبؒ خود حضرت زین الدین داؤد شیرازی خلیفہ برہان الدین غریب کے قدموں میں ابدی نیند سو گئے۔

اقبالؔ نے رموز بے خودی میں اورنگ زیب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے۔

درمیان کار زارِ کفر و دیں
ترکشِ مارا خدنگ آخریں

یعنی کارزار کفر و دینی کے درمیان وہ ہمارے ترکش کا آخری تیر تھا۔ اقبالؔ نے پنجاب سے خلد آباد کا دور دراز سفر محض اورنگ زیبؒ کے نہایت سادہ مزار کی زیارت کے لئے اختیار کیا تھا۔ اقبالؔ نے اپنی ڈائری Stray Reflections بکھرے خیالات کے نمبر شمار ۳۱ میں اورنگ زیبؒ پر جو کہا ہے وہ نہایت فکر انگیز ہے وہ لکھتے ہیں کہ: ''اورنگ زیبؒ کی سیاسی عبقریت کے انتہا جامع تھی۔ دوسرے مقاصد کی طرح اس کی زندگی کا ایک مقصد اس ملک کی مختلف قوتوں کو ایک عالمگیر سلطنت کے رشتے میں مستحکم کرنا تھا۔'' وہ اس ڈائری میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''اورنگ زیبؒ کی سیاسی بصیرت جاذب تھی لیکن بہت زیادہ مؤخر، پھر بھی اس بصیرت کے پیش نظر اورنگ زیبؒ کو ہندوستان میں مسلم قومیت کا بانی تسلیم کرنا چاہئے۔''

(بکھرے خیالات صفحہ ۷۰)

سلطنت مغلیہ کے زوال پر دکن کی عنان حکومت نظام الملک آصف جاہ اول کے ہاتھ آئی۔ اور اس طرح دکن پر سوا دو سو سال تک دولت آصفیہ کی حکمرانی رہی۔

یہ اسلامی ریاست حکومت ہند کی لشکر کشی کے بعد ۱۹۴۸ء میں ہندوستان میں ضم ہو گئی۔ اسے حکومت ہند نے پولیس ایکشن کا نام دیا۔ اس طرح سلطنت آصفیہ کا سورج ۱۹۴۸ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ مغلوں کے زوال کا فائدہ اٹھا کر برطانوی سامراج نے ہندوستان پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ ۱۷۶۵ء میں ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا مکمل تسلط ہو چکا تھا۔ جسکی اپنی فوج اور اپنا انتظامیہ تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندو مسلم خواب غفلت سے جاگے اور انہوں نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے لئے پہلی جنگ لڑی گو اس میں اہل ہند کامیاب نہ ہو سکے۔

اس جنگ آزادی میں جسے انگریز شرارتاً غدر کہتے ہیں علماء کرام نے غیر معمولی مجاہدہ کیا۔ ان علماء میں بانی دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کا نام نامی اسم گرامی سرفہرست ہے۔ آپ کو سپہ سالار افواج مقرر کر دیا گیا تھا۔ آپ نے یہ جنگ شاملی سے لڑی جہاں انگریز افواج کے مقابلے میں مجاہدین کو غلبہ ہوا۔ جنگ میں مولوی صاحب ایسے ثابت قدم رہے تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں کا مقابلہ۔ ایک بار گولی چل رہی تھی یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ایک بھائی دوڑے، پوچھا کیا ہوا فرمایا سر میں گولی لگی

عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا تو کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر تھے۔

بقول مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا 'جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز رہے جہاں لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔ (سوانح قاسمی جلد دوم صفحہ ۲۲۶)

مولانا فضل الحق خیر آبادی اور مولوی لیاقت علی الہ آبادی بھی جنگ آزادی میں پیش پیش تھے۔ یہ موضوع ایک علیحدہ مضمون کا طالب ہے۔ ''سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے'' غرض ملک آزاد ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں سقوط حیدر آباد کے وقت دکن میں سناٹا ہی سناٹا تھا۔ اس وقت اورنگ آباد میں ایک مرد مجاہد نے ایک دینی مدرسہ قائم کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ انکا نام نامی اسم گرامی حضرت مولانا سعید خاںؒ ہے۔ تاریخی شہر اورنگ آباد میں دو تاریخی باتیں ہوئیں جن کا سہرا حضرت مولانا سعید خاںؒ مرحوم کے سر جاتا ہے۔ ایک تو عالمی دعوتِ تبلیغ و اصلاح سے اورنگ آباد کو متعارف کروانا اور دوسرے مدرسہ عربیہ کاشف العلوم کا قیام۔ یہ ساعت سعید ۱۰ رشوال المکرّم ۱۳۷۸ھ م ۱۹/اپریل ۱۹۵۹ء کو آئی جب یہاں کی تاریخی جامع مسجد میں مدرسہ عربیہ کاشف العلوم کی بنیاد پڑی۔ اس تاریخی جامع مسجد کی تعمیر میں دو نیک فرماں رواں یعنی ملک عنبر اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کا حصہ ہے۔ اور اس مسجد کا شمار ہندوستان کی چند عظیم مساجد میں ہوتا ہے۔ تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ فقہ کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کی ابتداء بھی یہیں ہوئی تھی۔

غرض مسجد کے ۴۷ حجروں میں مدرسہ کی ابتداء ہوئی۔ آج مشرقی دروازے کے باہر دو عظیم الشان عمارتوں میں جامعہ کے درجات اور طلبہ کے اقامت خانے ہیں۔ جن میں سے ایک ہاسٹل کا نام رواق ابوالحسن ہے۔ یہاں اکثر دینی جلسے اور رابطہ کے ادبی اجلاس بھی ہوتے ہیں۔

شروع ہی سے مدرسہ کا الحاق دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے رہا اور آج بھی جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے زیر سرپرستی جامعہ اپنی ترقی کے منازل طئے کر رہا ہے اللہ تعالیٰ حضرت والا کے سایۂ عاطفت کو ہمارے سروں پر صحت و عافیت کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھے۔ (آمین)

جامعہ میں عالمیت کا کورس دار العلوم ندوۃ العلماء کے نصاب کے مطابق پڑھایا جاتا ہے یہاں سے فارغ ہونے کے بعد طلباء دار العلوم ندوۃ العلماء کے شعبہ علیا (فضیلت) میں داخلہ لیتے ہیں اور دو سالہ تعلیم کی تکمیل کے بعد انہیں ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فضیلت کی سند دی جاتی ہے۔

درجات کی تقسیم اس طرح ہے: روضۃ الاطفال، ابتدائیہ، ثانویہ، عالیہ شعبہ حفظ کے تحت آٹھ جماعتیں جاری ہیں۔ اس کے علاوہ شہر میں جامعہ کے زیر اہتمام مدرسہ الیاس آزاد چوک اور مسجد میر جنگو (مرکز تبلیغ) حفظ کی جماعتیں جاری ہیں۔ جامعہ میں شعبہ تجوید بھی قائم ہے، اس شعبہ میں سبعہ اور عشرہ کی قرأت کی تعلیم کا انتظام ہے۔ جامعہ سے ملحق اداروں میں جامعۃ الطیبات جونا بازار (تعداد طالبات: ۳۱۵) جامعۃ الطیبات کراڑ پورہ، جامعہ عائشہ یونس کالونی مدرسہ عائشہ روضہ باغ نیز ملحقہ مکاتب کی تعداد: (۲۱۹) ہے۔

اس ادارے سے فیض حاصل کر کے یہاں کے فارغین نے علاقے کی دینی ضروریات کی تکمیل کی تو دوسری طرف تعلیمی و تربیتی نقطہ نظر سے از ابتداء تا حال عالم اسلام کی مشہور و معروف دینی تعلیمی تربیتی درسگاہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے اپنے نظام تعلیم و تربیت میں مرہون منت رہا اور ہے۔ آج الحمد للہ جامعہ نصف صدی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا ہے۔ اور اس کی ترقیات میں جہاں ہمارے اکابر علماء اساتذہ، مجلس عاملہ کے

ممبران کا بڑا حصہ ہے وہیں اہلیان شہر اور ادارے کے بہی خواہان کا بڑا دخل ہے۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی کے اس سمینار کے موقع پر ادب کے اسلامی تصور سے واقف ہونا ضروری ہے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نور اللہ مرقدہ ادب کی تعریف میں فرماتے ہیں:

''ادب ادب ہے خواہ وہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ہو، کسی آسمانی صحیفے میں ہو۔''

ادب کی سب سے پہلی زیارت جو نصیب ہوئی وہ آسمانی صحیفوں میں نصیب ہوئی۔ ادب تھا کہاں؟ لیکن جب خدا نے انسانوں کو سمجھانے کے لئے اپنے پیغمبروں کو بھیجا اور ان کو زبان دی اور ان پر معانی کے ساتھ الفاظ وارد کئے تو معلوم ہوا کہ ادب اسے کہتے ہیں۔ پھر قرآن مجید نے آکر تو اس پر ہمیشہ کے لئے مہر لگادی۔

یہ اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ یہ زبان دراصل ان گودوں میں پہلی ہے، جو دین اور دینی اقدار کے حامل تھے، جن چار شخصیتوں کو اردو زبان وادب کے عناصر اربعہ کہا جاتا ہے وہ مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا شبلی نعمانی ہیں۔ یہ سب علماء تھے اور اسلام سے انہیں والہانہ تعلق تھا۔ غرض اردو ادب کے بانیوں میں علماء کی فہرست طویل ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ جب دمشق کے ادارے المجمع العلمی العربی کے رکن ہوئے تو آپ نے پہلی بار ایک مضمون میں اس طرف توجہ دلائی کہ ادب عربی میں اسلامی عناصر کو تلاش اور اجاگر کرنے کی موجودہ ماحول میں وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ چنانچہ اسی پس منظر میں ۱۹۸۴ء میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ جنوری ۱۹۸۶ء کے اجلاس ندوہ میں رابطہ کے دستور اساسی کو آخری شکل دی گئی۔ تنظیمی انتخابات ہوئے اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کو تاحیات اسکا صدر منتخب کیا گیا۔ اس کا دوسرا اجلاس استنبول (ترکی) میں جون ۱۹۸۶ء کو منعقد ہوا۔

حضرات، لفظ سمینار انگریزی زبان سے آیا ہے جس کے معنی اہل تخصص کی کانفرنس کے ہیں اور یہ لفظ مشتق ہے Seminary (سیمنری) سے۔

سیمنری دراصل مذہبی تعلیمی مرکز یا مذہبی تعلیمی ادارے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک لفظ سمپوزیم بھی ہے جس میں اہل یونان مباحثہ کرتے تھے۔

اس طرح رابطہ نے سمینار کو دینی مباحث کا پلیٹ فارم یا فورم بنایا، جس کو اردو میں مذاکرہ علمی کا نام دیا گیا۔ عصری جامعات میں یہ سمینار عام ہیں۔ رابطے کی بدولت یہ علمی مذاکرے اور مباحث دینی جامعات اور دینی اداروں میں بھی عام ہو گئے۔ یہ عالمی رابطہ ادب اسلامی کا بڑا کارنامہ ہے۔ جس نے مغرب کی علمی بالادستی اور مرعوبیت کو ختم کر کے اسلام کی بالادستی کو قائم کر دیا۔

یہ جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم کی خوش قسمتی ہے کہ حضرت مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں یہاں دو سمینار منعقد کئے جانے کے زرین مواقع حاصل ہوئے، چنانچہ پہلا سمینار ۷/۸/۹ر اکتوبر ۱۹۸۸ء میں اسی مقام پر ''نعتیہ شاعری'' کے عنوان پر منعقد ہوا۔ دوسرا سمینار ۷/۸/۹ر اپریل ۱۹۹۵ء کو ''ادب میں سفرناموں کی اہمیت'' پر منعقد ہوا۔

ایک بار پھر ہماری قسمت کا ستارہ چمکا۔ نصیب سکندر نے یاوری کی، ایک بار پھر جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم کو عالمی رابطہ ادب اسلامی کے سمینار کا شرف حاصل ہوا۔ مگر اس کامیابی و سرخروئی کے لئے قسمت کی یاوری سے زیادہ رابطہ کے سربراہ روح رواں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم

کی ہم پر نظر کرم وچشم عنایت کو دخل ہے۔ ہم اپنی قسمت پر نازاں ہونے کی بجائے مولانا کے ممنون کرم ہیں کہ انہوں نے ایک بار پھر سمینار کی میزبانی کا شرف عنایت فرمایا۔ حضرت مولانا کی عنایت ہے، جو ہم اس عظیم الشان سمینار کو جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم میں منعقد کرنے کے قابل ہوئے۔ حضرات! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ رابطہ کے اس مہتم بالشان سمینار کا عنوان ''مختلف زبانوں میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ ہے'' ایک بار پھر ہم بارگاہ رب العزت میں شکر گذار ہیں کہ ایسے عظیم الشان عنوان کے تحت مذاکرہ علمی کے اہتمام کا ہمیں موقع نصیب ہوا۔

نہ شمم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
ہمہ ز آفتابؐ بینم ہمہ ز آفتابؐ گویم

سمینار کے دو دن کے اس عرصہ میں جامعہ کے در و دیوار سرکار کے ذکر سے چمک اٹھیں گے، فضائیں نغمہ ریز ہوں گی، ہوائیں عطر بیز ہوں گی۔ نہ صرف جامعہ کا ماحول بلکہ سارے شہر کا ماحول نورانی ہو جائے گا۔ چنانچہ سرکار کا نام بلا درود کے لینا بھی سوءِ ادبی ہے

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

حضرات گرامی، سمینار کا موضوع جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے: ''مختلف زبانوں میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ'' ہے جو ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔

اس سے پورا پورا انصاف تو ہمارے لائق و دانشور شرکاء کریں گے جو عصری دانشگاہوں اور دینی جامعات سے تشریف لائے ہیں یہ اصحاب علم و تحقیق اور ارباب فکر و نظر اپنے تحقیقی مقالوں کے ذریعہ آپ کی علمی تشنگی کو بجھانے کا سامان فراہم کریں گے۔

اس تاریخ ساز موقع پر میں سب سے پہلے اللہ رب العزت کی بارگاہ عالی میں سجدۂ شکر بجالاتا ہوں۔ ساتھ ہی حدیث پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ" جس نے انسانوں کا شکر ادا نہ کیا اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کیا۔ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کا بھی شکر گزار ہوں کہ مختلف اداروں کے تقاضوں کے باجود ہمیں اس سمینار کے انعقاد کے لئے منتخب فرمایا نیز اس کی سرپرستی فرمائی اور کرسئ صدارت کو رونق بخش کر ہماری ہمت افزائی فرمائی۔ اسی طرح میں تمام اراکین استقبالیہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے بھرپور تعاون سے سمینار کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں انتھک جدو جہد کی۔ ناشکر گزاری ہوگی اگر میں اورنگ آباد سے شائع ہونے والے اخبارات کے مدیران و نامہ نگاران اور اسی طرح آکاش وانی اورنگ آباد کا شکریہ ادا نہ کروں کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ سمینار کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔

جامعہ کی مجلس عاملہ، اساتذہ، طلباء اور معاونین جامعہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی شب و روز محنت کے سبب سمینار کامیابی سے سرفراز ہوا۔

حضرات مندوبین! ہمیں اپنی بے بضاعتی اور کوتاہیوں کا اعتراف ہے کہ ہم آپ کے شایان شان انتظامات سے قاصر رہے۔ امید کہ دوران مذاکرہ ہماری انتظامی کوتاہیوں سے آپ چشم پوشی فرماتے ہوئے ہماری معذرت قبول فرمائیں گے۔ آخر میں بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس سمینار کو شرف قبولیت بخشے اور سمینار کے اچھے اثرات مرتب فرمائے۔ آمین

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

☆☆☆

مختصر روداد کارگزاری

عالمی رابطہ ادب اسلامی

.....مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

حضرات! رابطہ ادب اسلامی ایک عالمی تنظیم ہے جس کا بنیادی مقصد اخلاق، مذہب اور ادب، علم اور ادب، اور فکر وفن کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والوں کے درمیان رابطہ اور تعلق پیدا کرنا ہے، اس کا مقصد بہت بلند اور اعلیٰ وارفع ہے، اور وہ ہے انسانی زندگی کی تعمیر وتشکیل، اخلاق کی اصلاح و درستگی، اور انسان کی صلاحیتوں کو دوسرے انسانوں اور انسانیت کی فلاح و بہبود میں صرف کرنا، اور زبان وقلم کو ان کی آلائشوں اور خرابیوں سے پاک کرنا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ زبان وقلم کے غلط استعمال سے ہر دور میں انسانوں پر مصیبتیں اور پریشانیاں آئی ہیں، کیونکہ ادب کے بارے میں یونانی فکر کے اثر سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ادب نام ہے محض اندرونی خیالات و جذبات کو مؤثر اور حسن بیان کے ذریعہ دوسروں کے سامنے پیش کردینے کا، خواہ اس کا اثر قلب اور معاشرہ پر اچھا یا خراب کچھ بھی پڑے۔

ادب کے اسی مقصد اور غرض وغایت کو بروئے کار لانے، اور اس کے راستہ کی تعیین و وضاحت کے لیے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس رابطہ کی بنیاد ڈالی تھی، کیونکہ ادب ایک دودھاری تلوار ہے، اس سے خیر کا بھی کام لیا جاسکتا ہے اور شر کا بھی۔ یہ انسانی اخلاق وکردار کی تعمیر کا بہترین وسیلہ ہے، اور لوگوں کو انسانی اخلاق کی پستی کی ڈگر سے ہٹا کر تعمیر وتشکیل اور اصلاح ودرستگی کی شاہراہ پر ڈالنے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی۔ اور قوت گویائی اور اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کی صلاحیت وطاقت اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے مدح کے طور پر ذکر فرمایا ہے: ﴿ خلق الإنسان، علّمه البيان﴾ (سورۂ رحمٰن:۳-۴) اور حدیث میں اس کی اثر انگیزی اور خوبی کی بنا پر اسے جادو سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿ و إن من البيان لسحراً ﴾ اور اگر ہم موجودہ ماحول اور اس میں در آنے والی خرابیوں، بگاڑ اور اخلاقی انارکی کا جائزہ لیں تو صاف معلوم ہوگا کہ اس قدر پستی، بگاڑ اور انتہائی خرابی کا اولین ذمہ دار یہی ادبی صلاحیت کا غلط

استعمال ہے، اس لیے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ادبی صلاحیت اور طاقت کو جس کے دائرۂ کار اور اثر انگیزی کو موجودہ ذرائع ابلاغ نے بہت وسیع کر دیا ہے، اس کے فطری رخ کی طرف واپس لایا جائے اور اس سے انسانی زندگی کی تعمیر و تشکیل اور اس کی عزت و حرمت بحال کرنے کا کام لیا جائے۔

مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے اس رابطہ کا قیام جنوری ۱۹۸۶ء میں عمل میں آیا، اس کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی، جس میں ہندو بیرون ہند سے اور خاص طور پر عالم عربی کے مختلف گوشوں سے چوٹی کے علماء، ادباء اور شعراء حضرات بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

اس کے دو مرکزی دفتر ہیں، ایک عالم عربی کے لیے جو سعودی عرب کے دار السلطنت ریاض میں ہے، اور دوسرا برصغیر و ممالک مشرقیہ کے لیے جو لکھنؤ میں ہے۔ پھر ان دونوں کی ان کے علاقوں میں مختلف شاخیں اور فروع قائم ہیں، اور ہر فرع سیمیناروں اور کانفرنسوں کا انعقاد، کتابوں اور ماہنامے اور سہ ماہی مجلّات و رسائل کی نشر و اشاعت اور اسلامی ادب پر مضامین و مقالات کے ذریعہ ادبی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے، اور افسانے، ناول، تنقید، ادبی تاریخ اور دلکش ادبی انتخابات پر مشتمل متعدد کتابیں دونوں علاقوں سے منظر عام پر آچکی ہیں۔ ریاض سے "مجلة الأدب الإسلامي" اور مراکش سے "المشكاة" نامی سہ ماہی رسالے عربی میں نکل رہے ہیں، اسی طرح بنگلہ دیش سے "الحق" اور "منار الشرق" کے نام سے بنگالی اور عربی میں، اور استنبول ترکی سے ترکی زبان میں بھی رسالے نکل رہے ہیں۔ نیز قاہرہ، عمان، مدینہ منورہ، استنبول، لندن، نیویارک اور ڈربن میں متعدد سیمینار اور کانفرنسیں ادب کے موضوع پر ہو چکی ہیں۔

ہندوستان کے مرکزی دفتر کے تحت اور اس کی نگرانی میں دہلی، حیدر آباد، اورنگ آباد، بھوپال، بھٹکل، بنگلور، پونہ، پٹنہ، رانچی، کلکتہ اور غازیپور میں شاخیں قائم ہیں اور کام کر رہی ہیں، اور ان تمام شہروں میں مختلف سیمینار منعقد ہو چکے ہیں۔

ہندوستان کا مرکزی دفتر لکھنؤ "کاروان ادب" کے نام سے اردو میں ایک سہ ماہی رسالہ نکالتا ہے، اور اس نے متعدد ادبی اور تنقیدی کتابیں بھی اردو اور عربی دونوں زبانوں میں شائع کی ہیں۔ کاروان ادب کا ہر شمارہ ایک خاص شمارہ کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ اس میں رابطہ ادب اسلامی کے سالانہ سیمیناروں کے منتخب مقالات پیش کیے جاتے ہیں۔ اب تک کاروان ادب کے (۶۱) شمارے نکل چکے ہیں، اور (۲۷) سیمینار منعقد ہو چکے ہیں۔ سیمیناروں کے موضوعات حسب ذیل ہیں:

۱- ادبیات اسلامی: لکھنؤ، ۱۹۸۶ء
۲- اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات: جیپور، ۱۹۸۷ء
۳- حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات اردو زبان و ادب پر: لکھنؤ، ۱۹۸۷ء
۴- نعتیہ شاعری: تاریخی و علمی جائزہ و خصوصیات: اورنگ آباد، ۱۹۸۸ء
۵- تحریک آزادی و اصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصہ: حیدر آباد، ۱۹۸۹ء
۶- حمد و مناجات و دعاء: رائے بریلی، ۱۹۹۰ء
۷- دعوتی و اصلاحی ادب: بھوپال، ۱۹۹۱ء
۸- خطوط اور تأثراتی خاکوں کا ادب: لکھنؤ، ۱۹۹۲ء
۹- مشرقی اقوام کے زبان و ادب میں اسلامی رجحانات: بنگلہ دیش، ۱۹۹۴ء
۱۰- حدیث شریف کی ادبی و فنی خصوصیات: بنارس، ۱۹۹۴ء

۱۱- ادب میں سفرناموں کی اہمیت: اورنگ آباد، ۱۹۹۵ء
۱۲- سوانحی ادب وتذکرہ نویسی: اعظم گڑھ، ۱۹۹۵ء
۱۳- ملفوظات ومواعظ ادب کے آئینہ میں: حیدرآباد، ۱۹۹۶ء
۱۴- اسلامی نشأۃ ثانیہ میں ادب کا حصہ: پٹنہ، ۱۹۹۷ء
۱۵- تاریخ نویسی کا جائزہ ادب کے تناظر میں: پونہ، ۱۹۹۸ء
۱۶- اسلامی ادب میں قصہ نگاری: بنگلور، ۱۹۹۹ء
۱۷- بچوں کا ادب: بھٹکل، ۲۰۰۰ء
۱۸- اسلامی ادب کی نمائندہ شخصیات: لکھنؤ، ۲۰۰۲ء
۱۹- انسانی کردارسازی میں اخلاقی واسلامی ادب کی خدمات بھوپال، ۲۰۰۳ء
۲۰- اردو شاعری میں ملی احساسات کی ترجمانی: رائے بریلی، ۲۰۰۳ء
۲۱- تراجم قرآن کا جائزہ : زبان و ادب اور فکر کی ترجمانی: اجراڑہ، میرٹھ، ۲۰۰۴ء
۲۲- اردو زبان و ادب کی تشکیل میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کا حصہ: کلکتہ، ۲۰۰۵ء
۲۳- اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں علماء کی خدمات: غازیپور، ۲۰۰۵ء
۲۴- حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی تحریروں کا ادبی جائزہ (خطوط وخطبات کے حوالے سے) : ممبئی، ۲۰۰۷ء
۲۵- اردو ادب و شاعری پر عربی زبان کے اثرات: رائے بریلی، ۲۰۰۷ء
۲۶- قرآن کریم کا اعجاز بیانی: کنور (کیرالہ)، ۲۰۰۸ء

ان سالانہ سیمیناروں کے علاوہ گذشتہ سال جو میڈیا کا سال تھا، دہلی، رائے بریلی، بھوپال اور بھٹکل میں رابطہ کی شاخوں کی طرف سے ''میڈیا کا اخلاق و کردارسازی میں اہم رول'' پر سیمینار ہوئے جو بہت کامیاب رہے۔ اسی طرح رابطہ کی مختلف شاخوں کی طرف سے فلسطین کے موضوع پر مختلف سیمینار ہوئے جن کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

رابطہ ادب اسلامی کی پاکستان کی شاخ بھی کام کررہی ہے، وہاں سے بھی ''قافلۂ ادب اسلامی'' کے نام سے اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں ایک سہ ماہی رسالہ نکل رہا ہے، لاہور اور اسلام آباد میں متعدد سیمینار بھی ہوچکے ہیں۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی حیات و خدمات پر ایک بین الاقوامی سیمینار اسلام آباد میں منعقد ہوا تھا، اور مقامی متعدد سیمینار ہوچکے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بنگلہ دیش اور ملیشیا میں بھی کئی سیمینار ہوئے ہیں۔

رابطہ کی مختلف شاخوں نے ادبی مجالس کا بھی نظم کیا، خاص طور سے دہلی، بھوپال، بھٹکل اور اورنگ آباد کی شاخ نے۔ اور اس میں علاقہ کے ادباء اور شعراء کو دعوت دی گئی، ان کی شرکت سے ادب اسلامی کے تعارف میں مدد ملی۔

مرکزی دفتر ریاض کی طرف سے عالم عربی کے مختلف ملکوں میں سیمینار منعقد کیے گیے، اور ادبی ہفتوں کا انعقاد ہوا، جس میں مدارس اور کالجز کے ادباء وشعراء نے حصہ لیا۔

مجلس امناء کے سالانہ اجلاس مدینہ منورہ، قاہرہ استنبول، عمان اور مغرب عربی میں منعقد ہوئے، اسلامی ادباء و شعراء کی کتابوں پر عالمی مسابقوں کا بھی نظم کیا گیا۔

رابطہ ادب اسلامی ہند نے اسلامی ادباء وشعراء کی تکریم کا بھی نظم کیا، انعامی مقابلوں کے علاوہ جو مختلف شاخوں کی طرف سے منعقد کیے گیے، رانچی جھارکھنڈ کی شاخ نے اسلامی شاعر وادیب جناب پروفیسر کلیم عاجز کی تکریم کی ایک نشست منعقد کی، اور رابطہ کی طرف سے ایک رمزی اوارڈ دیا گیا، اس میں مختلف مدارس ادب سے تعلق رکھنے والے ادباء وشعراء نے شرکت کی، ہمارے رانچی کے دفتر کے ذمہ دار مولانا آفتاب عالم

صاحب ندوی کی کوششوں سے یہ کامیاب نشست منعقد ہوئی، جس میں برصغیر کے دفتر کے صدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے بھی شرکت فرمائی اور نشست کی صدارت فرمائی۔

حضرات! گذشتہ سال ہمارے رابطہ کے ایک اہم رکن جو اس کی تاسیس میں شریک تھے، اور ہمارے سارے سیمیناروں کی تنظیم میں اہم حصہ لیتے تھے، ہماری مراد پروفیسر سید محمد اجتباء حسینی ندوی سے ہے، وہ ہم سے جدا ہوگیے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے۔ وہ دہلی کے ہندوستان کے دفتر کے ذمہ دار تھے، ان کے انتقال کے بعد دہلی دفتر کی ذمہ داری مولانا سید محمود الحسن ندوی کے سپرد کی گئی ہے، اور ان کے معاون اور دہلی شاخ کے مدیر پروفیسر شفیق احمد ندوی ہیں۔ الحمدللہ ان کی توجہ سے دہلی شاخ سرگرم عمل ہے، اور اس عرصہ میں اس نے کئی ادبی نشستوں کا نظم کیا، اور ادباء کے درمیان رابطہ قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

یہ ہے رابطہ ادب اسلامی کی مختصر روداد اور ادب اسلامی کی اہمیت وافادیت کی ایک تصویر۔ امید ہے، اس سیمینار سے رابطہ کا تعارف اور اس کا دائرۂ کار وسیع ہوگا، اور اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں اس کو تقویت ملے گی، اور ذہنی تشکیل، نفوس کی تربیت، ادبی وفنی عمل کی اہمیت میں انشاء اللہ اضافہ ہوگا۔ اور انشاء اللہ ہم کلمۂ طیبہ کے حاملین کے مصداق ہوں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں فرمایا ہے: ﴿ألم تر كيف ضرب الله مثلاً كلمة طيبة كشجرة طيبة، أصلها ثابت و فرعها في السماء، تؤتي أكلها كل حين بإذن ربها﴾ (سورۂ ابراہیم ۲۴-۲۵)۔

☆☆☆

حمد

نذیر فتح پوری

دعا کے ہاتھ میں مقبولیت کی تھالی دے
جو چیز دے مرے مولیٰ مجھے مثالی دے

اذان دیتے ہیں لیکن مزہ نہیں آتا
ہمارے لہجے کو تو لہجۂ بلالی دے

لپٹ کے رونا ہے اپنی ندامتوں پہ مجھے
نبیؐ کے روضۂ اطہر کی پاک جالی دے

جدید لہجے میں کوئی غزل سناؤں میں
روایتوں کہ نہ مجھکو کبھی جگالی دے

سخن ہو، صحت ہو، تخلیق، تبسم ہو
ذرا نذیر کو ہر ایک شئے نرالی دے

☆☆☆

خطبۂ صدارت

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صدر رابطہ ادب اسلامی برصغیر

پیش کردہ برائے سیمینار "مختلف زبانوں میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ"

منعقدہ جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم اورنگ آباد (مہاراشٹر)

الحمد للّٰہ رب العالمین ، و الصلاۃ و السلام علیٰ سید المرسلین خاتم النبیین سیدنا محمد ، و علیٰ آلہ و صحبہ الغر المیامین ، و من تبعھم بإحسان إلی یوم الدین ، و دعا بدعوتھم إلیٰ یوم الدین ، أما بعد :

حضرات! حضور اکرم (ﷺ) کو اللہ رب العالمین نے تا قیامت انسانوں کے لیے رہبر اور صلاح و رشد کا نمونہ بنایا، اور ان کے ذمہ یہ کام سپرد کیا کہ آپ (ﷺ) انسانیت کی کشتی کو زندگی کے منجھدار میں صحیح طریقہ سے چلانے کا فریضہ اور طریقۂ کار بتائیں، اور اس کے لیے خود آپ کی حیات طیبہ کے سب پہلو زندگی کے صحیح طریقۂ کار کو سمجھنے کے لیے بطور نمونہ اور ذریعۂ تعلیم و تربیت رکھے گیے، اسی کے ساتھ رب العالمین کی کی طرف سے برابر جو ہدایات آتی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر عمل کرتے اور کراتے تھے، ان تمام معاملات میں آپ (ﷺ) کا طریقہ محض حکم دینا نہیں تھا، بلکہ آپ (ﷺ) حالات اور ضروریات کے لحاظ سے رہنمائی اور ذاتی عمل و کردار سے اس کو واضح کرتے تھے، آپ (ﷺ) کا طریقہ اپنے اصحاب کے ساتھ عملی شرکت اور محبت و اخلاق کے ساتھ بات کرنے کا تھا، آپ (ﷺ) انہیں بھلائی کی فکر کرنے اور بھلائی کو عام کرنے کے لیے اپنی ذاتی زندگی سے نمونہ پیش کرتے تھے، آپ (ﷺ) کے اصحاب پر اس کا اچھا اثر پڑتا تھا، وہ دل و جان سے آپ (ﷺ) کی تابعداری کرتے اور آپ (ﷺ) کے اشاروں پر چلتے، پھر آپ (ﷺ) کے یہ اصحاب کرام آپ کی باتوں کو اپنی یادداشت میں محفوظ بھی کر لیتے تھے، پھر ان باتوں کو ان اصحاب کرام نے اپنے بعد میں آنے والوں تک پہونچایا، اس طرح حضور (ﷺ) کی پوری زندگی اپنے مختلف پہلوؤں کے ساتھ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ ہوگئی، آپ کی حیات طیبہ رب العالمین کی طرف سے عطا کردہ کتاب ہدایت قرآن مجید کا پرتو بنی تھی جو آپ (ﷺ) پر آپ کی نبوت کی تیئیس (۲۳) سالہ مدت میں بتدریج اتارا گیا تھا، وہ تا قیامت سارے انسانوں کے لیے فرمان الٰہی بنا، اس پر عمل کرنے کی ہدایت کے ساتھ یہ تاکید بھی فرمائی گئی کہ وضاحت کے طور پر حضور (ﷺ) کی سیرت طیبہ کو سامنے رکھا جائے، اور اس کو اعلیٰ نمونہ کے طور پر اپنایا جائے، فرمایا: ﴿لقد

کان لکم في رسول الله أسوة حسنة لمن کان یرجو الله و الیوم الآخر و ذکر الله کثیراً﴾ کہ تمہارے لیے اللہ کے رسول میں اچھا نمونہ ہے، یہ ہر اس شخص کے لیے جو اللہ کے فضل وکرم کی امید وتوقع رکھتا ہو اور آخرت اور حساب کے دن سے امید قائم کرتا اور اللہ کو خوب یاد کرتا ہو۔

اس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سے واقف ہونا اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اس کے حالات سے واقفیت پیدا کرنا ضروری ہوا، لہذا اس بات کے حصول کے لیے مسلمان اہل علم نے حضور (ﷺ) کے اقوال اور آپ کی سیرت کے احوال کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی کوشش کا سلسلہ رکھا تاکہ قیامت تک آنے والے اپنی زندگی کے طور وطریق میں ان سے رہنمائی حاصل کرسکیں۔

حضرات! آپ (ﷺ) کے اقوال و حالات جن سے امت مسلمہ کو تا قیامت استفادہ کرنا ہے، دو بڑے پہلوؤں پر مشتمل ہیں، ایک آپ (ﷺ) کی تعلیمات و ہدایات جو آپ (ﷺ) نے اپنے صحابہ کو مختلف موقعوں پر دیں، اس کو حدیث نبوی کہتے ہیں۔ دوسرے وہ احوال جو خود آپ (ﷺ) کی عملی زندگی میں پیش آئے، ان کو سنت نبوی کہتے ہیں۔ آپ (ﷺ) کی ان دونوں پہلوؤں کی باتوں کو حضور (ﷺ) کے صحابہ نے اپنے بعد کی نسل کے اہل ایمان کو پہونچایا، پھر انہوں نے ان کو اپنے بعد کے لوگوں کو پہونچایا، اور کتابوں میں سب قلمبند کرلیا گیا۔ آپ (ﷺ) کے ان حالات میں جو آپ (ﷺ) کی سیرت میں ملتے ہیں، ان میں ایسے حالات بھی پیش آئے جن میں آپ (ﷺ) کے دشمنوں کی شر پسندی اللہ تعالیٰ کے پسند کردہ دین وایمان کو ختم کردینے کی تدبیروں تک پہونچ جانے پر آپ (ﷺ) کو ان دشمنوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا، جن کو تعداد اور طاقت اور پوزیشن میں مسلمانوں پر برتری حاصل تھی، اور وہ اپنی اس طاقت ووسائل کو اس مختصر جماعت کو ختم کرنے کے لیے استعمال میں لانے لگے تھے، اس کی وجہ سے باقاعدہ جنگ کے بادل مسلمانوں کے سر پر منڈلانے لگے، چنانچہ اپنے دفاع میں آپ کی رہنمائی میں مسلمانوں کو تلواروں اور دیگر اسلحے کو جوان کو میسر آئے استعمال کرنا پڑا۔

دشمنوں کی طرف سے مسلح طاقت کے ساتھ دشمنی کرنے کے علاوہ اسلام کے معاندین نے حضور (ﷺ) کی حیات طیبہ کو جھوٹ اور معاندانہ پروپیگنڈہ کے ذریعہ برے انداز میں پیش کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا، انہوں نے اس سلسلہ میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوششیں کیں، اس سے سیرت طیبہ کو سمجھنے اور اس کی قدردانی کرنے سے اسلام سے ناواقف لوگوں کے ذہنوں میں غلط خیالات پیدا ہوئے، اس کے لیے مسلمان اہل علم پر یہ ذمہ داری عائد ہوئی کہ وہ سیرت طیبہ کے حالات کو صحیح طریقہ سے ناواقف لوگوں کے سامنے لائیں، اور خود مسلمان ناواقف حضرات کو بھی ان سے واقف کرائیں، تاکہ آپ (ﷺ) کا اسوۂ حسنہ اپنی صحیح صورت میں سامنے آتا رہے، تاکہ اگر کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہوں تو وہ دور ہوں، چنانچہ الحمد للہ یہ کام ہر دور میں انجام دیا گیا، اس کی ضرورت خود مسلمانوں کی نئی نسلوں کو رہتی رہی، تاکہ ان کی نشو ونما سیرت نبویہ کی روشنی میں اعلیٰ انسانی اقدار کے مطابق ہوسکے۔

چنانچہ صحابۂ کرام میں جن حضرات نے سیرت نبوی سے متعلق احادیث کو اپنے اپنے طور پر جمع کررکھا تھا، ان کے ذریعہ ان کو ضبط تحریر میں لانے کا کام شروع کردیا گیا۔ ان میں حضرت عبد اللہ بن عباس، البراء بن عازب، عبد اللہ بن عمرو بن العاص، انس بن مالک اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم نمایاں ہیں۔ اور تابعین میں سے متعدد معتمد علیہ حضرات نے بھی سیرت نبوی پر خاص توجہ دی، اور ان کی روایات تحریری شکل میں موجود

ہیں، ان میں خاص طور پر درج ذیل حضرات قابل ذکر ہیں:

(۱) عروہ بن زبیر (م ۹۴ھ)، (۲) ابان بن عثمان (م ۱۰۵ھ)، (۳) وہب بن منبہ (م ۱۱۰ھ)، (۴) عاصم بن قتادہ (م ۱۱۹ھ)، (۵) شرحبیل بن سعد (م ۱۲۳ھ)، (۶) محمد بن مسلم بن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ)، (۷) عبداللہ بن ابی بکر بن حزم (م ۱۳۵ھ)، اخیر کے چار حضرات نے مغازی پر خاص توجہ دی۔

بعد میں موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ)، معمر بن راشد (م ۱۵۰ھ)، محمد بن اسحاق (م ۱۵۲ھ)، زیاد البکائی (م ۱۸۳ھ)، محمد بن عمر واقدی صاحب المغازی (م ۲۰۷ھ)، ابو محمد عبد الملک بن ہشام (م ۲۱۳ھ)، محمد بن سعد صاحب الطبقات الکبریٰ (م ۲۳۰ھ) اور ابن حزم (م ۴۵۶ھ) صاحب ''جوامع السیرۃ'' نے سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا۔

امام بخاریؒ نے سیرت نبوی سے متعلق اکثر اور اہم روایتیں جمع کردی ہیں، جو ان کے شرائط صحیح کے مطابق ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے کتاب المغازی کی شرح ایک مستقل کتاب کی شکل میں مرتب کردی ہے، صحیح مسلم میں مستقل باب ''الجہاد والسیر'' کے نام سے موجود ہے۔

شروع میں سیرت کے سلسلہ میں صرف مغازی یعنی جہاد کے واقعات کو مدون کرنے پر عموماً انحصار کیا گیا تھا، لیکن ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں سیرت نبوی کے تمام پہلوؤں پر مشتمل معاملات کی تدوین وترتیب کا کام پوری طرح شروع ہوگیا۔ اس میں ابن اسحاق، ابن ہشام اور سہیلی کا کا نام نمایاں ہے۔ ابن اسحاق کو تدوینی دور کا اولین عالم قرار دیا گیا ہے، اور بعد میں آنے والے سیرت نگاروں نے ان کا اعتراف کیا اور زیادہ تر انہی کی روایات کو نقل کیا ہے۔ ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کا اختصار پیش کیا ہے، اور سہیلی نے ابن ہشام کی شرح کی ہے۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہا، اور متعدد معتمد ترین کتب تصنیف کی گئیں، جن سے سیرت سے فائدہ اٹھانے کا اچھا موقع حاصل ہوا، ان میں چند اور اہم تصنیفات مثالاً پیش ہیں:

(۱) جوامع السیرۃ النبویۃ از علامہ علی بن احمد بن حزم اندلسی (م ۴۵۶ھ)۔

(۲) الدرر فی اختصار المغازی والسیر از امام یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر قرطبی (م ۴۶۳ھ)۔

(۳) الروض الانف: عبدالرحمٰن سہیلی (م ۵۸۱ھ)۔

(۴) عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر: ابن سید الناس بصری شافعی (م ۷۳۴ھ)۔

(۵) زاد المعاد فی ہدی خیر العباد: علامہ ابن قیم جوزی (م ۷۵۱ھ)۔

(۶) السیرۃ النبویۃ: امام ذہبی۔

(۷) الفصول فی سیرۃ الرسول (ﷺ): حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ)۔

(۸) انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون (سیرت حلبیہ): علی بن برہان الدین (م ۹۷۵ھ)۔

(۹) المواہب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ: احمد بن محمد بن ابی بکر خطیب قسطلانی۔

ابن جریر طبری اور حافظ ابو شجاع شیرویہ نے بھی اپنی اپنی تاریخی کتابوں میں سیرت رسول اکرم (ﷺ) پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

۱۴۱۸ھ میں ڈاکٹر شیخ صالح بن عبداللہ بن حمید امام و خطیب حرم مکی نے اکتیس ماہرین علوم تاریخ وانساب وسیرت

کے ساتھ ملکر'' نضرۃ النعیم فی مکارم اخلاق الرسول الکریم (ﷺ)'' کتاب مرتب کی، جو سیرت کے موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔

لیکن یہ سب کتابیں عربی زبان میں ہیں، ان میں سے متعدد کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں بھی ہوئے اور دوسری زبانوں میں مستقلاً نئی کتابیں بھی مرتب ہوئیں، جو علمی لحاظ سے معتبر کتب شمار کی جاتی ہیں۔ ان دیگر زبانوں میں اردو زبان بھی ہے، اس میں اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی سیرت طیبہ پر کتابیں مرتب ہوئیں، خاص طور پر اردو میں تو اچھا ذخیرہ ہے، اور چونکہ ہر مصنف اپنے اپنے طرز کلام کا اپنا اسلوب رکھتا ہے، اس لیے سیرت پر تصنیف کردہ کتب کا طرز بیان الگ الگ رنگ کا بھی پایا جاتا ہے، اور پڑھنے والا اس سے اپنے اپنے فہم کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے، اور اس فرق کو مختلف مصنفین کی کتابوں کے طرز بیان میں دیکھا جاسکتا ہے، اردو میں تصنیف کردہ معروف اور گرانقدر تصنیفات سیرت میں چند بطور نمونہ حسب ذیل ہیں:

(۱) نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب (ﷺ) از حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (م ۱۳۶۲ھ)، پہلی دفعہ لکھنؤ سے ۱۳۳۳ھ میں شائع ہوئی۔

(۲) رحمۃ للعالمین از قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ، اس کی پہلی جلد ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔

(۳) سیرت النبی، اس کی پہلی جلد علامہ شبلی نعمانیؒ (م ۱۳۳۲ھ) نے تیار کی، اور بقیہ جلدیں ان کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندویؒ (م ۱۳۷۳ھ) نے مکمل کیں۔

(۴) اصح السیر از مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوریؒ، ۱۳۵۱ھ میں پہلی بار شائع ہوئی۔

(۵) سیرت مصطفیٰ از مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ (م ۱۳۹۴ھ)۔

(۶) النبی الخاتم از مولانا سید مناظر احسن گیلانی (م ۱۳۷۵ھ)۔

(۷) پیغمبر عالم از مولانا عبدالصمد رحمانی (م ۱۳۹۳ھ)۔

(۸) محمد رسول اللہ (ﷺ) از مولانا سید محمد میاںؒ (م ۱۳۹۵ھ)۔

(۹) محسن انسانیت از مولانا نعیم صدیقی

(۱۰) نبی رحمت از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ (م ۱۴۲۰ھ)۔

(۱۱) سیرت سرور عالم از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (م ۱۳۹۹ھ)۔

(۱۲) ہادیٔ عالم از مولانا محمد ولی رازی، موصوف مولانا محمد تقی عثمانی (پاکستان) کے بھائی ہیں۔

ان کتابوں کے مصنفین میں سے ہر مصنف نے اپنے اپنے زمانہ کی ضرورت اور حالات کے تقاضے کو سامنے رکھتے ہوئے سیرت طیبہ کے واقعات و حالات پیش کیے، اس طرح ہر کتاب کی افادیت اور خصوصیات اپنی اپنی جگہ خوب ہیں، اور بڑی حد تک وہ ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔

سیرت کی کتابیں جس زبان میں بھی ہیں، ان کے مصنفین کو اللہ رب العزت نے تعبیر و صحت ادا کی جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، انہوں نے ان کو اختیار کیا، انہوں نے واقعات اور اقوال کو پیش کرنے میں جو احتیاط اور دیانت ضروری ہے، اس میں کوتاہی نہیں کی، خاص طور پر اس لیے بھی کہ نبی کریم (ﷺ) کے متعلق کسی بات کو غلط طریقہ سے پیش کرنا مذہبی لحاظ سے سخت گناہ قرار دیا گیا ہے، اس لیے مسلمان سیرت نویسوں نے پوری

احتیاط سے کام لیا ہے۔ رہا اسلوب کا معاملہ تو وہ انسانوں کے فرق سے فرق رکھتا ہے۔ اور تحریر میں واقعات و احوال کو اس طرح پیش کرنے کی ایسی کوشش کہ سنی ہوئی بات دیکھی ہوئی بات بن جائے تحریر کی اچھی صلاحیت رکھنے والوں کی طرف سے ہوتی ہے، کیونکہ دیکھے ہوئے کا اثر سنے ہوئے سے زیادہ پڑتا ہے۔ اس طرح ترجمانی کا انداز بنیادی حقیقت کو پیش کرنے میں یکساں ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے رنگ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا بھی ہوسکتا ہے، بلکہ ظاہراً جدا ہی ہوتا ہے۔

اس لحاظ سے سیرت کی کتابوں کے ظاہری طرز ادا کا جائزہ لینا ایک مفید کام قرار دیا جاسکتا ہے، اس سے اسلوب کی خوبی کو سمجھنے میں مدد ملے گی، نیز اسلوب کے انداز کا جائزہ لینے کے لحاظ سے یہ ایک ادبی کام بھی قرار دیا جائے گا۔

ہم کو خوشی ہے کہ ہمارے اس سیمینار نے اسی پہلو کو موضوع مذاکرہ بنایا ہے، امید ہے کہ مختلف سیرت نگاروں کی سیرت نگاری کا جائزہ لیکر ان کی تحریر کی صفت کو اجاگر کرنے سے اس موضوع کے مضامین کا ایک اچھا گلدستہ تیار ہو جائے گا۔ اور موضوع تحریر کا تعلق حضور (ﷺ) کی سیرت طیبہ سے ہے، اس بناء پر یہ کام ادبی ہونے کے ساتھ دینی بھی بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ قبولیت عطاء فرمائے۔

سیمینار کے میزبان حضرات کے ہم خادمان رابطہ شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اس سیمینار کی ضیافت کی ذمہ داری اٹھائی، اللہ تعالیٰ ان کو بہت جزائے خیر دے، آمین۔

☆☆☆

جمال رحمت

نذیر فتح پوری

وجود اس کا کمال رحمت
ہے شخصیت لازوال رحمت
جواب اس کا کہاں سے لائیں
ہے جس کا ہر اک سوال رحمت
معافیاں دشمنوں کو دی ہیں
ہے کون ایسا کمال رحمت
ہے اس سے نسبت خدا سے نسبت
ہے اس سے ملنا وصال رحمت
ہے شان، شانِ کریمی اس کی
ہے اس کا جاہ و جلال رحمت
میں اس کے جلوؤں میں کھو گیا ہوں
ہیں اس کے جلوے جمال رحمت
مثال اس کی نہ ڈھونڈ پیئے گا
ہے خود میں جو مثال رحمت
نذیرؔ میرے قلم کی کاوش
ہے سب کا سب یہ کمال رحمت

☆☆☆

مولانا محمد وثیق ندوی

رپورٹ سیمینار بعنوان

مختلف زبانوں میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ

رابطہ ادب اسلامی عالمی (برصغیر وممالک مشرقیہ) نے اپنا سالانہ ۲۷/واں مذاکرہ علمی بعنوان ''مختلف زبانوں میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ'' جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم (اورنگ آباد) کے زیر اہتمام بتاریخ ۱۳-۱۴/جمادی الثانیہ ۱۴۳۰ھ مطابق ۷-۸/جون ۲۰۰۹ء منعقد کیا، اس میں ہندوستان کے مختلف شہروں لکھنؤ، رائے بریلی، بھوپال، دہلی، الہ آباد، اجین، اورنگ آباد، بھٹکل، حیدرآباد، ممبئی، پونہ، مالیگاؤں، ہریانہ، علی گڑھ، اکل کوا، گجرات، مئو، اعظم گڈھ اور برہان پور وغیرہ سے ۱۰۳ مندوب شریک ہوئے اور مندرجہ ذیل اداروں کی نمائندگی ہوئی: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی، برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال، جامعہ ملیہ دہلی، جامعہ کاشف العلوم اورنگ آباد، مدرسہ انوار العلوم اورنگ آباد، جامعہ اسلامیہ بھٹکل، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، معہد ملت مالیگاؤں، مدرسہ اسلامیہ قرآنیہ فیض العلوم ہریانہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا، مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ اور مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی اکیڈمی بھٹکل۔

اس کے علاوہ قرب وجوار کے مثقف اور باذوق حضرات بڑی تعداد میں ذوق وشوق کے ساتھ تمام پروگراموں میں شریک ہوئے، شہر اورنگ آباد اور اس کے اطراف کے مسلمانوں کی دلچسپی اور لگن قابل دید تھی، ایک مقامی اخبار نے لکھا کہ دو دن پورے شہر اور قرب وجوار پر روحانی فضا چھائی رہی، جامعہ کاشف العلوم کے طلبہ نے بڑے ذوق وشوق کا مظاہرہ کیا۔

افتتاحی اجلاس:

افتتاحی اجلاس ۷/جون ۲۰۰۹ء بروز اتوار صبح ۱۰/بجے جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم سے متصل نہرو بھون میں مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وایڈیٹر ''البعث الاسلامی'' کی صدارت میں منعقد ہوا، اجلاس کا آغاز حافظ محمد مصطفیٰ کی تلاوت سے ہوا، جامعہ کاشف العلوم کے طالب علم محمد اکرم خان (متعلم عالیہ ثالثہ) نے بارگاہ رسالت میں نذرانہ عقیدت پیش کیا، جامعہ کے طالب علم نورالفیصل اوران کے ساتھیوں نے ترانہ جامعہ پیش کیا، ناظم جامعہ مولانا محمد ریاض الدین فاروقی ندوی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا، جن کی پیشکش پر مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی آرام گاہ کے جوار میں واقع جامعہ

کاشف العلوم میں رابطہ کا ۲۷واں سیمنار منعقد کیا گیا، انہوں نے مہمانوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اورنگ آباد کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی اور یہاں مختلف زمانوں میں تشریف لانے اور روحانیت سے یہاں کی فضا کو معمور کرنے والے اولیائے کرام کے ساتھ ملک عنبر کے کارناموں اور عالمگیر کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا، اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی عمر کے آخری ۲۵ سال یہیں گزارے، ملک عنبر کی بنائی ہوئی جامع مسجد میں فتاوی عالمگیر کی ترتیب اور تدوین شروع ہوئی اور اورنگ زیب کو ان کی وصیت کے مطابق خلد آباد میں متعدد اہل اللہ اور اولیائے کرام کے قبروں کے بیچ دفن کیا گیا۔ اور کہا کہ ہم بے حد شکر گزار ہیں ذمہ داران رابطہ کے کہ انہوں نے تمام راحتوں، سہولتوں اور آسائش کی پیشکش کو نظر انداز کر کے اورنگ آباد ہی کو میزبانی کا شرف بخشا، یہ جامعہ کاشف العلوم کی خوش قسمتی ہے کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی حیات میں یہاں دو سیمنار منعقد کئے جانے کے زریں مواقع حاصل ہوئے، پہلا سیمنار ۷-۹/اکتوبر ۱۹۸۸ء میں اسی مقام پر ''نعتیہ شاعری تاریخی وعلمی جائزہ اور خصوصیات'' کے عنوان پر منعقد ہوا، دوسرا سیمنار ۷-۹/اپریل ۱۹۹۵ء کو ''ادب میں سفرناموں کی اہمیت'' پر منعقد ہوا۔ خطبۂ استقبالیہ کے بعد مولانا انیس احمد پرخاصوی الہ آبادی نے بارگاہ رسالت میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

اس کے بعد مولانا سید محمد واضح رشید ندوی سکریٹری رابطہ ادب اسلامی (برصغیر وممالک مشرقیہ) کی تحریر کردہ رابطہ کی رپورٹ استاد محترم مولانا اقبال احمد ندوی نے پیش کی، اپنی رپورٹ میں مولانا نے کہا کہ رابطہ ادب اسلامی ایک عالمی تنظیم ہے جس کا بنیادی مقصد اخلاق، مذہب اور ادب، علم اور ادب اور فکر وفن کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والوں کے درمیان رابطہ اور تعلق پیدا کرنا ہے، اس کا مقصد بہت بلند اور اعلیٰ وارفع ہے، اور وہ ہے انسانی زندگی کی تعمیر وتشکیل، اخلاق کی اصلاح ودرستی، اور انسان کی صلاحیتوں کو دوسرے انسانوں اور انسانیت کی فلاح وبہبود میں صرف کرنا اور زبان وقلم کو ان کی آلائشوں اور خرابیوں سے پاک کرنا اور یہ حقیقت ہے کہ زبان وقلم کے غلط استعمال سے ہر دور میں انسانوں پر مصیبتیں اور پریشانیاں آئی ہیں کیونکہ ادب کے بارے میں یونانی فکر کے اثر سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ادب نام ہے محض اندرونی خیالات وجذبات کو موثر اور حسن بیان کے ذریعہ دوسروں کے سامنے پیش کر دینے کا، خواہ اس کا اثر قلب اور معاشرہ پر اچھا یا خراب کچھ بھی پڑے، ادب کے اسی مقصد اور غرض وغایت کو بروئے کار لانے اور اس کے راستے کے تعین ووضاحت کے لیے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے جنوری ۱۹۸۶ء میں اس رابطہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے دو مرکزی دفتر ہیں، ایک عالم عربی کے لیے جو سعودی عرب کے دارالسلطنت ریاض میں ہے اور دوسرا برصغیر وممالک مشرقیہ کے لیے جو لکھنؤ میں ہے اور اس کی نگرانی میں دہلی، حیدرآباد، اورنگ آباد، بھوپال، بھٹکل، بنگلور، پونہ، پٹنہ، رانچی، کلکتہ، رائے بریلی، علی گڑھ اور غازی پور میں شاخیں قائم ہیں اور کام کر رہی ہیں اور ان تمام شہروں میں مختلف سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، رابطہ کی مختلف شاخوں نے ادبی مجالس کا بھی نظم کیا، خاص طور سے دہلی، بھوپال، بھٹکل اور اورنگ آباد کی شاخ نے اور اس میں علاقہ کے ادباء اور شعراء کو دعوت دی گئی اور ان کی شرکت سے ادب اسلامی کے تعارف میں مدد ملی، مرکزی دفتر ریاض کی طرف سے عالم عربی کے مختلف ملکوں میں سیمنار منعقد کئے گئے اور ادبی ہفتوں کا انعقاد ہوا جس میں مدارس اور کالجز کے ادباء وشعراء نے

حصہ لیا۔

اس کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صدر رابطہ ادب اسلامی (شعبۂ برصغیر وممالک مشرقیہ) کا صدارتی خطبہ پیش کیا گیا جسے سید محمود حسنی ندوی نے پڑھ کر سنایا جس میں حضرت مولانا لکھتے ہیں کہ: ''حضور اکرم کو اللہ رب العالمین نے تا قیامت انسانوں کے لیے رہبر اور صلاح ورشد کا نمونہ بنایا اور ان کے ذمہ یہ کام سپرد کیا کہ آپ انسانیت کی کشتی کو زندگی کے منجدھار میں صحیح طریقہ سے چلانے کا فریضہ اور طریقہ کار بتائیں اور اس کے لیے خود آپ کی حیات طیبہ کے تمام پہلو زندگی کے صحیح طریقہ کار کو سمجھنے کے لیے بطور نمونہ اور ذریعہ تعلیم وتربیت رکھے گئے ہیں، تمام صحابہ آپؐ کے اشاروں پر چلتے تھے، یہ اصحاب کرام آپ کی باتوں کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیتے تھے، اس طرح حضورؐ کی پوری زندگی محفوظ ہوگئی، آج اسلام کے معاندین نے حضورؐ کی حیات طیبہ کو جھوٹ اور معاندانہ پروپگنڈہ کے ذریعہ برے انداز میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، انہوں نے اس سلسلہ میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوششیں کیں جس کی وجہ سے اسلام سے ناواقف لوگوں کے ذہنوں میں غلط خیالات پیدا ہوئے۔ اس لیے مسلمان اہل علم پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ سیرت کو صحیح طریقہ سے ناواقف لوگوں کے سامنے لائیں''۔

حضرت مولانا نے تدوین سیرت کے تاریخی جائزہ اور سیرت کے موضوع پر عربی واردو میں اہم تصنیفات کے تذکرہ کے بعد لکھا کہ ''ان کتابوں کے مصنفین میں سے ہر مصنف نے اپنے اپنے زمانہ کی ضرورت اور حالات کے تقاضے کو سامنے رکھتے ہوئے سیرت طیبہ کے واقعات وحالات پیش کئے، اس طرح ہر کتاب کی افادیت اور خصوصیات اپنی اپنی جگہ خوب ہیں، اور بڑی حد تک وہ ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔

سیرت کی کتابیں جس زبان میں بھی ہیں ان کے مصنفین کو اللہ رب العزت نے تعبیر وصحت ادا کی جو صلاحیتیں عطاء فرمائیں ہیں، انہوں نے انکو اختیار کیا، انہوں نے واقعات اور اقوال کو پیش کرنے میں جو احتیاط اور دیانت ضروری ہے، اس میں کوتاہی نہیں کی، خاص طور پر اس لئے بھی کہ نبی کریم ﷺ کے متعلق کسی بات کو غلط طریقہ سے پیش کرنا مذہبی لحاظ سے سخت گناہ قرار دیا گیا ہے، اس لئے مسلمان سیرت نویسوں نے پوری احتیاط سے کام لیا، رہا اسلوب کا معاملہ تو وہ انسانوں کے فرق سے فرق رکھتا ہے، اور تحریر میں واقعات واحوال کو اس طرح پیش کرنے کی ایسی کوشش کہ سنی ہوئی بات دیکھی ہوئی بات بن جائے، تحریر کی اچھی صلاحیت رکھنے والوں کی طرف سے ہوتی ہے، کیونکہ دیکھے ہوئے کا اثر سنے ہوئے سے زیادہ پڑتا ہے، اس طرح ترجمانی کا انداز بنیادی حقیقت کو پیش کرنے میں یکساں ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے رنگ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا بھی ہوسکتا ہے، بلکہ ظاہراً جدا ہی ہوتا ہے''۔

اس کے بعد حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم نے صدارتی تقریر کی، مولانا نے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے حضرت کعب بن زہیرؓ کا ایک شعر پڑھا اور کہا کہ اس شعر کو ایک ادبی حیثیت حاصل ہے اور اس میں عشق رسولؐ مضمر ہے، یعنی اللہ کا رسولؐ ایسا نور ہے جس سے ہمیشہ پوری دنیا روشنی حاصل کرتی ہے جس سے پوری دنیا روشن ہوئی ہے، انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ نے انبیاء اور رسولوں کو بھیجا، لیکن ان کا رقبہ محدود رکھا، لیکن آپ کو جو نور عطاء کیا وہ پوری دنیا کے لیے تھا، غیر محدود تھا اور ایک دور ایسا بھی آیا کہ امت ایک امت مسلمہ بن گئی، لہٰذا سیرت کے اسی نور سے ہمیں استفادہ کرنا ہے اور جس وقت دنیا آپؐ کی

تعلیمات اور آپؐ کے نور سے خالی ہو جائے گی تب قیامت قائم ہو جائے گی، آپؐ کی زندگی ایک ایسی ہمہ گیر اور عالمگیر زندگی ہے جس میں ہماری ضرورت کی تمام باتیں موجود ہیں، آپؐ کی ذات میں ایک ایسا اسوہ اور نمونہ ہے جو ایمان والوں کی ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے، اس لیے آپؐ کی اتباع اور آپؐ کی تعلیمات کو رہبر و نمونہ بنانا نہایت ضروری ہے، آپؐ کی سیرت دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے، لہٰذا آپ کی سیرت، کتابوں، علماء دین کے کام کرنے والوں سے حاصل کیجئے، اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا کو امام بنا دے گا، پوری انسانیت آپ کی پیروی کرے گی، یہ اجلاس آپؐ کی سیرت پر ہو رہا ہے، ادب کے بغیر انسان، انسان نہیں بن سکتا، ادب ہی انسان کو انسان بناتا ہے۔

افتتاحی اجلاس میں استاد گرامی قدر مولانا عبداللہ حسنی ندوی (استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلما) ڈاکٹر شفیق احمد ندوی (سابق صدر شعبہ عربی ادب جامعہ ملیہ دہلی) کے علاوہ اصحاب علم فضلا اور اورنگ آباد شہر کے اعیان نے شرکت کی۔ اس نشست کی نظامت کے فرائض جامعہ کے استاذ تفسیر وادب مولانا عبدالقدیر قاسمی مدنی نے انجام دیئے۔

مقالات کی نشستیں:

اس کے بعد مقالات کی نشستیں ہوئیں، تمام مقالوں کو جن کی تعداد ۲۷ تھی چار نشستوں میں تقسیم کیا گیا، تقریباً سبھی مقالات پڑھے گئے، مقالات کی پہلی نشست حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی صدارت میں بمقام نہرو بھون منعقد ہوئی، اور نظامت کے فرائض مولانا صدر الحسن ندوی مدنی نے انجام دیئے۔ اس نشست میں تین مقالے پیش کئے گئے، پہلا مقالہ مولانا ظل الرحمٰن تیمی (شعبۂ تعلیم سعودی ایمبسی دہلی) نے ''ڈاکٹر محمد لقمان سلفی کی کتاب ''الصادق الأمین کا ادبی جائزہ'' کے عنوان پر پیش کیا، دوسرا مقالہ ڈاکٹر عزیز احمد قادری (ماہر نفسیات اورنگ آباد یونیورسٹی) نے انگریزی میں پیش کیا، تیسرا مقالہ پروفیسر انیس احمد چشتی (پونہ) نے ''سیرت نبوی اور مراٹھی ہندو مؤلفین، ایک مطالعہ'' کے موضوع پر پیش کیا، نشست کے اخیر میں استاد گرامی مولانا سید عبد اللہ حسنی ندوی نے تأثرات پیش کئے، اور پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد ندوی (ذمہ دار صدر دفتر دہلی برائے رابطہ ادب اسلامی برصغیر وممالک مشرقیہ) نے شکریہ ادا کیا۔

مقالات کی دوسری نشست بعد نماز مغرب (۷/جون) بمقام سعید ہال جامعہ کاشف العلوم منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر شفیق احمد ندوی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض مولانا ضیاء الحسن نے انجام دیئے، مقالہ نگار حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (لکھنؤ، مقالہ: تطور أدب السيرة النبوية باللغة العربية في الهند) پیروفیسر ابوسفیان اصلاحی (علی گڑھ، مقالہ: قاری مسعود کی کتاب'' حیات نبی امی'' ایک جائزہ)، ڈاکٹر سمیع اختر (علی گڑھ، مقالہ: عبقریۃ محمد: ایک جائزہ) مولانا عمیر صدیق ندوی (اعظم گڈھ، مقالہ: سیرت النبی کی ادبی خصوصیات) تھے۔

تیسری نشست (منعقدہ ۸/جون، ۹ بجے صبح بروز دوشنبہ) کی صدارت پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے کی اور نظامت کے فرائض مولانا محمد نسیم الدین مفتاحی نے انجام دئے، مقالہ نگاروں میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے ''حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ اور آپ کا کلام بلاغت نظام'' کے موضوع پر، مولانا مسعود احمد اعظمی (مئو) نے ''مرزا حیرت دہلوی اور ان کی سیرت محمدیہ'' کے عنوان پر، مولانا سید ضیاء الحسن (لکھنؤ) نے ''پدماوت میں ذکر رسول ﷺ'' کے موضوع پر، مولانا صدر الحسن ندوی مدنی (اورنگ آباد) نے ''النبی الخاتم کا ادبی جائزہ'' کے موضوع پر، مولانا محمد شعیب کوٹی

قاسمی (بمبئی) نے ''کتب سیرت کا ادبی جائزہ'' کے موضوع پر، ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان (اورنگ آباد) نے ''مولانا مودودی کی تصنیف سیرت سرورعالم کا جائزہ'' پر، مولانا عبدالرشید ندوی مدنی (اورنگ آباد) نے ''النبی الختام کا ادبی جائزہ'' اور مولانا کفیل احمد ندوی (لکھنؤ) نے مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ''رسول رحمت کا ایک مختصر جائزہ'' کے موضوع پر مقالات پیش کئے۔

چوتھی نشست (منعقدہ ۸؍جون ساڑھے گیارہ بجے دن) کی صدارت پروفیسر انیس چشتی (پونا) نے کی جب کہ نظامت کے فرائض مولانا محمد شعیب کوٹی قاسمی نے انجام دیئے، مقالہ نگاروں میں مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے ''مختلف زبانوں میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا جسے مولانا اقبال احمد ندوی (لکھنؤ) نے پڑھا، پروفیسر محمد حسان خاں (بھوپال) نے ''خطبات مدراس کا ادبی جائزہ'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا، عارف عزیز (بھوپال) نے ''خطبات مدراس کا ادبی رنگ وآہنگ'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا، مولانا عبدالرحمٰن ملی ندوی (اکل کوا) نے ''سیرت نگاری ادب اسلامی کے تناظر میں'' کے موضوع پر، مولانا ناصر ایوب ندوی (ہریانہ) نے ''ہادی عالم کا ایک ادبی جائزہ'' کے موضوع پر، مولانا عبدالوحید فیاضی (بمبئی) نے ''اردو زبان میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ'' کے موضوع پر، ڈاکٹر عبدالمقتدر عتیق (اورنگ آباد) نے ''الرحیق المختوم کا ادبی جائزہ'' کے موضوع پر، مولانا محمد الیاس ہاشمی ندوی (حیدرآباد) نے "دلائل النبوة لأبی نعیم الأصفهانی دراسة فنیة تحلیلیة"، کے عنوان پر، پروفیسر عبدالوہاب جذب (اورنگ آباد) نے ''الرحیق المختوم کا ادبی جائزہ'' اور پرفیسر شفیق احمد خاں ندوی (دہلی) نے ''سیرت نبوی نعتیہ شاعری کے ادبی تناظر میں'' کے موضوعات پر مقالات پیش کئے۔

اختتامی نشست

اس کے بعد سیمینار کی اختتامی نشست زیر صدارت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم منعقد ہوئی، جس میں اقلیمی دفتر دہلی کی رپورٹ پروفیسر شفیق احمد خان ندوی نے پیش کی، بھٹکل شاخ کی رپورٹ مولانا الیاس بھٹکلی ندوی نے پڑھ کر سنائی، جب کہ تجاویز مولانا سید ضیاء الحسن نے پڑھ کر سنائیں اور مندوبین کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے ناظم جامعہ، اساتذہ وطلبہ ومنتظمین کو سراہا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اختتامی نشست سے اپنے صدارتی خطاب میں علماء، دانشوران، پروفیسرس، ڈاکٹرس اور معززشہریان کے جم غفیر سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ: '' آج کل معروضیت اہم چیز مانی جاتی ہے، لیکن جولوگ کام کرتے ہیں وہ بھی اس کا حق ادا نہیں کرپاتے اور کوشش کرتے ہیں کہ ادب میں اخلاقی عنصر بالکل نہ آنے پائے اور کسی واقعہ کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کا اخلاق پہلو نمایاں نہ ہو اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے دوسرے عوامل بھی کام کررہ ہیں، ادب کا جو نفسیاتی پہلو ہے اس کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے، ادب میں اس کی بڑی اہمیت ہے، بعض ادب ایسا پیش کیا جاتا ہے کہ اس کو ادب کہنا بھی مشکل ہوتا ہے، بلادعربیہ میں آج کل ایسا ادب رائج ہے کہ عبارت میں جوالفاظ آتے ہیں ان الفاظ کا سب معنی ومطلب معلوم ہے، ادیب کیا چاہتا ہے یہ معلوم نہیں ہوتا، ہمارا رابطہ چاہتا ہے کہ ان سب میں توازن قائم رکھیں، جس طرح اسلام سارے پہلوؤں پر محیط ہے اسی طرح ہمارا ادب اسلامی سارے پہلو پر محیط ہے، اسلام میں دین کے ساتھ دنیا بھی شامل ہے کیونکہ انسانی زندگی کے بہت سے تقاضے اور ضروریات ہیں اسلام ان

سب کی رعایت کرتا ہے، اس لئے اسلامی اخلاقیات کی رعایت بہت ضروری ہے، ہم ادب کو ادبی دائرہ کے اندر رکھتے ہوئے کام کرتے ہیں، ہمارے سیمناروں کے موضوعات بھی ادبی پہلو کے اندر بڑی ندرت رکھتے ہیں، اس لیے ہمارے سیمنار کامیاب ہوتے ہیں، ہم کسی تعصب اور جماعت پرستی کی بھی دعوتی نہیں دیتے، بلکہ ہم سب کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور الحمدللہ ہمیں سب کا تعاون بھی مل رہا ہے''۔

صدارتی خطاب کے بعد ناظم جامعہ مولانا محمد ریاض الدین نے کلمات تشکر وامتنان پیش کئے۔

اس نشست میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی اور سکریٹری رابطہ ادب اسلامی مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی بھی موجود تھے، نظامت کے فرائض مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی نے انجام دیئے۔

تجاویز:

تجاویز کو تیار کرنے کے لئے ایک پانچ رکنی کمیٹی بنائی گئی، اس نے تجاویز کا مسودہ تیار کیا، آخری نشست میں یہ تجاویز پیش کی گئیں اور حاضرین نے انہیں منظور کیا، ان تجاویز کا یہاں خلاصہ پیش کیا جارہا ہے:۔

۱۔ سیمنار میں پڑھے گئے مقالات ہندی، اردو، عربی اور انگریزی زبانوں میں شائع کرنے کا جلد از جلد انتظام کیا جائے۔

۲۔ سیرت طیبہ کے ادبی پہلوؤں کے متعلق مدارس اسلامیہ اور عصری جامعات کے ارباب حل وعقد کی توجہ مبذول کرائی جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ علمیت، فضیلت کے مقالات اور ایم فل، پی ایچ ڈی کے ڈزرٹیشن اور تھیسس کے عناوین سیرت نبوی کے ادبی، فنی، سماجی، اخلاقی اور عالمگیر سیاسی تناظر میں متعین کرنے کی کوشش کریں تاکہ انسانی زندگی کا مثالی نمونہ دنیا کے سامنے درخشاں مشعل راہ بن کر سامنے آسکے۔

۳۔ شرکاء سیمنار برصغیر ہندوپاک کے نمائندہ مدارس سے التماس ہے کہ وہ اپنے یہاں ''مرکز السیرۃ والسنۃ للبحوث والدراسات'' کا قیام عمل میں لائیں جن کے ماتحت سیرت طیبہ اور سنت مطہرہ کے عمومی انسانی اور آفاقی پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔

۳۔ عصری یونیورسٹیوں سے گزارش کی جائے کہ وہ عربی، اردو، فارسی تھیالوجی اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں میں سیرہ چیئر Seerat Chair کا قیام عمل میں لائیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی کی دعاء پر اس سیمنار کا اختتام ہوا، اس اجلاس کو کامیاب بنانے میں تمام ہی اساتذہ جامعہ وطلبہ، مجلس استقبالیہ وارا کین جامعہ نے خوب جدوجہد کی۔

نماز عصر کے بعد جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم کے طلباء کی انجمن نے شرکاء سیمنار کے اعزاز میں استقبالیہ دیا، اس موقع پر طلباء نے مختلف ثقافتی اور علمی مظاہرے بھی کئے۔

نماز مغرب کے بعد اصلاح معاشرہ کے عنون سے اجلاس عام منعقد کیا گیا جس میں شہر اور اطراف شہر سے ہزراوں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے، اس موقع پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور استاد گرامی مولانا عبداللہ حسنی ندوی کے فکر انگیز خطابات ہوئے۔

☆☆☆

☆☆☆

سرک کر آگئیں زلفیں جو ان مخمور آنکھوں تک
میں یہ سمجھا کہ مئے خانے پہ بدلی چھائی جاتی ہے

نشورواحدی

☆☆☆

رپورٹ ادبی نشست منعقدہ پونہ

..... پروفیسر انیس چشتی

''ادب صرف ذخیرۂ الفاظ ہی نہیں بلکہ وہ انسانی جذبات واحساسات کی ترجمانی بھی ہے۔ ادب میں لفظی تکرار اوران کا تواردایک ایسی کیفیت پیدا کردیتا ہے جس سے انسان مسحور ہوجاتا ہے۔ ادب اسلامی کا مقصد ہی انسانیت کوفروغ دینا اور انسانوں کے لئے صالح ادب تخلیق کرنا ہے۔ عالمی رابطۂ ادبِ اسلامی کی بنیاد ۱۹۸۱ء میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی قیادت میں رکھی گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس تحریک نے اس قدر کامیابی اور مقبولیت حاصل کرلی کہ سارے عالم کے صالح اقدار کے حامل ادباء اور شعراء اس تحریک میں شامل ہوگئے۔ دنیا کے مختلف ممالک کے بڑے شہروں میں اچھوتے موضوعات پر اس کے سیمینار منعقد ہونے لگے اور تحریک کے زیر اہتمام اردو ،عربی اور انگریزی زبانوں میں مجلّات شائع ہونے لگے'' ان خیالات کا اظہار عالمی رابطہ ادب اسلامی (ممالک مشرقی) کے صدر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے پونہ میں اس تحریک کی شاخ کے ذریعہ منعقدہ ایک ادبی اجلاس میں کیا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مولانا کا خود اس اجلاس میں شریک ہونا طے تھا لیکن اپنی علالت اور کمزوری کی وجہ سے وہ اس اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ لیکن اس موقع پر منتظمین نے ایک انوکھا تجربہ یہ کیا کہ بذریعہ ٹیلی فون مولانا سے ان کے وطن رائے بریلی میں رابطہ قائم کیا اور صدر رابطہ نے تقریباً ۲۵ منٹ تک اپنی تقریر فرمائی جو پورے ہال میں گونجتی رہی اور شرکاء نے یکسو ہو کر سنی۔ مولانا نے اپنے تقریر میں حالات حاضرہ کی روشنی میں ادب کی بدلتی قدروں کا جائزہ لیا اور تازہ دم ادیبوں اور شعراء کی کھیپ تیار کرنے پر زور دیا۔ صدر رابطہ نے یہ بات بھی بتائی کہ تہذیب ادبی اقدار کو کس طرح متاثر کرتی ہے اور ادب طرزِ معاشرت اور ثقافت پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔

اس اجلاس کی صدارت عالمی رابطہ ادب اسلامی کے رکن انیس چشتی نے کی۔ انھوں نے آواز، صدا، حروف، الفاظ، عبارت، لہجہ، لسانیات اور لغت کے رشتوں پر مفصل علمی بحث کرتے ہوئے بتایا کہ دنیا میں وہی ادب زندہ بچتا ہے جس کا رشتہ آسمانی پیغامات اور الہامی لہجوں سے مربوط ہو اور اس کا سب سے بڑا ماخذ قرآن کریم ہے۔ جو ادب کتب سماوی سے مطابقت نہیں رکھتا وہ فنا ہو جاتا ہے۔ اور ایسی تخلیقات وقتی چیز بن کر رہ جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنے زیر طبع سفرنامۂ مصر ''فرعون کیا سوچتا ہوگا؟'' کے ابتدائی اوراق بھی پڑھ کر سنائے اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کے سہ ماہی جریدے ''کاروان ادب'' کا بھی بھرپور تعارف پیش کیا۔

اجلاس دو نشستوں پر مشتمل تھا۔ پہلی نشست میں نثری نگارشات پیش کی گئیں۔ جس کی ابتداء ماہنامہ اسباق کے مدیر نذیر فتح پوری کی پر اثر حمد اور نور منیری کی نعت سے کی گئی۔ نثری نشست میں حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ کے صدر منور پیر بھائی نے اپنے مخصوص انداز میں ''علامہ اقبال کے کلام میں مسجدوں کا ذکر'' جیسے انوکھے موضوع پر ایک مقالہ پیش کیا، جبکہ حسن عباس فطرت، بشیر احمد انصاری اور قاضی مشتاق احمد نے بالترتیب حج، تعلیم اور سماج میں ادبی قدریں جیسے عناوین پر خالص ادبی انداز میں اپنے مقالے پیش کئے۔

دوسری نشست شعری نگارشات کے لئے مخصوص تھی، جس کی صدارت بزرگ شاعر نور منیری نے کی۔ اس نشست میں دلدار ہاشمی، نذیر فتحپوری، اُدھو مہاجن بسمل، عالم فتحپوری اور رفیق قاضی جیسے معروف اور جدید لہجے کے شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت جواں سال جواں فکر شاعر اور ڈرامہ نگار رفیق قاضی نے انجام دی۔

جلسے میں بڑی تعداد میں خواتین، ادب دوست حضرات اور کالجوں کے طلبہ نے شرکت کی۔ جن میں جماعت اسلامی کے امیر حلقہ پروفیسر عزیز محی الدین، شبان المسلمون کے بشیر الدین شیخ، ترقی اردو بورڈ پونہ شاخ کی صدر ممتاز منور، صحافی شبیر محمود مجاہد، کرنل این زین العابدین، معروف انگریزی اردو مصنف اور صحافی مشتاق مدنی، مشتاق اثر، مشتاق پٹیل، حسام الدین شعلہ، ابراہیم امر، اقبال حمید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جلسے کے اختتام سے پہلے تنظیم والدین کے جنرل سکریٹری اسحٰق شرف الدین نے اپنے عطائی لہجے اور دلنواز انداز میں منتظمین، شرکاء، ادباء، شعراء، اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور آئندہ اس قسم کے پروگراموں کے انعقاد کا اعادہ کیا۔

نوٹ: ذیل میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی صدر رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر کی وہ تقریر دی جارہی ہے جو حضرت مولانا نے اس ادبی اجلاس کے لئے کی تھی جو رابطہ کی پونہ شاخ نے مورخہ ۵/دسمبر ۲۰۰۹ء کو اسمبلی ہال اعظم کیمپس، خان بہادر ہدایت اللہ روڈ، پونہ میں ادب کی اہمیت اور طاقت کے موضوع پر منعقد کی تھی، اس جلسہ کا انعقاد جناب پروفیسر انیس چشتی صاحب سکریٹری رابطہ ادب اسلامی پونہ شاخ کے انتظام میں ہوا، مولانا مدظلہ العالی نے اس اجلاس کو خطاب کیا، جس کی حیثیت صدارتی خطاب کی ہے۔ تقریباً بیس منٹ کی اس تقریر کو برادرم عثمان ممتاز ندوی نے ٹیپ کی مدد سے نقل کیا، اب اسے حضرت مولانا کی نظر ثانی اور حذف و اضافہ کے بعد افادۂ عام کے لئے ہدیۂ ناظرین کررہے ہیں۔ (ادارہ)

ادب کی طاقت

الحمد للّٰہ الذي کفیٰ ، و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ، أما بعد :

حضرات! یہ ہمارے لئے بہت خوشی کی بات ہے کہ ہم پونہ کے حضرات سے بات کررہے ہیں، پونہ ایک بہت ہی خوشگوار شہر ہے، وہاں اہل علم کی اچھی خاصی تعداد ہے، اور اس میں ظاہر ہے ادب سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی بہت سے ہوں گے، جن سے ہم خطاب کررہے ہیں، اور ہم رابطہ ادب اسلامی کے نمائندے کی حیثیت سے آپ لوگوں سے خطاب کررہے ہیں۔

رابطہ ادب اسلامی کو قائم ہوئے ایک عرصہ ہوا۔ ۱۹۸۱ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت و تحریک پر اس کا قیام عمل میں آیا تھا، اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ہی اس کے اولین صدر قرار پائے تھے اور تاحیات

اس کے صدر رہے۔ اصل میں مولانا کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ اسلام تو زندگی کے سارے شعبوں کا احاطہ کرتا ہے، اور انسان کے جذبات واحساسات کی اس میں پوری رعایت رکھی گئی ہے، اور ادب ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے انسان اپنے خیالات کا اظہار اس طریقہ سے کرسکتا ہے جس سے اس کے احساسات وجذبات کی بھی عکاسی ہوتی ہو، یہی احساس رابطہ ادب اسلامی کے قیام کا محرک بنا۔

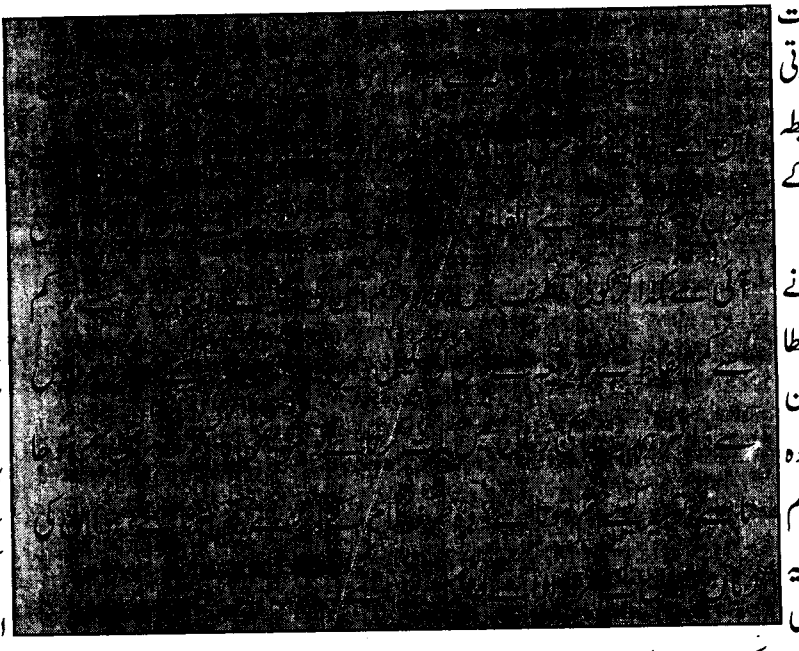

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو زبان عطا فرمائی ہے، اور زبان کے جو الفاظ ہیں، وہ جامد اور سپاٹ قسم کے نہیں ہیں، بلکہ یہ اپنے اپنے طرز کی گہرائی اور کیفیات بھی رکھتے ہیں، جن کو سننے والا محسوس کرتا ہے، اور کہنے یا لکھنے والا ان کے لحاظ سے الفاظ کو اختیار کرتا اور ترتیب دیتا ہے، اس طرح جب کہنے والا اس مقصد کا لحاظ کرتے ہوئے بات کہتا ہے تو اس کے الفاظ اس کے جذبات واحساسات کے ترجمان بن جاتے ہیں، اور آدمی ان کے ذریعہ اپنے دل کی بات دوسروں کے دل میں اتار دیتا ہے، اس طرح سننے والا محسوس کرلیتا ہے کہ کہنے والے کے کیا احساسات ہیں اور کیا اس کے جذبات ہیں؟ اور جب الفاظ وعبارت انسان کے احساسات و جذبات کو بھی ادا کرتے ہوں اور ان میں ان کا عکس جھلکتا ہو تو اسی کا نام ادب ہے۔

ادب کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ محض سپاٹ اور جامد قسم کی عبارت ہو، وہ اپنے اندر اثر انگیزی رکھتا ہے، وہ ایک ایسا فن ہے جس سے انسان کو اپنی بات اور اپنا مافی الضمیر بلکہ اپنے جذبات واحساسات اور تاثرات دوسروں تک پہونچانے میں بڑی مدد ملتی ہے، انسان جذبات اور احساسات کی فطرت رکھتا ہے، وہ کوئی جامد قسم کی مخلوق نہیں ہے، جامد اور سپاٹ قسم کی مخلوق تو جانور کی ہوتی ہے، جانور اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کے لئے ایسا ذریعہ نہیں رکھتے کہ وہ باریکی اور تنوع کے ساتھ اپنی کیفیت ظاہر کرسکیں، لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے زبان کا ایسا ذریعہ دیا ہے کہ اس میں صرف بات ہی نہیں بلکہ احساس و جذبہ بھی منتقل کیا جاسکتا ہے، اور اس طریقہ سے انسانی معاشرہ کو بڑی تقویت حاصل ہوتی ہے، اور اس راہ سے ادب بعض وقت انقلابی اثر پیدا کردیتا ہے۔

ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ ادب نے بعض وقت پوری پوری قوم میں انقلاب برپا کردیا ہے اور پورے پورے ملک کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ فرانس کے انقلاب کے متعلق بھی کچھ اسی طرح کی بات کہی جاتی ہے کہ وہاں کے بعض فکری قائدین نے اپنی دلنشیں باتوں اور پُر اثر کلام سے انقلابی اثر ڈالا۔ اور آپ بعض دوسرے مواقع کو بھی دیکھیں گے

کہ ان میں ادب کے ذریعہ بعض وقت بہت بڑی تبدیلی لے آئی گئی ہے، لیکن یہ اس وقت ہے جب آدمی ادب کی اس طاقت کو سمجھے، لیکن اگر ادب کو صرف ایک کھلونے کے طور پر استعمال کیا جائے کہ اسے صرف لطف ولذت کے دائرے میں محدود کردیا جائے یا صرف انفرادی رغبت وچاہت سے ہی وابستہ رکھا جائے تو پھر وہ ایک کھلونا ہی بن کے رہ جاتا ہے، اور ہمیں افسوس ہے کہ یہ بات اس زمانہ میں عام ہوگئی ہے کہ ادب کو کھلونا بنا کر رکھا گیا ہے، اور اس کو انسان کے فائدہ کے لئے تو کم اور زیادہ تر انسان کے بگاڑ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، جب کہ ادب کو عطیۂ الٰہی سمجھنا چاہئے، اور اس کو انسان کے جائز انسانی تقاضوں کے لئے استعمال کرنا چاہئے، لیکن ایسا نہیں ہورہا ہے۔

ضرورت ہے کہ ادب انسان کے صحیح اور جائز فطری تقاضوں کی خیر خواہانہ ترجمانی کے لئے زیادہ استعمال کیا جائے، تاکہ اس سے انسان کی صحت مندانہ نفسیاتی ضرورتوں کی مناسب ترجمانی ہو، اور اسلام چونکہ زندگی کے سارے شعبوں پر محیط ہے، وہ زندگی کے سارے انسانی پہلوؤں میں مفید رہنمائی کرتا ہے، اور اس کی مدد کرتا ہے، اور انسان ایسی مخلوق ہے کہ اس کے احساسات غم کے بھی ہیں، خوشی کے بھی ہیں، غصہ کے بھی ہیں، نفرت کے بھی ہیں، محبت کے بھی ہیں، انسان ایسی مخلوق ہے کہ اس کے اندر احساسات کا ایک خزانہ ہے، جس میں تاثیر کے مختلف انواع و اقسام ہیں، اور انسان انہیں اپنے عکاس صفت اسلوب بیان کے ذریعہ جو اس کی زبان کے اثر سے بنتا ہے، اپنے دل کی بات کو ظاہر کرتا اور واضح کرتا ہے۔

ماں جس وقت اپنی اولاد سے بات کرتی ہے تو اس کے الفاظ کے اندر اس کی محبت جھلکتی ہے، اور اس محبت کی عکاسی ہوتی ہے، اور بیٹا جب اپنی ماں سے کوئی بات کہتا ہے، اپنی کسی تکلیف کا یا ضرورت کا اظہار کرتا ہے تو اس کے الفاظ میں اس کی طلب اور اس کے اندر کی خواہش جھلکتی ہے۔ اسی طرح دوست جب دوست سے بات کرتا ہے، یا استاد شاگرد سے بات کرتا ہے یا شاگرد استاد سے بات کرتا ہے، تو ان تمام موقعوں پر، اسی طرح دوسرے مواقع پر بھی آپ دیکھیں گے کہ آدمی صرف اپنی بات ہی نہیں کہتا بلکہ بات کے ساتھ ساتھ اپنے اندر کے احساس اور کیفیت کی بھی ترجمانی کرلیتا ہے۔

ادب کو اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب طاقت کا ذریعہ بنایا ہے، اور یہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر عطا کیا ہے، جو دوسری مخلوقات میں ہم کو نہیں معلوم ہوتی، اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اس طاقت سے صحیح کام لیں، اور اس طاقت کو مقصد کے مطابق استعمال کریں، اس کو محض بے نتیجہ لطف ومزہ کے لئے محدود نہ کردیں، اور یہ بھی خیال رکھیں کہ ہمارا یہ عمل انسانی برادری کے لئے تخریبی نہ ہو، اور نہ سفلی جذبات کی عکاسی کے لئے ہو، جو کہ انسان کی انسانی عزت وشرافت سے جوڑ نہیں رکھتے، بلکہ اعلیٰ انسانی مقصد کے لئے ہو، اور صرف محدود ذاتی لطف کے لئے استعمال کرنا اگرچہ ممنوع نہیں ہے، لیکن یہ بڑی چیز کو چھوٹے مقصد کے لئے استعمال کرنا ہے، اس میں ادب جیسے مفید اور اہم ذریعہ کی ناقدری ہے۔

ادب کی قدردانی یہ ہے کہ ہم اس کو مفید اور بلند سطح کا ذریعہ سمجھیں، اس کے ذریعہ مظلوم کی فریاد کو سن سکیں، اور مظلوم کی دادرسی اگر عملی نہ کرسکتے ہوں تو کم سے کم اپنے الفاظ سے کرسکیں۔ حدیث شریف میں اس کی تلقین آئی ہے کہ اگر کوئی تکلیف میں ہو اور ہم اس کی تکلیف دور نہیں کرسکتے تو کم سے کم الفاظ کے ذریعہ سے اس کو تسکین دیں۔ مریض کو دیکھئے کہ اگر مریض سے ڈاکٹر ہمدردی کی زبان میں بات کرتا ہے تو مریض کا آدھا مرض ختم ہوجاتا ہے، تو یہ کیسے ختم ہوتا ہے؟ وہ طرز کلام کے اثر سے ختم ہوتا ہے، جو اس کی زبان و بیان کے طرز ادا سے

حاصل ہوتا ہے۔

اور یہ بات تو چند جملوں کی ہوئی، لیکن مفصل بات کے لئے ادب میں مخاطب کی نفسیات اور صلاحیت فہم کی رعایت کرنا ہوتی ہے، اور موقع ومحل کا خیال کرنا ہوتا ہے کہ پہلے ہم یہ سمجھیں کہ جس سے ہم بات کررہے ہیں اس کی نفسیاتی کیفیت کیا ہے، اور اس کیفیت میں اس کے دل کو کیا طرز کلام متوجہ کرسکتا ہے، اور اس کے ذہن کو آسودگی عطا کرسکتا ہے، مثلاً ایک شخص رنج اور افسردگی کی حالت میں ہے، اس سے ہم مسرت اور خوشی کے اظہار کے ساتھ بات کریں تو اس کو وہ بات کڑوی اور ناپسندیدہ معلوم ہوگی، اس کو تو ہمدردی اور تسکین چاہئے، وہ اس وقت تفریح پسندی کے حال میں نہیں ہے۔

انسانی کلام الفاظ کا صرف مجموعہ ہی نہیں ہوتا، وہ اپنے دامن میں خصوصیات بھی رکھتا ہے، ان ہی خصوصیات سے ادب میں کام لیا جاتا ہے، یہ خصوصیات الفاظ کی ترتیب، محاوروں کے استعمال اور موقع کے لحاظ سے مرادفات کے مناسب اور صحیح انتخاب کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں، یہ مرادف الفاظ حقیقت میں مرادفات نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے ہر لفظ اپنی جگہ پر اپنی مخصوص خصوصیت رکھتا ہے، ان میں کیفیت کے ذریعہ سے فرق ہوتا ہے۔ مرادفات کے علاوہ کلام میں تفصیل واختصار کے لحاظ سے فرق اور تکرار کے فن سے بھی فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ ہم جب مہمان کی خاطر کرتے ہیں کہ آیئے تشریف لایئے، اس میں ہم بعض وقت مکرر لفظ استعمال کرتے ہیں کہ آیئے آیئے تشریف لایئے، آیئے تشریف لایئے، یہ جو تکرار ہے، اس تکرار سے کیفیت کا اظہار ہوتا ہے، اگر ہم یہ تکرار نہ کریں، صرف یہ کہیں کہ آیئے تو ظاہر ہے کہ اس کا وہ اثر نہیں ہوگا جو تکرار سے کہنے کا ہوگا، مخاطب کو خیال ہوگا کہ اس کا آنا زیادہ پسند نہیں کیا گیا۔ اسی طرح کے مواقع پر مرادفات کا استعمال ہوتا ہے، ان میں سے وہ مرادف اختیار کرنا ہوتا ہے جو موقع ومحل کے لحاظ سے زیادہ معنی خیز یا پُراثر ہے، یہ سب ادب میں طاقت پیدا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو زبان عطا کی ہے اور کلام کی جو صلاحیت دی ہے، اس میں اپنی بات کو سیدھے سیدھے کہنے کی بھی خصوصیت رکھی ہے اور کیفیات اور احساسات کو ادا کرنے کی بھی خصوصیت رکھی ہے، تو اس صورت میں ہمارے بزرگ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ادب کی خداداد صلاحیت کو صحیح نہیں استعمال کیا جارہا ہے، مسلمانوں کو اور خاص طور پر عربوں کو متوجہ کیا کہ اسلام نے ادب کو جو اہمیت دی ہے، اور زندگی کے تمام پہلوؤں کے لئے خیر پسندی کی جس صفت کو اختیار کرنے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے، اس کو اختیار کرنے کی بڑی ضرورت ہے، چنانچہ ندوہ میں اس پر ۱۹۸۱ء میں عالمی سطح پر ایک سیمینار منعقد کیا، اس کے بعد اس کے لئے عالمی انجمن رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔

اس ادارہ کا نام انہوں نے اسلامی اس لئے رکھا کہ اسلام کے متعلق لوگوں کو پوری بات معلوم نہیں ہے کہ اسلام زندگی کے سارے شعبوں پر محیط ہے، وہ انسان کی کیفیات اور احساسات وجذبات کی قدر کرتا ہے، اور اس کا حق ادا کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ اس کا حق ادا ہو، اگر کوئی مظلوم ہے تو اس کے ساتھ ہمدردی ہو، اگر کوئی محتاج ہے تو اس کی مدد کی جائے، تو اس میں ہمیں زبان اختیار کرنی پڑتی ہے، کم سے کم ہم زبان کے ذریعہ اس کے احساسات وجذبات کو محسوس کرسکتے ہیں، اور محسوس کراسکتے ہیں، تو انہوں نے ادب کو اسلامی اس لئے کہا، کیونکہ اسلام میں زندگی کے سارے شعبے داخل ہیں، اور انسان کے جذبات واحساسات کا بھی اس میں پورا لحاظ ہے، اس لئے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ادب کو اسلامی ادب یعنی انسانی ادب،

تعمیری ادب ہونا چاہئے، یعنی وہ ادب جس سے ہم انسان کی خدمت انجام دے سکیں، انسان کے دکھ درد کو دور کرسکیں، انسان کے اندر ہم جذبہ پیدا کرسکیں، انسان کو ہم جانوروں کی زندگی سے اٹھا کر سچی بات تو یہ ہے کہ اعلیٰ مخلوق کی سطح پر لے جاسکیں۔

جہاں تک ہم جانتے ہیں، اسلام کا ہم نے مطالعہ کیا ہے، قرآن وحدیث کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث کے اندر اس کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، اسی لئے حضور (ﷺ) کو سارے انسانوں میں سب سے زیادہ فصیح شمار کیا گیا ہے، اس لئے کہ آپ (ﷺ) نے جو زبان استعمال کی ہے، جو الفاظ استعمال کئے ہیں، ان میں ان سب چیزوں کا لحاظ ہے، اور قرآن مجید میں تو اس کا بہت زیادہ لحاظ کیا گیا ہے، اور انسان کا اور مخاطب کی نفسیات کا لحاظ کیا گیا ہے، اور عربوں کی جو نفسیات تھی، اس کا لحاظ کیا گیا ہے، اسی لئے قرآن مجید کو سنکر لوگ ایک دم فریفتہ ہوجاتے تھے، جو قرآن مجید کو سنتا تھا وہ فریفتہ ہوجاتا تھا، وہ بالکل بدل جاتا تھا، ٹھیک اس کے دل پر جا کر وہ چیز لگتی تھی، اور اس کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اتنی اچھی بات اتنے اچھے انداز میں انسان نہیں کہہ سکتا، انسان سے بڑی طاقت ہی کہہ سکتی ہے، تو قرآن مجید نے بھی ہماری رہنمائی کی ہے، حدیث شریف نے بھی رہنمائی کی ہے، اسی لئے ہم ادب کو انسان کی ضرورت سمجھتے ہیں، اور انسان کی ضرورت کو اسلام صحیح تسلیم کرتا ہے۔

ادب کو ہم نے اسلامی اس لئے کہا تا کہ ہم ادب کو اس چکر سے نکالیں جس چکر میں ادب پڑ گیا ہے، وہ چکر کیا ہے؟ وہ یہ کہ یا تو اسے تفریح کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، یا حقیر اغراض و مقاصد تک اس کو محدود کردیا گیا ہے، حالانکہ ادب کو انسان کا خادم ہونا چاہئے، انسان کا معاون ہونا چاہئے، انسان کا ہمدرد اور اس کا دوست ہونا چاہئے، ادب کو ہم جب اس طریقہ سے استعمال کریں گے تو ادب بہت بڑا عمل انجام دے سکتا ہے، اور زندگی کو بہت راحت پہونچا سکتا ہے، اور انسان کی مدد کرسکتا ہے، اور اسی ادب کی تقویت کے لئے رابطہ ادب اسلامی کی تشکیل ہوئی، اور ہم الحمدللہ اس قافلہ کو چلا رہے ہیں، اور ہر سال ایک بڑا سیمینار رکھتے ہیں، اور اس میں کسی ایسے موضوع کو اختیار کرتے ہیں جس پر عام طور پر سیمینار نہیں ہوتے ہیں، اس طریقہ سے ہم یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ادب اتنا بڑا کام انجام دے سکتا ہے، ادب انسان کی اتنی بڑی خدمت انجام دے سکتا ہے، اور وہ اسلام کی رہنمائی میں یہ سارا کام کرسکتا ہے، اس لئے ہم سیمینار کرکے اس کا تعارف کراتے ہیں، اور یہ جو آپ کا سیمینار ہورہا ہے اس میں میں شریک ہوتا اور حاضر ہوتا، مگر میں بیمار ہوں، اس لئے یہاں سے بیٹھ کر اس ذریعہ کو استعمال کررہا ہوں، اور اپنی بات آپ تک پہونچا رہا ہوں، اور مجھے بہت خوشی ہے کہ پروفیسر انیس چشتی صاحب نے بڑا اہتمام کیا، آپ حضرات کو اس کے لئے جمع کیا، ہم آپ سب حضرات کو اس کے لئے مبارکباد دیتے ہیں اور شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ تشریف لائے، اور انشاء اللہ اس سیمینار میں جو تقریریں ہوں گی، جو مقالات پڑھے جائیں گے، ان سے آپ میری اس بات کو محسوس کرسکیں گے کہ ادب بڑی خدمت انجام دے سکتا ہے۔

اور اسلامی ادب تو اس کام کو بہت اچھے طریقہ سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور اگر ہم اس کو اس زاویہ سے دیکھیں گے تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اسلام نے ادب کے ذریعہ سے بھی کتنا بڑا کام انجام دیا ہے، اسی سلسلہ میں ہمارا یہ سیمینار ہے، جسے پونہ کی شاخ اس وقت منعقد کررہی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

☆☆☆

☆افسانہ

دنیا بڑی اچھی بھی ہے

.....اقبال انصاری

میں تو آگے پڑھنا چاہتی تھی مگر میرے والد نہیں مانے۔'' اپنے گھر جا کر جتنا جی چاہے پڑھ لینا۔۔۔ اتنا اچھا رشتہ روز روز نہیں ملتا۔ عثمان صاحب اچھے آدمی ہیں، ان کی اہلیہ بھی بہت نیک خاتون ہیں، اور فوزان تو ہیرا ہے۔ احمد آباد سے ایم بی اے کر کے آیا، اور آتے ہی ملازمت مل گئی۔ مسز عثمان بہت بیمار رہتی ہیں، اس لئے عثمان صاحب فوزان کی شادی فوراً کسی گھریلو لیکن تعلیم یافتہ، خوبصورت، اور مہذب گھرانے کی لڑکی سے کر دینا چاہتے ہیں۔ تم میں یہ ساری خوبیاں ہیں۔''

وہ میرا بی کام کا فائنل ایئر تھا۔ امتحان شروع ہونے ہی والے تھے۔ میں سر جھٹک کر امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔ امتحان شروع ہوئے، امتحان ختم ہوئے۔ مجھے کالج سے اٹھالیا گیا اور گھر میں بٹھا دیا گیا۔ کچھ خاص کرنے کو تھا نہیں اس لئے خود کو ذہنی طور پر آنے والے وقت کے لئے تیار کرنے لگی۔ وہ دن بڑے سخت تھے۔ ایک عرصے سے ایم کام اور پھر ایم فل اور پی ایچ ڈی کر کے کسی کالج میں لکچرر کی حیثیت سے ملازمت کرنے کے خواب دیکھے تھے۔ سب دھرے رہ گئے۔ دو ماہ بعد شادی ہو گئی۔ دل میں ایک تیکھا سا دکھ اور ایک میٹھی سی اداسی لے کر میں عثمان صاحب کے گھر چلی آئی۔

فوزان نے فوراً ہی خود کو میرے سپرد کر دیا۔ ان کی امی کی حالت دیکھ کر انہیں میں نے اپنے سپرد کر لیا۔ ان کی دوائیں، گرم پانی کی بوتل چائے، ناشتہ، کھانا اور ضرورت کی دوسری تمام چیزیں، پابندی کے ساتھ اور وقت پر انہیں بستر پر پہنچانے لگی۔ کسی کی تیمارداری بڑا خوبصورت کام ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں کسی کی تیمارداری کا موقع ملتا ہے۔ امی اکثر سانس لینے میں تو تھک جاتی تھیں، مجھے دعائیں دینے میں کبھی نہیں تھکتی تھیں۔

سب سے زیادہ خوش تھے پاپا، یعنی عثمان صاحب۔'' تمہیں نہیں معلوم..... میں بڑا خوش قسمت ہوں..... حالانکہ ابھی کچھ دن قبل تک میں اپنے کو بہت زیادہ تو نہیں تھوڑا بہت بدقسمت تو مانتا ہی تھا۔ ہمیشہ سے ایک بیٹی کی آرزو تھی۔ ایک بیٹا تو پروردگار نے شادی کے دوسرے ہی سال عطا کر دیا تھا، مگر بیٹی..... وہ اب جا کر دی ہے۔ کچھ بھی کہو، اللہ ہے بڑا مہربان۔

دیر سے ہی سہی، لیکن بندے کی دعا قبول ضرور کرتا ہے۔ ایک بات بتاؤں، تم بہت پیاری لڑکی ہو، شکلاً بھی، عقلاً بھی، عملاً بھی۔ بیٹی کو تمہارے جیسا ہی ہونا چاہیئے۔ پروردگار جب تمہیں بیٹی دے تو اسے بالکل اپنی طرح بنانا۔ میں دعا کروں گا کہ وہ تمہیں بیٹی ضرور دے تا کہ کسی دن کسی کا گھر خوبصورتیوں سے یوں بھر جائے جیسے میرا گھر بھر گیا ہے۔''

اس طرح اس دکھ اور اس اداسی کو میں ایک ہفتے میں ہی بھول گئی جسے لے کر سسرال آئی تھی...... نہیں آگے پڑھ سکی تو نہ سہی، ایم کام، ایم فل، پی ایچ ڈی، ملازمت...... کوئی خواب پورا نہیں ہوا۔ نہ سہی...... زندگی میں اتنی ڈھیر سی مسرتیں تو مل گئی تھیں۔ ان تینوں کو محبت کرنے کے سوا نہ کچھ آتا تھا، نہ سوجھتا تھا۔ زندگی عید کا دن ہوگئی تھی۔ تین مہینے گزر گئے۔

لیکن پھر اچانک ہی رت بدل گئی۔ جیسے موت کا موسم آگیا۔ میرے والد کا انتقال ہوا۔ پندرہ دن بعد والدہ بھی چل بسیں۔ میں ان کی تنہا اولاد تھی، اس لئے میکا ختم ہوگیا۔ یہ دکھ ابھی چبھ ہی رہے تھے کہ پھر ایک جھٹکا لگا۔ امی یعنی فوزان کی والدہ ایک صبح جب خود سے نہیں اٹھیں تو میں نے انھیں ہلایا ڈولایا، اور پھر فوراً ہی معلوم ہوگیا کہ میں انہیں نہیں، ان کے مردہ جسم کو ہلا ڈولا رہی تھی۔ آٹھ دن بھی نہ بیتے تھے کہ فوزان ایک سڑک حادثے کا شکار ہو گئے۔ میرا غم جو تھا وہ تو تھا ہی، پاپا کا غم نہیں دیکھا جاتا تھا۔ لگتا تھا کہ ان کے جسم میں سب کچھ بننا ختم ہو گیا تھا...... ہر چیز کی جگہ صرف آنسو بننے لگے تھے۔ میں ان کے سامنے آئی نہیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔

اپنا دکھ ایک طرف کر کے میں ان کی اشک شوئی میں لگ گئی......اور پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں ان کی زندگی کی بنیاد بن گئی ہوں۔ صرف بچوں کو ان کی ماں پر اس طرح منحصر دیکھا تھا جس طرح پاپا مجھ پر منحصر ہو گئے تھے۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے تعلیمی سلسلہ پھر سے شروع کرنے کی بات کی۔ کچھ دیر بحث مباحثہ رہا، اور اگلے ہفتے میں نے ایم کام میں ایڈمیشن لے لیا۔ جھاڑو برتن کپڑے دھونے کے لئے گھر میں ایک جز وقتی ملازمہ پہلے سے لگی ہوئی تھی۔ ناشتہ کھانا میں تیار کرتی تھی۔ دو افراد کا ناشتہ کھانا تیار کرنا ایم کام کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ بھی کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس طرح ہم دونوں نے، پاپا نے اور میں نے زندگی کو ایک نیا طور اور ایک نیا دور عطا کیا۔ یہ نیا طور اور نیا دور دلچسپ بھی تھا، مفید بھی، اور ضروری بھی۔ پاپا پھر کتابوں اور رسالوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

پتہ ہی نہ چلا کہ دو سال کب اور کیسے گزر گئے۔ میں نے بانوے فی صد مارکس کے ساتھ ایم کام کرلیا۔ پاپا نے کہا نیٹ کوالی فائی کرو، میں نے کرلیا۔ ایک کالج میں لکچرر کی پوسٹ خالی ہوئی۔ میں نے بھی اپلائی کیا۔ انٹرویو کال آئی۔ انٹرویو دیا۔ لوگوں نے کہا تعصب کے اس دور میں انتخاب کی امید نہ رکھو۔ میں نے کہا اللہ مالک ہے۔ انٹرویو کا نتیجہ آیا۔ میں منتخب کرلی گئی تھی۔ پاپا نے کہا ''تعصب، فرقہ پرستی، امتیاز...... یہ سب آج کی بڑی حقیقتیں ہیں لیکن اللہ کا کرم سب سے بڑی حقیقت ہے......وہ کرم ضرور کرتا ہے۔''

اس طرح سب اچھا اچھا ہوتا چلا گیا۔ بس ایک ہی بات میرے لئے باعث تشویش تھی...... پاپا کے بال ان تین برسوں میں بہت تیزی سے سفید ہوتے چلے گئے تھے۔ ایک دن جب میں کالج سے واپس آئی تو پاپا کے تمام سفید بالوں کے لئے تو میں کچھ نہیں کرسکتی تھی، لیکن ان کی فکرمندی تو میرا مسئلہ تھی، جس کا حل مجھے ہی تلاش کرنا تھا، لیکن سب سے پہلے تو اس فکرمندی کا سبب معلوم کرنا تھا، چنانچہ پاپا سے دریافت کیا۔

''ہاں بیٹا، فکرمند تو ہوں'' انہوں نے کہا'' ہر وہ باپ جس

کے گھر میں ایک جوان بیٹی بیٹھی ہو وہ فکر مند تو ہوگا ہی، اور اسے فکر مند ہونا بھی چاہئے۔''

مجھے لگا جیسے اچانک میری سوچ منجمد ہوگئی ہو، اور الفاظ کا ذخیرہ ختم ہوگیا ہو۔ جو بات خود میں نے اپنے لئے نہیں سوچی تھی وہ پاپا سوچ رہے تھے اور اس سلسلے میں فکر مند تھے! ''یہ آدمی اتنا انسان کیوں ہے؟'' میرے دل میں سوال اٹھا۔

رفتہ رفتہ میں نے اپنے کو اپنے خیالات، سوچ، منطق، الفاظ اور آواز کے ساتھ یکجا کیا۔۔۔ دیر تک ہم دونوں میں بحث ہوتی رہی۔ پاپا بضد تھے کہ مجھے شادی کر لینی چاہئے اور میں بضد تھی کہ میں انہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔

پاپا اپنی منطق اور دلائل کے ساتھ اتنے مضبوط اور طاقتور تھے کہ میں نے سپر ڈال دی ''ٹھیک ہے..... دے دیجئے اخبار میں اشتہار، میں شادی کر لوں گی۔''

دل ہی دل میں جانتی تھی کہ یہ ہو ہی نہیں سکے گا، کنواری لڑکیوں کی شادی تو آج کل ہو نہیں پا رہی ہے، بیوہ کی کہاں سے ہو جائے گی!

پاپا نے ٹائمز آف انڈیا میں اشتہار دیا۔ تین ہفتے تک لگا تار ہر اتوار کو اخبار میں اشتہار آیا۔ تین ماہ تک انتظار کیا۔ پھر اشتہار دیا، پھر تین ہفتے اشتہار اخبار میں آیا، پھر تین ماہ انتظار کیا۔ کہیں سے کوئی ایک خط بھی نہیں آیا۔ مجھے اس کا کوئی دکھ نہیں تھا کہ ایک بھی خط نہیں آیا، دکھ اس بات کا تھا کہ پاپا کے چہرے پر دو جھریاں نظر آنے لگی تھیں، اور لگ رہا تھا کہ جلد ہی تیسری جھری بھی نظر آجائے گی۔

میں انہیں فکر مند دیکھتی اور ان کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ باتیں کرتے، میرے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے، اخبار کی خبریں پڑھتے، مجھے سناتے..... خبریں ہی خبریں تھیں جہیزی اموات، طلاق، قتل، غارت گری، تشدد، انتہا پسندی، دہشت گردی، بموں کے دھماکے، اغوا، ریپ، بدعنوانی، بے ایمانی، رشوت خوری، زیادتی، مذہبی جنون، عصبیت، فرقہ پرستی، کشیدگی، فرقہ وارانہ فسادات، کرفیو، پولیس کی زیادتی، سیاستدانوں کے کارنامے..... ہمارے معاشرے میں برائیوں کا جیسے سیلاب آیا ہوا تھا..... ایسا سیلاب جو صرف چڑھنا جانتا تھا، برشگال کے سیلاب کی طرح اترنا نہیں۔ جہاں رہنما رہزنی کو وہ تریرہ بنالیں اور محافظ تاراجگر ہو جائیں وہاں سیلاب صرف چڑھتے ہیں۔

ہم لوگ، پاپا اور میں، اخبار میں شائع ہونے والی سیاست، سنیما اور سکس کی خبروں کے علاوہ ہر خبر پر بات چیت کرتے، تبصرے کرتے، پاپا کو پروردگار نے بڑا جاگتا ہوا ذہن دیا تھا۔ حالات کا مشاہدہ کر کے وہ کسی نتیجے پر تقریباً فوراً ہی پہنچ جاتے تھے۔ ان کے تجزیے منطقی، تبصرے پر مغز اور اخذ کئے ہوئے نتائج متوازن ہوتے تھے۔ ان کی گفتگو حالانکہ عالمانہ ہوتی تھی مگر ہمیشہ ہی ابہام سے کوسوں دور، معنی خیز لیکن واضح۔ اس لئے ان سے گھنٹوں گفتگو کر کے اور گھنٹوں ان کی باتیں سن کے بھی کبھی تھکن کا احساس نہیں ہوتا تھا، الٹے ہر بار یہ محسوس ہوتا تھا کہ ذہن کو کچھ اور روشنی، اور موجودہ روشنی کو کچھ اور طاقت حاصل ہوگئی ہے۔ انہیں پڑھنے کا بہت شوق تھا، بہت پڑھتے تھے اور جو کچھ پڑھتے تھے، ذہن میں جمع ہوتا رہتا تھا۔ اس لئے ان سے کسی بھی موضوع پر باتیں کرنا میرے لئے بہت مفید تھا۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ نیا معلوم ہوتا رہتا تھا۔ میرے طلبا ہی نہیں، کالج کے ساتھی لکچرر تک ہمیشہ متعجب رہتے تھے کہ اتنی کم عمر میں ہی معلومات کے کیسے نادر ذخیرے کی مالک بن گئی تھی! سب پاپا کا کمال تھا۔

اگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک بیٹی کے لئے اس کے باپ کے دل میں کیسی چاہت ہوتی ہے تو میں یہ بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ میرے دل میں پاپا کے لئے یہ کیسی چاہت تھی جس

نے صرف دل اور ذہن پر ہی نہیں بلکہ میری پوری شخصیت، میرے کل وجود پر قبضہ کر رکھا تھا۔ شاید یہ اس چاہت کا ہی کرشمہ تھا کہ پاپا کی تمام مصروفیات کے باجود مجھے ان کی وہ فکرمندی بڑی وضاحت سے نظر آتی رہتی تھی جس میں وہ صرف مبتلا ہی نہیں، بلکہ جو انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ دن رات سوچتی رہتی کہ کیسے انہیں اس فکرمندی سے نجات دلاؤں۔

تبھی ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میرے کالج کے ایک ساتھی کے ایک دوست کے دوست تھے۔ مجھے دیکھا، سرسری سی ملاقات رہی۔ جلد ہی دوبارہ ملے۔ اور مجھے ان کی آنکھوں میں اپنے لئے چاہت اور باتوں میں لگاوٹ محسوس ہوئی۔ چائے ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ میرے چہرے کی ''خوبصورتی'' آنکھوں کی ''چمک'' اور شخصیت کی ''کشش'' شروع ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ کچھ اور شروع ہو، یا جو شروع ہو چکا ہے وہ آگے بڑھے، مجھے کچھ کرنا چاہئے۔ چنانچہ چائے ختم ہوتے ہی میں کھینچ کھانچ کر اپنی بیوگی، اپنے ''مرحوم ہسبینڈ'' اور اپنے ''موجود فادران لا'' کا ذکر نکال بیٹھی۔ میرے چہرے کی ''خوبصورتی'' آنکھوں کی ''چمک'' اور شخصیت کی ''کشش'' سب ٹھہر گئی، وہ صاحب چلے گئے..... اور بالکل چلے گئے۔ میں نے چین کی سانس لی۔

مگر کیسا چین اور کہاں سانس! پاپا نے پھر اخبار میں میری شادی کے لئے اشتہار دے دیا۔ میں جھنجلا گئی۔ ''کیا پاپا! کیوں مجھے نکال پھینکنا چاہتے ہیں؟ میں ہرگز ہرگز نہیں جاؤں گی آپ کو چھوڑ کر۔''

''جوان بیٹیاں اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہیں'' پاپا بڑی متانت سے بولے ''باپ کے گھر میں تب اچھی لگتی ہیں جب دو چار دن کے لئے مہمان بن کر آئیں۔''

''پاپا.....'' میں نے کچھ کہنا چاہا مگر پاپا میری بات کاٹ کر بولے ''تیری شادی میری زندگی کا واحد مشن ہے زرینہ..... تو جس دن اپنے گھر جائے گی وہ میری زندگی کا ایک اداس دن تو ہوگا لیکن وہی میری زندگی کا سب سے شاداب دن بھی ہوگا..... وہ ایک دن دیکھنے کے لئے ہی تو میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔''

''میں نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی..... کہیں نہیں جاؤں گی آپ کو چھوڑ کر'' اس کے آگے میں کچھ بھی نہ کہہ سکی، اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

خوب روئی۔ پاپا بھی خوب روئے، لیکن بس خاموشی سے۔ میرے سر میں درد ہونے لگا۔ میں جا کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔

بہت دیر تک خوب گہری نیند سوتی رہی۔ آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ پلنگ سے اتری تو پاپا پر نظر پڑی۔

ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ دو پلیٹیں میز پر لگی ہوئی تھیں۔ ایک پلیٹ میں تازی سلاد تھی۔ پریشر کوکر اسٹینڈ پر رکھا سنسنا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے ''بہت دیر سوئی..... جا..... باتھ روم میں جا کر پانی کے دو چار چھینٹے منہ پر مار کے جلدی سے آجا— دیکھ تیرے لئے میں نے مونگ کی دال کی کھچڑی پکائی ہے۔''

''او..... پاپا'' میں نے جھپٹ کر پاپا کا سر اپنے سینے سے بھینچ لیا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کا سر اپنے سینے سے بھینچ لیتی ہے— کاش پاپا میرے بچے ہوتے!

اشتہار کے جواب میں تو کوئی خط نہیں آیا، لیکن جمشید سے ضرور ملاقات ہوگئی۔

ستائیس سال ان کی عمر تھی مگر چہرے سے تیئس چوبیس کے لگتے تھے۔ ویسے چہرے پر خوبصورتی، وجاہت اور بھولے پن کا بڑا صحیح امتزاج، شخصیت بڑی جاذب نظر، بار بار دیکھنے کو جی چاہتا تھا، اور بات کرنے کو بھی۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے، وہیں ایک ایڈڈ اسکول میں کامرس پڑھاتے تھے۔ پہلی ملاقات

میں ہی فریفتہ ہو گئے۔ دوسری ملاقات میں کافی سنجیدہ سنجیدہ رہے، لگا جیسے میرا مشاہدہ کر رہے ہوں، تیسری ملاقات میں شادی کی خواہش کا بڑی شائستگی سے اظہار کیا۔

میں نے بڑی سادگی سے کہا ''اگر آپ میرے بارے میں سب کچھ جان لینے کے بعد شادی کی بات کرتے تو بہتر تھا۔''

بڑی لاپروائی سے بولے ''چلئے بتا ڈالئے اپنے بارے میں سب کچھ۔''

میں نے کہا ''شادی کے تین ماہ بعد بیوہ ہوگئی تھی۔''

''ریئلی!'' ڈھیری مسرت جیسے ان کے چہرے سے چھلکنے لگی۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کسی کی بیوگی کی اطلاع پا کر کسی کو خوش ہوتے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

''یار بیوہ سے شادی کرنا تو بڑی فضیلت ہے..... نہیں وہ ایک مولانا ایک بار لکھنؤ میں کہہ رہے تھے، تبھی سنا تھا میں نے..... ویسے آپ تو بیوہ دکھتی ہی نہیں، مگر اچھا کیا جو بتا دیا، سچائی مجھے پسند ہے'' ان کی آنکھوں میں جو بھی جذبے دکھے، بڑے اچھے لگے۔

میں نے کہا ''اگر سچائی آپ کو پسند ہے تو ایک سچائی اور سن لیجئے۔''

کچھ بجھ سے گئے اور بولے ''کوئی بچہ وچہ بھی ہے؟''

میں نے کہا ''نہیں، بچہ تو نہیں، ایک بوڑھا ضرور ہے جسے چھوڑ کر کہیں جانے کی بات میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

جمشید نے کہا ''آپ کے فادر؟''

میں نے کہا ''نہیں..... فادر ان لا۔ فادر کو تو چھوڑ کر جا بھی سکتی تھی، لیکن ''پاپا'' کو چھوڑ کر کہیں جانے کا تصور بھی میرے لئے ممکن نہیں۔''

جمشید بولے ''پھر..... نہیں پہلے یہ بتائے گھر میں اور کون کون ہے؟''

میں نے بتایا ''بس ہم دونوں..... پاپا اور میں۔ ان کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ اور میرے سوا ان کا اس دنیا میں کوئی نہیں..... وہ تو میری ضرورت ہیں ہی، مگر میں ان کے لئے ضرورت سے بھی کچھ زیادہ ہوں..... کیسے بتاؤں..... بس یہ سمجھ لیجئے کہ وہ میرے لیے ضروری ہیں، میں ان کے لازمی ہوں۔''

جمشید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

''تو ایسا کرتے ہیں کہ میں یہاں دہلی میں ملازمت تلاش کرتا ہوں..... کسی نہ کسی پبلک اسکول میں مل جائے گی..... لکھنؤ چھوڑ دوں گا، وہاں میرا ہے ہی کون، بالکل تنہا رہتا ہوں۔ والدین کئی سال ہوئے گزر گئے۔ دو بھائی ہیں، ایک اپنی فیملی کے ساتھ نیوجرسی میں، دوسرے ملبورن میں۔ انہوں نے ایک عرب عورت سے شادی کی ہے.....۔

اگر آپ چاہیں گی تو ہم لوگ الگ مکان لے کر رہیں گے اور اگر چاہیں گی کہ ہم دونوں پاپا کے ساتھ رہیں تو بھی مجھے کوئی دقت نہیں..... کوئی پرابلم نہیں.....''

سب کچھ مجھ کو خواب خواب سا لگا۔

اسی دن جمشید پاپا سے ملے۔

ان کے جانے کے بعد پاپا سجدے میں گر گئے۔ جب انہوں نے سر اٹھایا تو ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا، اور آنسوؤں کی نمی کے نیچے سے بڑی طاقتور مسرت بڑی وضاحت سے خود کو عیاں کر رہی تھی۔

اس سے زیادہ آنسو اور اس سے زیادہ مسرت مجھے پاپا کے چہرے پر اس دن نظر آئی جس دن جمشید کے ساتھ میرا نکاح ہوا تھا۔

☆☆☆